مقالات سید العلماء

علامہ سید علی نقی النقوی

حصہ دوم

حضرت امام زین العابدین علیہ السلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیغام بنام محمد وصی خاں

منجانب مرکزی تنظیم عزاداری حسینیہ کراچی

بفحوائی خدمت، والا مرتبت، گیوال منزلت، بر جبین حشمت، کوکب تابندہ برج فصاحت۔ ماہ درخشندہ جبین بلاغت، نیر اعظم سپہر خطابت تاجدار ذی وقار، اقلیم طلاقت، سلطان المتکلمین، صدر المجتہدین العمادی وہ العمادی سرکار سید العلماء سید علی نقی صانہ اللہ الباری الہادی نے مقالات سید العلماء کی اشاعت کے سلسلے میں مرتب مقالات جناب محمد وصی خاں کو بذریعہ خط علیگڑھ سے ایک پیغام ارسال فرمایا ہے۔

مجتہد العصر سرکار علامہ نقن صاحب قبلہ مدظلہ العالی نے لکھا ہے کہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۷ر شعبان سنہ ۱۴۰۰ھ

سلام مسنون!

آپ نے مضامین کا جو انتخاب فرمایا ہے وہ موزوں و مناسب ہی ہوگا اور اس سلسلے میں آپ نے خدمت دین و ملت کی نیت سے جو کوشش فرمائی ہے وہ قابل قدر ہے۔ خداوند عالم جزائے خیر عطا فرمائے۔

میرے لئے اصل چیز عادل حکیم کا انتخاب ہے اگر کوئی ایک جملہ کسی ایک مضمون کا بھی اس کے معیار رضا پر پورا اترے تو وہ میرے لئے ذخیرۂ آخرت بن سکتا ہے۔

واللہ ولی التوفیق

علی نقی النقوی

اصل تحریر مذکورہ بالا کا عکس صفحہ ۳ پر ملاحظہ فرمائیے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۰ ربیع الثانی ۱۴۰۱ھ

محترمی جناب ۔۔۔۔۔ محمد حسن خاں صاحب ۔۔۔۔ صدر مرکزی تنظیم عزا

سلام مسنون ۔ آپ نے مضامین کا جو انتخاب فرمایا وہ موزوں و مناسب ہوگا اور اس سلسلہ میں آپ نے خدمت دین و ملت کا جذبہ ہے جو کوشش فرمائی ہے وہ قابل قدر ہے ۔

خداوند عالم جزائے خیر عطا فرمائے

میرے نزدیک اصل چیز عادل حکم کا انتخاب ہے اگر کوئی ایک جگہ کسی ایک مضمون کا بھی اس کے معیار رہا ہے ہوا اثر ہے تو وہ ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت ہو سکتا ہے

واللہ ولی التوفیق

علی نقی النقوی

مذکورہ بالا سطور کو آپ بجنسہ شائع کر سکتے ہیں ۔ مشہور شعر ہے ۔۔۔ جو آپ کو بھیجی گئی تھی وہ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے آپ جس طرح چاہیں ۔

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	انتساب عقیدت	۵
۲	کتاب کے بارے میں	۶
۳	حقیقت اسلام	۷
۴	خدا کا ثبوت	۲۹
۵	جبر و اختیار	۳۶
۶	تقیہ	۵۱
۷	تدوین حدیث	۷۷
۸	حدیث حوض	۱۱۱
۹	شیعیت کا تعارف	۱۳۶
۱۰	مذہب شیعہ ایک نظر میں	۱۶۳
۱۱	مذہب شیعہ اور تبلیغ	۱۹۱
۱۲	بنی امیہ کی عداوت اسلام کی ایک مختصر تاریخ	۲۱۳
۱۳	خلافت یزید سے متعلق آزاد رائیں اور ضمیر کی آوازیں	۲۲۵
۱۴	واقعہ کربلا کی اہمیت	۲۳۵
۱۵	اسیران اہل حرم	۲۳۹
۱۶	ہلاکت اور شہادت	۲۷۱
۱۷	واقعہ کربلا کی تبلیغی شان حسینؑ کے خون کا ہر قطرہ ایک مبلغ مذہب تھا	۲۸۹
۱۸	مقصود کعبہ حیرت انگیز ولادت اور عقول کی حیرت انگیز ٹھوکریں	۲۹۸
۱۹	معراج انسانیت سیرت مرتضویؑ کی روشنی میں	۳۱۱

انتسابِ عقیدت

میری شہرت کا سبب مدحتِ محمدؐ ہے وصیؔ
ورنہ اربابِ سخن میں میرا رتبہ کیا ہے

ساری حمد و مدحت سزاوار ہے اس خالقِ عالم واجب بے پایاں الاحد علیم و کلیم و قدیر پروردگار کے لیے جس کا کوئی شریک و نظیر نہیں۔ بے پایاں درود و سلام ہے اس ہادیٔ اعظم سرورِ عالم پیغمبرِ خاتم حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے جن کی عترتِ اطہار کے ائمہ ابرار عصمت و طہارت جو اس درود و سلام میں ان کے شریک و سہیم ہیں۔ اس لیے میں اپنے دل کی تمام گہرائیوں دماغ کی تمام وسعتوں روح کی تمام پاکیزگیوں اور عقیدت و محبت اور شوق کی تمام ایمانی کیفیتوں کے ساتھ اس ہدیہ ولا اور نذرانۂ عقیدت کو سید الشہداء لختِ جگرِ علیؑ و فاطمہؑ حضرت امام حسین علیہ السلام کے نامِ نامی و اسمِ گرامی سے معنون کرتا ہوں اور متمنی ہوں کہ اس ہدیہ حقیر فقیر مالی بے ساعی کو شرفِ قبولیت بخشا جائے تاکہ قبولِ عام ہو اور مجھ گنہگار کی آخرت کا توشہ ہو کر مغفرت کے کام آئے۔

مولا حسینؑ میرے والد محمد عسکری تاباں اور حاجی حسن علی ابن رحمت اللہ بانی رحمت اللہ ٹرک ایجنسی کی شفاعت فرمائیے اور جنت الفردوس میں قربِ ائمہ اہلبیت اطہار علیہم السلام جگہ عطا فرمائیے۔

میرے مولا و آقا آپ کے ماننے والوں میں آجکل جو اختلاف اور رنجشیں بڑھتی جا رہی ہیں اس کو دور فرما دیجئے ان کو تسبیح فاطمہؑ کے دانوں کی طرح ایک تسبیح میں پرو دیجئے اور دشمنوں کے شر سے اپنی امان میں رکھیے۔

(وصی خان)

کتاب کے بارے میں

یہ کتاب "مقالات سید العلماء جلد دوم" جس کی اشاعت رحمت اللہ بک ایجنسی کراچی نے کی ہے۔

اس جلد میں بھی جلد اوّل کی طرح آیت اللہ صدر المجتہدین سرکار سید العلماء سید علی نقی صاحب قبلہ کے نایاب معلوماتی مضامین کا ایک نایاب علمی خزانہ ہے جس کو مختلف اخبارات۔ رسائل اور کتابوں سے حاصل کر کے یکجا کیا ہے۔

اس کتاب میں بڑے قیمتی اور معلوماتی مضامین ایسے ہیں جن کو علامہ علی نقی صاحب قبلہ کی زندگی میں امامیہ مشن لکھنؤ (انڈیا) اور امامیہ مشن لاہور (پاکستان) نے شائع کیا تھا اس کے علاوہ انڈیا اور پاکستان سے شائع ہونے والے مذہبی رسالے اور اخبارات کی بھی زینت بنتے رہے ہیں

خادم نے اجرِ رسالت اور خدمتِ دین سمجھتے ہوئے ان جملہ مضامین کو یکجا کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے بسا تھ ہی ساتھ میرے عزیز دوست اکبر حسین ابن حاجی حسن علی رحمت اللہ مالک رحمت اللہ بک ایجنسی نے اس کی اشاعت اپنے ذمہ لی ہے۔

علامہ علی نقی صاحب قبلہ نے ان مضامین میں مذہب حقہ کی صداقت کو جس طرح اجاگر کیا ہے اس کی تعریف توصیف میرا جیسا کم علم شخص نہیں کرسکتا لیکن مومنین کرام سے گذارش ضرور کروں گا کہ اس کتاب کو ضرور خریدیں اور اپنے بچوں کو اس کے مضامین سے ضرور روشناس کروائیں۔

وصی خان

حقیقتِ اسلام

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الۡمُرۡسَلِیۡنَ وَاٰلِہٖ الطَّیِّبِیۡنَ الطَّاہِرِیۡنَ۔

"اسلام" گویا ایک "خواب" تھا جسے کثرتِ تعبیر نے پریشان بنا دیا۔ کوئی کہتا ہے کہ اسلام فقط کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا نام ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص شہادتین کا اقرار کرتا ہو اور ان عبادات کا پابند ہو تو وہ سچا مسلمان ہے، چاہے اپنے اخلاق میں وہ کتنا ہی پست اور دوسروں سے معاملات میں کتنا ہی کھوٹا کیوں نہ ہو۔ اسلام کی اسی تعبیر کی بنا پر آج مردم شماری کی بنیاد ہے اور ہیں بھی اسلام کے رسمی احکام کے لحاظ سے اسے مان لونگا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ قانونی طور پر مسلمانوں کے شمار میں نام درج ہو جانا اور چیز ہے اور حقیقی مسلمان ہونا دوسری چیز ہے۔ کیا ایسے ہی مسلمان وہ ہو سکتے ہیں کہ جنہیں خدا نے دنیا کی آبادی کا ذریعہ قرار دیا ہے اور ان ہی لوگوں سے وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ (تم سب سے بلند رہو گے) کا وعدہ پورا ہو سکتا ہے اور یہی وہ ہیں جو زمین کے حاکم اور مالک بنائے جا سکیں؟

اس خیال کا ردِ عمل یہ تھا کہ بعض لوگوں کو اس کا احساس شدید پیدا ہو گیا کہ یہ چیزیں اسلام کی بنیاد اساسی نہیں ہو سکتیں۔ انھوں نے اسلام کی تفسیر غلبہ اقتدار سے کر لی اور ذوق جہانبانی و شوقِ حکمرانی ہی کو سب کچھ سمجھ لیا اور نظام عسکریت کو اس کا اصل اصول قرار دیا مگر کیا یہ اسلام کی صحیح تفسیر ہے؟ ہرگز نہیں۔ اگر اسے صحیح مانا جائے تو بڑے بڑے ظالم سلاطین جنہیں یہ ذوق ملک گیری بہت شدید تھا سچے مسلمان سمجھے جائیں۔

مسلمان کا نام محدود ہو جائے نپولین، تیمور اور نادر میں اور آج ہٹلر اور مسولینی سب سے بڑے مسلمان ہوں مگر کیا "اسلام" کی پاکدامنی اور صلح پسندی اس تعبیر کی متحمل ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

کیا ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں میں، مسجد کی محرابوں میں، بازار تجارت میں سچے مسلمانوں کا وجود نہیں ہو سکتا۔ کیا رسول اللہ کی مسجد کے اصحاب صفہ اور سلمان، ابوذر کے ایسے لوگ جو میدان جنگ کے شہسوار نہیں تھے۔ اسلام سے محروم سمجھے جائیں گے۔

کیا بے موقع اور بے محل اقدام جنگ بھی اسلام کی حقیقی روح ہوگا۔ اور کیا زمانۂ امن و صلح میں بھی نظام عسکری ہی مذہب کا مستقل آئین سمجھا جائیگا۔

کچھ لوگوں نے اس کے ساتھ اطاعت حاکم اور ذوق انقیاد کو بڑی چیز سمجھا اور اسے اسلام کے اصولوں میں خاص اہمیت دے دی۔

مگر کیا ہر حاکم کی اطاعت اسلام کا مقصد ہو سکتا ہے اور ہر ایک کے سامنے سر جھکا دینا اس کا نصب العین بن سکتا ہے؟

اصل حقیقت یہ ہے کہ ان تمام لوگوں نے اسلام کے وسیع و مکمل مفہوم میں سے ایک ایک جزو لے لیا ہے اور اسی کو سب کچھ قرار دے کر حد سے بڑھا دیا ہے۔

"حقیقت اسلام" ایک بلند اور کامل نصب العین ہے جس میں کلمہ، نماز اور روزہ، حج اور زکوٰۃ بھی داخل ہیں۔ بلند مقاصد کی حفاظت کیلئے سرفروشی و جانبازی بھی اسکا ایک جزو ہے نظام عسکری بھی ان مقاصد کے تحفظ کے لئے ضروری ہے اور اطاعت حاکم بھی ان اصولوں کے ماتحت جو حقائق اسلامی کے محافظ ہوں ضروری قرار دی گئی ہے۔ اور اس کے علاوہ بہت سے وہ شعبے ہیں جو مذکورہ حدود میں داخل نہیں ہوتے۔

"اسلام مجموعہ ہے عقائد اور اعمال کا۔ عقائد وہ جو عمل کا احساس پیدا کرنے والے ہیں، اعمال وہ جو عقیدہ پر جلا کرنے والے ہیں۔ عقائد وہ جو تمام خلائق کے مقابلہ میں خودداری اور خود اعتمادی پیدا کرنے والے اعمال وہ جو دنیا کی شیرازہ بندی کرنے والے اور اجتماعی نظام کو قوت پہنچانے والے عقائد وہ جو اصلاح کی دعوت دینے والے، اعمال وہ جو اصلاح کے مقصد کی تکمیل کرنیوالے ہیں۔ اسلام کی حقیقت کے لئے اگر ہم ایک جامع لفظ تلاش کرنا چاہیں تو وہ صرف "فرض شناسی" ہے۔ اسی کی وسعت دیکھئے تو عقائد و اعمال کی پوری دنیا آجائے۔

تمام عقائد اسی فرض شناسی کے جذبہ کو بیدار کرنے والے اور تمام اعمال اسی فرض شناسی کے خارجی مظاہرے ہیں۔

اسی فرض شناسی میں حقوق اللہ داخل ہیں۔ اسی میں حقوق الناس اسی

میں اچھائیوں کی پابندی کی مضمر ہے۔ اسی میں برائیوں سے علیحدگی۔

اسی میں حاکم کی اطاعت درج ہے اور اسی میں نظام اجتماعی کا استحکام اور مرکز کا متحد ہو نا بھی مشترک فرائض کی تکمیل کی ایک لازمی شرط ہے۔

یہ خیال کرنا کہ اسلام بس کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ میں مکمل ہو جاتا ہے درست نہیں ہے۔ آخر سچائی، انصاف، امانتداری، حفاظت، شناسی کا بھی تو کوئی درجہ ہے اور جہاد فی سبیل اللہ بھی تو کوئی چیز ہے۔

اسی طرح یہ سمجھنا کہ اسلام بس غلبہ و اقتدار اور نظام عسکری کی تشکیل کا نام ہے، یہ بھی غلط ہے اس کے ساتھ رحم و کرم، مواسات و ایثار اور خدا کی بندگی کے انفرادی فرائض اور حقوق خلق کا لحاظ بھی تو ضروری ہے۔

وہ مسلمان کیا کریں جنہیں ناساز گار فضا میں رہنا ہو جہاں حصول اقتدار کا کوئی موقع نہ ہو اور نظام عسکری کا وجود نہ ہو سکے کیا یہ لوگ اپنے تئیں مسلمان نہ سمجھیں اسلئے کہ اسلام کی طرف سے اب ان کے لیے کوئی نصب العین باقی نہیں رہا۔

وہ مسلمان جو تقسیم عمل کی بنا پر دوسرے اقتصادی اور عملی کام انجام دیتے ہیں اور فوجی نظام میں داخل نہیں ہو سکتے۔ کیا وہ اپنے تئیں حیثیت اسلام سے بیگانہ سمجھ لیں اور کیا جس وقت مستقل امن قائم ہو جائے اور نظام عسکری کی ضرورت باقی نہ رہے اس وقت کیلئے اسلام کا کوئی نظام نہیں ہے اور کیا اسوقت خود اسلام کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

حاکم کی اطاعت فرض ہے مگر یہ غلط خیال ہے یہ کہ مسلمانوں کا ہر بادشاہ امام اور اسکی اطاعت ہر مسلمان پر فرض ہے۔

مسلمانوں کے بادشاہوں میں ایسے اشخاص بھی ہو سکتے ہیں۔ جو قرآنی تعلیمات کے خلاف احکام نافذ کریں ایسے بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں جو قرآن کو فراموش کر دینا چاہیں جبکہ ایسے بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں جو خدا پرستی کے بجائے عملی طور سے اپنی پرستش کی طرف دعوت دیں کیا ایسے بادشاہوں کی اطاعت خدا کی طرف سے فرض ہو گی؟ کیا اسلامی بادشاہ نمرودیت فرعونیت اور شدادیت کا مجسمہ بن جائیں تب بھی سچے مسلمان ان کی اطاعت کو ضروری سمجھیں اور کیا ابراہیمیت اور موسویت کی طاقتوں کو اس وقت محو خواب ہی رہنا چاہیئے؟

اس صورت میں تو اسلام کا دنیا میں کوئی نصب العین اور مقصد ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ وہ نام ہوگا حقیقت بادشاہوں کی متضاد سیاستوں کا جو زمانہ کی رفتار کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں اور جس میں ہر ظلم ناانصافی سیہ باکی اور غلط کاری کی گنجائش ہے۔

در حقیقت اسلام ان میں سے ہر ایک کی اطاعت کا نام ہے تو اسکے معنی یہ ہونگے کہ بسا اوقات اسلام نام ہوگا سفاکی کا ظلم کا قتل و غارت کا ہوس رانی کا۔ اور نہ معلوم کا ہے کا جن باتوں پر انسانیت لعنت کرتی ہے اور تمدن و تہذیب جنہیں نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

مرکز کو مضبوط کرنا نظام اجتماعی کیلئے جتنا ضروری ہے مرکز کے انتخاب میں بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہے اگر مرکزی نقطہ کی تعیین میں غلطی ہو گی تو پورا دائرہ اجتماعی غلط ہو جائیگا اور اسلام کا تمام نظام اپنے محور سے ہٹ جائیگا

• ایک مجلس قانون ساز کو مرکزی حقوق کا سپرد کر دینا اسی وقت صحیح رہنمائی کا ضامن ہو سکتا ہے جب اس کے افراد ہوا و ہوس خواہش نام و نمود، بیجا ضد اور بے محل حفاظت وقار کے جذبات سے بالاتر ہوں ورنہ دنیا میں بہت سی مجلسیں بنتی ہیں جو اشخاص کے ذاتی اقتدار کا آلۂ کار ہوتی ہیں اور جمہور کو دھوکا دے کر انکے سر پر مسلط رہتی اور ان کو نفع کے بجائے نقصان پہنچاتی ہیں۔

مرکزی شخصی یا مجلسی مطلق العنانی کا سد باب قرآن کے ذریعے ہرگز نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن خود تعبیرات کا پابند ہے اسلئے مرکز یا مجلس قانون ساز جیسی چاہے گا ویسی اسکی تعبیر کر دے گا چاہے حقیقتاً وہ صحیح ہو یا غلط جب تک مرکز خود ایسا نہ ہو جو تعلیمات اسلامی کی روح کا محافظ ہو اس وقت تک قرآنی دستور العمل بالکل ناکافی ہے۔

اس وقت ہم آپ کے سامنے اسلام کے اصول اور فروع کے متعلق ایک واضح بیان پیش کرنا چاہتے ہیں ممکن ہے اس سے آپکو حقیقت اسلام کا سراغ مل سکے۔

اصُولِ دِین

اسلام حقیقی کے اصول حسب ذیل ہیں:-

(۱) توحید (۲) عدل (۳) نبوت (۴) امامت (۵) معاد

اب آپ ان میں سے ہر ایک پر غور فرمایئے۔

توحید

یہ پہلا اصول اور بنیاد اساسی ہے جس میں تمام عالم انسانیت کو ایک مشترکہ نقطہ کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے جو سب کا مرکز قرار پاتا ہے۔ ہزار در ہزار نسل، وطن، قوم اور رنگ کے تفرقوں کے باوجود دنیا منسلک ہو جاتی ہے، ایک نظام میں جس ایک ہستی کے اقرار سے جو سب کا خالق اور معبود ہے یہیں احساس پیدا کیا جاتا ہے کہ انسان مطلق العنان نہیں ہے اگر سب ذاتی خواہشوں کے غلام ہوتے تو ہر ایک کی طبیعت اور خواہش کے اختلاف سے عمل اور مقصد میں اختلاف پیدا ہو سکتا تھا مگر یہ سب ایک حاکم کے فرمانبردار ہیں اسلئے ان کا آہنگ عمل اور مقصد ایک ہونا چاہیئے۔ یہ حاکم کیسا ہے؟ حاضر و ناظر ہے ہر جگہ موجود ہے اور ہر بات کو جانتا ہے۔ اسلئے انسان کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ کوئی بات خلاف قانون نہ ہو جائے کسی کام کو چوری چھپے کر کے مطمئن نہ ہو جائے کہ کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ جس نے دیکھ لیا جس کے ہاتھ میں جزا و سزا ہے۔ وہ ایک اکیلا ہے کوئی اسکا مثل و مقابل نہیں اسلئے بس اسی کی رضامندی کی فکر رہنا چاہیئے اور اسی کی ناراضگی سے اندیشہ کرنا چاہیئے۔ اسکی طاقت

سه إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ

له مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ ... وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ... عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ... إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ... يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَلَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَا لَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ... [illegible]

ہر ایک پر غالب ہے۱ اسلئے نہ کسی کی طاقت سے مرعوب ہو، وہ ہر بات پر قادر ہے۲
اسلئے کسی بات کو ناممکن نہ سمجھو وہ ہر کمزوری کا آخری سہارا ہے۔ اس لئے اپنی
کمزوری سے کبھی ناامید نہ ہو۳

اس عقیدہ سے ایک وسیع انسانی برادری کی تشکیل ہوتی ہے جس میں
ہر فرد دوسرے کے ساتھ اتحاد و مساوات کا احساس رکھتی ہو۔ اور
سب ایک نصب العین پر گامزن ہوں، سب اپنی خواہشوں کو مشترک حصول اور
مقصد میں فنا کر دیں اور سب اپنے واحد حاکم کی رضامندی کے خلوت اور انجمن
ہر حالت میں طلبگار رہیں اور کسی وقت قانون کے احترام کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اس
جماعت کے افراد میں خودداری ہو کہ وہ کسی مادی طاقت کے سامنے سر نہ جھکائیں
بلند حوصلگی ہو کہ کسی دشوار مقصد کو ناممکن نہ سمجھیں اور اعتماد ہو جس سے کبھی اپنے دل
میں یاس کا گذر نہ ہونے دیں۔

دیکھئے تو یہی وہ عناصر ترقی ہیں جو بلند مرتبہ اقوام کے شایانِ شان ہیں۔

عدل

یہ دراصل توحید ہی کا ایک شعبہ ہے۔ خدا کی بلند و برتر ذات کے افعال کو
کیسا ہونا چاہیے؟ جیسے اس کی ذات کامل ویسے ہی اس کے افعال۔ ان میں نقصان
فساد خرابی اور برائی کا گذر نہیں ہو سکتا۔ اس کا قانون جو اس کے تمام

---

۱ ھُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ
۲ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ
۳ لَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللّٰهِ إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللّٰهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ

کا عمل میں جاری ہے عدالت ہے[1] یعنی ہر کام میں کا حکمت اور مصلحت کے موافق ہے کسی کی حق تلفی کسی پر ظلم[2] اسکی کوئی کام عبث اور بیکار نہیں کرتا۔ اسکی عدالت ہی بندوں سے بھی انصاف اور عدالت کی طالب ہے[3] جس نے ہمیں ایک امانت دی ہے جس کا نام ہے اختیار ہمیں اس اختیار کو قانون الٰہی کے مطابق صرف کرنا چاہئے۔ عدل کا مقابل ہے ظلم۔ ظالموں پر خدا نے لعنت[4] کی ہے اسلئے کہ وہ خدا کے قانون کو توڑنے والے ہیں[5]۔

اس عقیدے سے اس برادری میں جو انسانیت کے سلسلہ میں قائم کی گئی ہے تمام حقوق اور انصاف و مساوات کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں اس برادری کے افراد ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے[6] کیونکہ یہ علم ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر اس دنیا میں فوقیت جو نظر آتی ہے بالکل وقتی اور عارضی ہے خالق کی نگاہ میں سب یکساں ہیں اور وہ سب کے ساتھ یکساں سلوک کریگا۔ گناہ اگر غریب کریگا تو سزا ملے گی اور امیر کریگا تو سزا پائے گا۔ وہاں اسکی دولت اور ثروت کچھ کام نہ آئے گی نہ یہ رشوت دیکر اپنے بچاؤ کا سامان نکال سکے گا اور اچھا کام اگر امیر کریگا تو انعام پائیگا اور غریب کریگا تو انعام پائیگا۔ اسکی غربت اس کی کس مپرسی کا باعث نہ ہوگی۔ اسطرح ہر شخص کو اپنے فرائض کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنے

---

[1] وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ
[2] إِنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِلْعَبِيدِ [3] إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ
[4] أَلَا لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الظَّالِمِينَ [5] وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ [6] لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ

اعمال کی جانچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ افراط اور تفریط۔ اسراف اور کنجوسی سب ظلم ہیں اور ہر چیز میں وسط کا نقطہ عدالت کا مرکز ہے۔ انسانی کمالات کی دنیا اسی اعتدال کے نقطہ پر بستی ہے۔

خدا کو عادل سمجھنا اس اعتدال کی پابندی کا واحد محرک ہے اور اسی لئے جو اس اعتدال پر قائم رہیں انہیں عادل کہا جاتا ہے اور سچے مسلمان وہی ہیں جو عدالت کی صفت سے ممتاز ہوں[1]

نبوت

یہ تیسرا اصول ہے۔ حاکم مطلق یعنی خدائے واحد کے احکام و قوانین عام بندوں تک پہنچانے والا اس کے فرمانوں کا اجرا کرنے والا اس کے پیغام کا پہنچانے والا رسول ہوتا ہے جو اپنے اخلاق اور سیرت میں ایک معیاری اور اعلیٰ مثال ہوتا ہے[2] سب پر اس کی اطاعت لازم ہے کیونکہ وہ عام خلائق میں خدائے احکم الحاکمین کا نمائندہ ہوتا ہے اس کے احکام خدا کے احکام ہوتے ہیں[3] کسی کو اس کے مقابلہ میں رائے زنی عقل آرائی اور طبع آزمائی کا حق نہیں ہے۔ نہ اس کے فیصلے کے بعد کسی کو چون و چرا کا موقع[4]

طرفداری، جاہ طلبی، خود غرضی، انانیت، جبروت اور نفسانیت سے پیدا شدہ کشمکش جو جماعت کے افتراق کا باعث ہوتی ہے محو ہو جاتا چاہیے

---

[1] وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ

[2] لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

[3] مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا

[4] وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ

اس اختیار و اقتدار کے نیچے جو رسول کو حاصل ہے اور اسی خود مختارانہ اقتدار
میں جماعت کی تنظیم و ترتیب اور نظم و اجتماع کا راز مضمر ہے۔

امامت

رسول کی زندگی دنیا میں محدود ہے۔ ان کے دنیا سے اٹھ جانے کے
بعد اگر عام رعایا کو ان کی رائے، خواہش اور مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو پھر
ہی مطلق العنانی خود غرضی برسرکار آجائیگی اور جذبات کی حکومت ہو
جائیگی جس کا نتیجہ سوائے افتراق و انتشار اور ابتری کے کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو
نظم و شیرازہ رسول کی خود مختارانہ آمریت سے قائم ہوا تھا۔ وہ پریشان ہو
جائیگا۔ اگر انکے بعد افراد اور جماعتوں کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور انکے
لئے کوئی واحد مرکز مقرر نہ کیا جائے۔

عقیدۂ امامت اس اجتماعی انتشار کا سد باب ہے وہ یہ تسلیم کرتا ہے
کہ نبی کے بعد بھی خداوندی قانون پر دنیا کو چلانے کیلئے مرکز موجود ہے
وہ مرکز ایک ایسا شخص ہے جو خود قانون پر عمل کا بہترین نمونہ ہے اور
قانون کے جزئیات پر پورے طور سے مطلع۔ تاکہ اسکی پیروی کر کے لوگ
صحیح اصول سے بھٹکنے نہ پائیں۔ جماعت کا انتظام اور شیرازہ بندی بھی
اسی کے وجود پر موقوف ہے اسکی اطاعت رسول کی اطاعت کی طرح
ضروری ہے۔ کیونکہ جس طرح رسول خدا کا نمائندہ تھا اسی طرح یہ اس
رسول کا جانشین ہے وہی تمام امت اسلامیہ کیلئے مرکز بن سکتا ہے اور
اگر کسی وقت میں جیسا کہ آجکل ہے اس تک دسترس نہ ہو تو وہی اشخاص

---

۱ اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ

جو رسول اور ائمہ کے تعلیمات کے حامل ہوں مرکز امت قرار پا سکتے ہیں
ان کے ہدایات پر عمل کرنا جو کتاب و سنت کے ماتحت ہوں تمام مسلمانوں
کا فرض ہوگا اور جو نظام ان تعلیمات پر مبنی ہو وہی اسلامی نظام سمجھا جائیگا
اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے خلق کے لئے ایک مرکز کی
ضرورت تسلیم کی ہے مگر یہ مرکز مادی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ روحانی
حیثیت رکھتا ہے اس مرکز میں اصل حکومت خدا کی ہے[1]۔ اور اسکی
نمائندگی ہیں رسول اور اسکے جانشین یا اُن کے تعلیمات کے حامل افراد
دنیا کیلئے مرکز اتباع ہیں۔ یہ وہ نظام ہے جسکا اصل دارالسلطنت دل
ہے اور دلوں پر حکومت کر کے افعال و اعمال کو پابند بنایا جاتا ہے۔ اسلام
میں سلطنت خدا کی ہے۔ دنیوی بادشاہت کوئی چیز نہیں ہے۔

بادشاہ کی اطاعت اپنی حفاظت جان و مال کیلئے ایک مجبورانہ فعل ہے[2]
جو امن و امان قائم رکھنے کیلئے تمدنی حیثیت سے ضروری ہے مگر اسے کوئی
مستقل حیثیت اور حقانیت کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

اسلام کسی شہنشاہیت کی بنیاد قائم نہیں کرتا بلکہ انسانیت کا نظام
بناتا ہے اور ایک قوم کی تشکیل کرتا ہے جو انسانیت کا صحیح نمونہ ہو اور اس
نظام انسانیت کیلئے ایک محافظ قرار دیتا ہے جو ان تمام انسانوں کا واحد مرکز
ہو۔ یہ اپنے زمانہ میں رسول ہے اور رسول کے بعد اس کے نامزد کردہ
جانشین یعنی امام و ائمہ کرام اور براہ راست رہنمائی سے مجبور ہوں تو ایسے افراد جو ان

---

[1] إنّ الأرض لله

[2] إلّا من أكره وقلبه مطمئنّ بالإيمان.

کی تعلیمات پر زیادہ سے زیادہ مطلع اور عامل ہوں۔

معاد

خدائے واحد کے مقرر کردہ نظام کی پابندی کیلئے نمائندہ خصوصی یعنی رسول کے پیغام کی قبولیت اور ان کے جانشینوں کے احکام کی اطاعت کیلئے جزا و سزا کا نفاذ ضروری ہے۔ یہ خدا کی عدالت کا لازمی تقاضا ہے۔ اور اسی سے طاعت گزار اور نافرمان اشخاص میں امتیاز قائم ہو سکتا ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اصول دین ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ جن میں سے ایک کڑی بھی نکال دی جائے تو نظام برہم ہو جائے گا اور تمام اصول کا مقصد یہ ہے کہ خدائی حکومت کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے۔

اس کے مقابلہ میں کسی کی اطاعت نہ کی جائے اس کے قانون کی پابندی ہو اور اس قانون کے جاری کرنے والے اور اس کی حفاظت کرنے والے اور اس کے قائم رکھنے والوں کی اطاعت کی جائے اس قانون پر عمل کے لئے جزا اور اس قانون کو توڑنے کیلئے سزا مقرر ہے جس کا نام معاد ہے۔[1]

فروع دین

قانون الٰہی کے تحت میں کچھ احکام جاری کئے گئے ہیں اور فرائض قرار دئیے گئے ہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ترقی کے لئے ضروری

---

[1] وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ۔

ہیں۔ ان کا نام فروع دین ہے ان پر عمل کرنا ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے اور بغیر ان پر عمل کے اسلام کا مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

۱۔ نماز ۲۔ روزہ	انفرادی تکمیل کیلئے
۳۔ حج ۴۔ زکوٰۃ ۵۔ خمس ۶۔ جہاد ۷۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر	اجتماعی زندگی کی تکمیل کے لئے

نماز

حاکم اصل یعنی مرکز احدیت کے ساتھ ارتباط کا احساس پیدا کرنے والی ایک روزمرہ میں ہر روز حاضری کا تخیل قائم کرنے والی اور اس کے ساتھ اپنے رشتۂ عبودیت کی رابر یاد دلانے والی ہے۔

اس کا اصل جوہر ہے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز کو بھول کر اپنے خدا کی طرف خالص توجہ خاص کرنا۔ مادی ماحول کو عبور کر کے مرکز حقیقت پر نگاہ کو قائم رکھنا۔ بار بار کی ریاضت سے اگر یہی چیز دماغ میں راسخ ہو گئی تو انسان اپنے تمام فرائض کا احساس رکھیگا اور کوئی ایک بھی اخلاقی یا اجتماعی جرم اس سے صادر نہیں ہو سکتا۔[1]

---

[1] اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَر۔

روزہ

ضبطِ نفس کی عملی مشق۔ خواہشوں سے مقابلہ کی ورزش اور جہاد نفس کی تیاری کا میدان ہے۔ قانون کی خلاف ورزیاں تمام انسانی جذبات اور خواہشوں سے ہوتی ہیں۔ اگر جذبات پر قابو حاصل ہو جائے (انسان فرائض کو نظر انداز نہ کرے) روزہ ان ہی جذبات کے مغلوب کرنے کا عملی ذریعہ ہے۔ اسی سے تقوے کی صفت پیدا ہوتی ہے[1] جس کا دوسرا نام ہے احساسِ فرائض۔ سب سے زیادہ کامل انسان وہی ہے۔ جو سب سے زیادہ فرض شناس ہو[2]

حج

فرض کے احساس میں وطنی زندگی، راحت اور آرام اور اس کے ساتھ ساتھ مال کی قربانی کرتا ہے۔ مختلف ممالک کے قومی اور وطنی امتیازات کو بھلا کر سب کے ایک نقطہ پر مجتمع ہونے کا مظاہرہ ہے[3]۔ اور یہ بتلاتا ہے کہ مشترک مقصد کے حاصل کرنے میں آپس کے نسلی اور وطنی امتیازات سدِ راہ نہیں ہیں۔

---

[1] كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ [2] إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ

[3] جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ

اس کے علاوہ مسلمانوں کی وسیع برادری میں میل جول پیدا کرکے ان کو اجتماعی زندگی کے فوائد سے روشناس بناتا ہے اور ان کو ایک جگہ جمع کرکے جماعتی مفاد کے تدابیر سوچنے اور تبادلۂ خیالات کرنے کا موقع دیتا ہے۔

زکوٰۃ و خمس

دولتمند طبقہ میں ایثار و ہمدردی کا احساس پیدا کرنا اسلامی جماعت کے محتاج افراد کی احتیاج کو دور کرکے جماعت کو مضبوط بنانا اور مخصوص سرمایہ سے مشترک مقاصد کے حصول کا سامان مہیا کرنا۔

جہاد

انفرادی زندگی کو اجتماعی زندگی کے مفاد پر قربان کر دینا اور بیرونی خطرات سے جماعت کو محفوظ رکھنا۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

خداوندی حکومت کا رضاکارانہ فرض خلق خدا کی بہبودی اور مفاد عامہ کی حفاظت اور قانون خداوندی کے احترام کو قائم رکھنے میں ہر مسلمان کو ایک سپاہی کی حیثیت سے حصہ لینا اور ہمدردی کے ساتھ ہر غلط راستہ چلنے والے کو

ٹھیک راستے پر لانے کی کوشش کرنا۔[1]

غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ فروع دین بھی ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں جن کا مقصد ہے عادل مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت کا قائم کرنا جو فرائض کا احساس رکھنے کے ساتھ بیرونی خطرات سے محفوظ ہوں اور جن میں کا ہر فرد محتاجی سے آزاد ہو کر پوری توجہ سے مفاد عام میں کوشاں ہو اور شخصی مفاد کو اجتماعی مصلحت پر قربان کرنے کے لئے تیار ہو۔

اصول و فروع کا مجموعی خلاصہ

اب آپ ایک نظر سے اگر اصول اور فروع دونوں کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اسلام کا مقصد ہے ایک ایسی قوم کا پیدا کرنا جو خدا کی بادشاہت کو تسلیم کرے۔ اس کے مقرر کردہ حاکم (رسول) اور اس کے نائبین (اولوالامر یعنی ائمہ معصومینؑ) کے احکام پر وفاداری کے ساتھ عمل کرے۔ تشتت و افتراق اور باہمی اختلافات سے بچتے ہوئے سب اسی ایک رشتہ میں منسلک ہوں۔ فرائض کا احساس رکھیں۔ کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب نہ ہوں، نہ کسی لالچ کے فریب میں مبتلا ہوں۔

---

[1] وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔

اپنے مالک کی طاقت پر بھروسا رکھیں، کبھی ہمت نہ ہاریں کبھی ناامید ہوں۔ آپس میں اتحاد و مساوات کا خیال کریں قانون عدالت کے پابند رہیں۔ باہمی حقوق کا لحاظ رکھیں اور اپنے تمام افعال میں افراط و تفریط سے بچتے ہوئے نقطۂ اعتدال پر قائم رہنے کی کوشش کریں۔ خدا اور رسولؐ کے احکام کے سامنے اپنے اختیارات خصوصی اور حقوق امتیازی کا دعویٰ نہ کریں۔ اپنی مرضی کو قانون کے ماتحت رکھیں، اور احکام رسولؐ کا تابع قرار دیں۔ اپنے مرکز سے کبھی منحرف نہ ہوں اور خودسری و سرکشی کے مرتکب نہ ہوں، دنیا کی ذہنی کامیابی اور ناکامی کے آگے ایک آخری انجام کا یقین رکھیں اور اپنے اعمال و فرائض میں آخرت کو ہمیشہ مدنظر رکھیں۔ قانون کی پابندی کو فرض سمجھیں اور اپنی ذاتی خواہشوں اور نفسانی تقاضوں کو اپنے قابو میں رکھیں۔ اچھے افعال کے پابند ہوں اور بُرے افعال سے کنارہ کشی کریں، فرائض کی بجا آوری میں جسمانی مشقت اور مالی قربانی کو برداشت کر سکیں اور ضرورت ہو تو جان تک دینا گوارا کریں۔ آپس میں اجتماعی رشتہ کو مضبوط و مستحکم رکھیں اور کمزور افراد کو اپنے سرمایہ اور طاقت سے فائدہ پہنچا کر مشترک مقصد کو قوت پہنچائیں۔

یہ جماعت اپنی فرض شناسی، ایثار اور تنظیم کی وجہ سے ایسی طاقتور ہو کہ بیرونی حملوں کا خطرہ نہ پیدا ہو اور ان میں سے ہر فرد

یا کسی خارجی رکاوٹ کے اپنی داخلی اصلاح اور قومی تربیت اور ناواقف افراد کی رہنمائی اور ناقص اجزاء کی تکمیل میں ہمہ تن سرگرم ہو۔

یہ ہوں گے حقیقی مسلمان اور جس دنیا میں ایسے آدمی بس جائیں وہ ہوگا واقعی "دارالاسلام"

کیا رسولؐ کے بعد ظاہری مسلمانوں نے کبھی اس پر غور کیا اور ہوس ملک گیری کے پیچھے اس طرح کی جماعت کی تشکیل کی بھی کوشش ہوئی؟

اسی کا نتیجہ تھا کہ (وَاَنتم الاعلون) کا وعدہ ختم ہو گیا اور "مسلمان" دنیا میں محکوم ہو گئے۔

کاش اب بھی آنکھیں کھلیں اور سمجھیں کہ ہماری تمام ترقیاں "مسلمان" بننے میں مضمر ہیں۔

مردم شماری میں اضافہ سے کوئی حاصل نہ ہوگا جب تک مسلمانوں میں "حقیقت اسلام" کا جوہر پیدا نہ ہوگا۔ اور "پاکستان" کی شاندار ترقی مفلوج ہو جائے گی جبکہ اس میں وہ مسلمان نہ ہوں گے جو اپنے اوصاف سے دنیا بھر کو فتح کر سکتے ہوں۔

خدا کا ثبوت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
وکفیٰ الحمد والصلوٰۃ علیٰ رسولہ الکریم

خدا کا تصور شروع میں جس طرح بھی پیدا ہوا ہو بہرحال پیدا ہوا اور اب جب کہ یہ تصور ذہنِ انسانی میں موجود ہی ہے۔ تو اس تصور کو ختم کیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کوشش کے ساتھ اس کی تصدیق کو شک کے ساتھ مخلوط کر دیا جائے اس تصور کا بقاء اور پھر اس تصدیق کے مقابلہ میں جاہلانہ کوششیں جو ایک طبقہ کی طرف سے ہمیشہ ہی جاری رہیں اور اب زیادہ نمایاں طور پہ جاری ہیں۔ یہی ایک خیالی الجھن فرد کے ذہن میں ذوقِ تحقیق پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں۔ جس کے ساتھ طبیعت کی افتاد، ذہن کی روش اور دلائل کا وزن بہت سوں کو بہرحال اس کے ماننے کی دعوت دیتا رہے گا۔ اور اس طرح یہ خدا کے خلاف "جہاد" بھی خدا پرستی کو زندہ رکھنے کا سبب ہوگا۔

پیشِ نظر تصنیف اس سلسلہ میں ان لوگوں کے لئے سرمایہ بنے گی۔ جو سنجیدگی کے ساتھ حقیقت کو سمجھنے کی تشنگی محسوس کریں۔

خدا یعنی چہ؟

کائنات کے لئے ایک مبدأ اول کا وجود تو سب کے نزدیک مسلّم ہے۔ مادیّین طبیعیین بھی عالم کا ایک مبدأ قرار دیتے ہیں۔ اسے نیچر کہا جائے یا ذرات مادہ۔ لیکن وہ خدا کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا۔ کہ خدا صرف کسی مبدأ اوّل کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اس میں کچھ قیود کی ضرورت ہے۔ انہیں قیود کے ماننے اور نہ ماننے کے ساتھ خدا کے اقرار اور انکار کا امتیاز وابستہ ہے۔

پہلی قید یہ ہے کہ وہ اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہے اس کے معنی یہ ہیں۔ کہ وہ اس کائنات میں شامل نہیں ہے بلکہ اس کے ماوراء ہے۔ مادیین و طبیعیین جس مبدأ اول کے قائل ہیں وہ اس کائنات کا جز ہے۔ اور اس کے اندر کارفرما ہے۔

اس فرق کو یوں سمجھنا چاہیے کہ کوئی بھی مرکب شے جو تیار کی جائے اس میں چار چیزیں ہوتی ہیں جو اس کے وجود میں دخیل ہیں۔

ایک وہ اجزاء جن سے مل کر وہ چیز بنائی گئی ہے جیسے تخت کیلئے لکڑی کے تختے، لوہے کے پیچ اور کیلیں۔ انکو علت مادیہ کہتے ہیں۔

دوسرے وہ صورت جو ان اجزاء کے اجتماع سے پیدا ہو۔ اسے علت صوریہ کہا جاتا ہے۔

تیسرے وہ شخص جو اس کا تیار کرنے والا ہے جیسے وہ بڑھئی جس نے تخت تیار کیا ہے۔ یہ علت فاعلیہ ہے۔ اور چوتھے وہ مقصد جس کیلئے یہ تخت تیار کیا گیا۔ یہ علت غائیہ ہوتی ہے۔ یہ تو ایک خاص مرکب

چیز ہے اب اسی معیار پر اس تمام عالم کے مجموعہ پر نظر ڈالئے۔ کل تمام عالم کے لئے مادیین اور طبیعیین جس مبداء اول کو تسلیم کرتے ہیں وہ فقط علتِ مادیہ ہے۔ وہ اس کائنات سے الگ کچھ نہیں ہے مگر خدا کے ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہر مرکب کی طرح اس عالم کے لئے بھی ایک علتِ فاعلیہ تسلیم کی جائے جسے اس دنیا کا موجد کہا جا سکے۔ اس کا اقرار خدا کا اقرار ہے۔ اور اسے تسلیم نہ کرنا خدا کا انکار ہے۔

اسی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک قوت کو اس تمام خلق میں کارفرما مان کر یہ سمجھنا کہ یہ بھی ایک طرح خدا کا اقرار ہو گیا درست نہیں ہے جب تک کہ اس قوت کو اس کائنات سے خارج مان کر فاعل تسلیم نہ کیا جائے۔ اس فاعل حقیقی کو مان لیا جائے تو بیشک خدا کا اقرار ہو گیا۔ چاہے پھر اس کی تعبیر قوت ہی کے لفظ سے کر لی جائے۔ کیونکہ تعبیرات سے اصل حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور ایمان کا تعلق حقیقتوں کے ماننے کے ساتھ ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ نہیں ہے جن سے ان حقیقتوں کا اظہار کیا جائے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ مادیین وطبیعیین جس مبداء اول کے قائل ہیں اس کے افعال یا خواص میں شعور کا کوئی سوال نہیں ہے مگر خدا کو ماننے کے معنی ہیں ایک ایسی ذات کو ماننا جو علم وشعور کی مالک ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس علم وارادہ کی کیفیت کے سمجھنے میں علمائے مذاہب یا فلاسفۂ الٰہیین باہم مختلف نظر آتے ہیں۔ لیکن اصل علم وشعور کا ثبوت ایک نقطۂ مشترک ہے جس کے مانے بغیر خدا کا تصور کامل قبول نہیں ہے۔

اس طرح خدا کو ماننے کے معنی قرار پاتے ہیں۔ کائنات کے لئے ایک باشعور خالق کا اقرار۔ بقول جوش کے

یعنی درمیانِ پردۂ صد رنگ کائنات
اک کارساز ذہن ہے اک باشعور ذات

اسی ذات کو جسے "درمیانِ پردۂ کائنات" "باشعور کارساز" مانا جاسکے خدا کہتے ہیں۔

وجوب وجود

جس چیز کی ہستی کے ساتھ نیستی کا گذر ہو اسے ممکن اور حادث کہتے ہیں۔ اور جس میں نیستی کا گزر نہ ہو اسے "واجب الوجود" کہتے ہیں۔ عالم کی ہر چیز ممکن اور حادث ہے جب اس سب کا مجموعی طور پر تصور کرکے اس کے لئے خالق کو تسلیم کیا تو اس کا نتیجہ یہی ہے کہ وہ اس سلسلہ کا جز نہیں ہے اس سے خارج ہے۔ اور جب اس سے خارج ہے تو واجب الوجود ہے۔

اس طرح تمام عالم کائنات کے ماوراء واجب الوجود کو ماننا اور خدا کو تسلیم کرنا دونوں باتیں لازم و ملزوم ہوگئیں۔

خدا کو ثابت کرنے کے طریقے:۔

مذکورہ بالا بنیادوں پر خدا کی تصدیق حاصل کرنے کے دو راستے ہوگئے۔

ایک ممکنات کے ماوراء واجب الوجود کی ضرورت ثابت کرنا۔ یہ فلاسفہ کا راستہ ہے۔

وجودِ شے مخلوق کے لئے خالق کی ضرورت ثابت کرنا۔ یہ متکلمین کا راستہ ہے۔ اور چونکہ یہ دلائل اصطلاحات کے دقیق سے زیادہ بوجھل ہے اس لئے خواص ہی کے دماغ کو زیادہ متوجہ کرسکتا ہے۔ اور دین خواص وعام سب کے لئے ہوتا ہے اس لئے رہنمایانِ دین نے زیادہ تر دوسرے طریقے کو اختیار کیا ہے اور قرآن وحدیث میں بیشتر اسی رُخ سے استدلال نظر آتا ہے۔ لیکن نتیجہ میں دونوں راہیں ایک ہی منزل پر پہنچتی ہیں پھر انداز استدلال اور اسلوب استنتاج سے ہر طریقے میں مختلف طریقے ہو گئے جو زیادہ تر انہی دو راستوں کی طرف راجع ہوتے ہیں۔

یہ دونوں راستے تو نظری حیثیت سے ہیں۔ اس کے علاوہ نفسیاتی اور ذوقی پہلو اور راستے ائمۂ دین اور عارفین کاملین نے اختیار کئے ہیں جو بہت سے افراد کی طمانیتِ ضمیر کا باعث بنتے رہے ہیں۔

واجب الوجود کی ہستی پر ایک دلیل:۔

تمام عالم کائنات کو ایک مجموعہ کی صورت میں خیال کیا جائے اور اس مجموعہ کے متعلق اس پر غور کیا جائے کہ یہ بذاتِ خود وجود کا مستقاضی ہے یا نہیں۔ اگر یہ اپنی ذات کے ساتھ وجود کا حامل اور اس کا مستقاضی ہوتا تو کبھی اس میں ناپائداری، بے ثباتی، تغیر اور انقلاب نظر نہ آتا۔ پھر یہ کہ اگر وجود اس کے ذاتیات میں داخل ہوتا۔ تو اس عالم کی کسی شے کے بھی تصور کے وقت یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ کہ وہ ہے۔ یا نہیں مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا نہیں۔ بلکہ ہوش میں ہماری عقل دونوں

پہلوؤں کی گنجائش دیکھتی ہے۔ یہ بھی کہ وہ ہو اور یہ بھی کہ وہ نہ ہو۔ یہ بھی کہ وہ آج ہو کل نہ ہو۔ اور یہ بھی کہ وہ کل ہو۔ آج نہ ہو۔

پھر جب بذات خود اس میں کسی ایک بات کا تقاضا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ پورا مجموعہ ممکن ہے۔ تو اس کے وجود کو عدم پر ترجیح کیونکر ہوئی یقیناً اس کے لئے کوئی خارجی سبب ہونا چاہئے۔ اور وہ خارجی سبب ایسا ہی ہو سکتا ہے۔ جس کی ذات سے وجود الگ نہ ہو سکے۔ اسی کو واجب الوجود کہتے ہیں۔

استدلال کی دوسری صورت

دنیا میں ہر چیز اپنے ایک مرکز کا پتہ دیتی ہے۔ مثلاً ایک خوردہ فروشی کی دکان پر جائیے تو وہاں متفرق چیزیں نظر آئیں گی۔ تھوڑا سا کاغذ رکھا ہوا ہے۔ کچھ قلم رکھے ہوئے ہیں۔ کچھ دوائیں ہیں۔ کچھ قفل ہیں۔ غور کرتے ہیں تو یہ چیزیں آپس میں ایسا تعلق نہیں رکھتیں کہ ہوں تو ایک ہی ساتھ ہوں۔ اس لئے عقل طے کرتی ہے کہ ان میں ہر ایک کا اصل مخزن دوسرے سے علیحدہ ہے۔ وہاں سے یہ تھوڑا تھوڑا سا لا کر یہاں اکٹھا کر لیا گیا ہے۔ اور جو ہر ایک کا مرکز ہے۔ وہاں وہی چیز ہو گی۔ دوسری نہ ہو گی۔ مثلاً پیپر مل میں کاغذ ہی کاغذ ہو گا۔ قلم نہ ہوں گے۔ قلم کے کارخانے میں کاغذ نہیں ہو گا۔ اور اسی طرح تمام چیزیں۔ وہ ان کا جزئی وجود ہے جو دوسری چیزوں کے ساتھ مجتمع نظر آتا ہے۔ ورنہ ہر ایک کا اصل مرکز وہ ہے۔ جس میں دوسرے کی شرکت نہیں ہے۔

اب دیکھئے کہ عالم امکان کی تمام چیزوں میں ہستی و نیستی ہم عنان ہیں۔ ہر شے میں ہستی کا پہلو بھی ہے اور نیستی کا بھی۔ لیکن خود ہستی اپنی حقیقت کے لحاظ سے نیستی کے ساتھ لازم و ملزوم نہیں ہے۔ لہٰذا ماننا پڑے گا۔ کہ یہ ان دونوں کا اجتماع محل کی خصوصیت سے عارضی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ہستی کا ایک اصلی مرکز ہے۔ جہاں نیستی کا گذر نہیں اور وہ واجب الوجود کی ذات ہے۔

تیسری صورت :-

جب ہم کائنات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہم کو وجود کے ساتھ نقائص نظر آتے ہیں۔ اور ان نقائص کے لحاظ سے ہم مختلف ماہیات و طبائع کا تصور کرتے ہیں۔

یہ مختلف طبائع کی تفریق اور مختلف انواع کی تشکیل صرف ان حدود و قیود سے ہوتی ہے جو وجود کے ساتھ منضم ہو گئے ہیں۔ اور یہ حدود و قیود سب عدمی ہوتے ہیں۔ مثلاً جسم کیا ہے؟ وہ موجود جو محتاج مکان و حیز ہو۔ یہ احتیاج امر عدمی ہے اور جسمیت اسی سے وابستہ ہے۔ پھر اجسام میں جماد کیا ہے وہ جسم جو بس جسمیت رکھتا ہو۔ نمو نہ کیا؟ یعنی اس میں نشوونما نہیں ہے۔ اسی حد عدمی سے جمادیت وابستہ ہے۔ پھر نباتات؟ وہ جن میں نشوونما ہے اور بس۔ یہاں بس کے معنی یہ ہیں کہ احساس اور حرکت ارادی نہیں ہے تو اس عدم سے نباتات کی حقیقت وابستہ ہے۔ یوں ہی حیوان وہ جس میں احساس اور حرکت ارادی ہے۔ اور انسان جس میں نفس ناطقہ

یعنی ادراک کلیات کی قوت اور صلاحیت فکر و نظر ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ عالم کائنات جو مختلف طبائع و ماہیات پر مشتمل ہے، اس کی حقیقت کیا ہے؟ محدود وجودات کا مجموعہ یہ حدیں کہاں سے آتی ہیں۔ عدم کی طرف سے۔ مگر یہ وجود جس میں یہ قیدیں لگتی ہیں۔ کہاں سے آیا ہے؟ ان محدود سے نہیں۔ کیونکہ وہ تو عدمی ہیں اور خود اسی وجود میں ملحق ہوئی ہیں۔ اس کے لئے یقیناً ایک اصل وجود ماننا ضروری ہے۔ جس میں کوئی حد و قید نہ ہو۔ وہی وجود غیر محدود "واجب الوجود" کہا جائے گا۔

امکان و حدوث کا اصل سرچشمہ یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں وجود سے زائد ایک اس کی ماہیت و طبیعت ہے۔ اور وہ "وجود غیر محدود" وہ موجود ہے۔ جس میں وجود کے علاوہ کوئی طبیعت و ماہیت نہیں ہے۔ اس لئے کہیں پر اس میں نیستی کا گذر نہیں۔ یہی واجب الوجود ہونے کے معنی ہیں۔

ایک قدیم طریقہ:-

عالم متغیر ہے۔ یہ مشاہدہ سے ثابت ہے۔ اور ہر متغیر حادث ہے۔ کیونکہ تغیر کے معنی ہی یہ ہیں۔ کہ جو حالت اب رونما ہوئی وہ پہلے نہ تھی۔ یہ عدم کی آمیزش ہی حدوث کی نشانی ہے۔ اور ہر حادث کے لئے عدم سے وجود میں لانے کے لئے ایک موجد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب وہ موجد بھی اگر حادث ہوگا۔ تو اس کے لئے ایک اور موجد کی ضرورت ہوگی۔ اور پھر بھی

سوال اس موجد میں پیدا ہوگا۔ یہاں تک کہ یا تو یہ سلسلہ برابر یونہی چلتا رہے گا اور کہیں پر ختم نہ ہوگا۔ تو اس کا نام تسلسل ہے۔ اور یا کسی منزل پر آ کر یہ ماننا پڑے گا کہ اس کا موجد وہی قبل والا ہے تو اس کو دور کہتے ہیں اور دور و تسلسل دونوں عقلاً محال ہیں۔ اس سے مفر صرف اسی صورت میں ہے کہ موجد کو قدیم (یعنی ہمیشہ سے) اور واجب الوجود مانا جائے۔ تاکہ وہ اپنے وجود میں کسی موجد کا محتاج نہ ہو۔

خالق کا ثبوت :۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے یہی وہ طریقہ ہے جس پر قرآن مجید اور حدیث میں زیادہ زور دیا گیا ہے۔

قرآن کہتا ہے :۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝

یقیناً آسمان و زمین کی خلقت شب و روز کی آمد و رفت، وہ کشتیاں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزوں کو لے کر دریاؤں میں پھرتی ہیں۔ وہ جو اللہ آسمان سے پانی برساتا ہے۔ تو اس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ وہ جانور جو اس نے زمین میں

پھیلا رکھے ہیں۔ ہواؤں کی گردشیں اور وہ بادل جو آسمان و زمین کے بیچ میں اسی کے قبضۂ قدرت کے پابند ہیں ان سب میں نشانیاں ہیں۔ ان کے لئے جو صاحبانِ عقل ہیں۔
نشانیاں کس کی اپنے پیدا کرنے والے کی۔

خلاصہ اس استدلال کا یہ ہے کہ ہر نقش اپنے نقاش کا ہر تصنیف اپنے مصنف کا اور ہر عمارت اپنے معمار کا پتہ دیتی ہے۔ اسی طرح اس کائنات عالم کا ہر ذرہ اس کا گواہ ہے کہ اس کا کوئی پیدا کرنے والا ہے اسے ایک معمولی دماغ والا بچہ اور سطحی نگاہ رکھنے والا جاہل اپنی زبان میں سمجھ سکتا ہے۔ اور اسی کو ایک فلسفی اپنے علمی اصطلاحات سے ثابت کرتا ہے۔ جو عوام کو ایک پیچیدہ مسئلہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ مگر بات یہی ایک ہے کہ اثر بغیر موثر کے نہیں ہوتا۔ اور صنعت بغیر صناع کے وجود میں نہیں آسکتی۔ لہذا یہ کائنات بغیر کسی خالق کے نہیں ہو سکتی۔

وہی امکان و حدوث اور علت و معلول والا استدلال جو فلسفی اصطلاحات کے جال میں پھنس کر ہفت خوان بن جاتا ہے اس کو ایک ضعیف العمر بڑھیا بالکل آسان طریقہ سے کہدیتی ہے۔ اس وقت جب اس کے سامنے چرخا ہے اور وہ کات رہی ہے کوئی پوچھتا ہے۔ تم نے اپنے خدا کو کیونکر پہچانا؟ وہ جواب دیتی ہے اسی چرخے سے۔ دیکھو جب تک میں اسے چلاتی رہتی ہوں۔ یہ چلتا رہتا ہے۔ اور ادھر میں نے ہاتھ

روکا۔ بس یہ رک گیا۔ پھر جب یہ اتنا سا پرخہ بغیر کسی چلانے والے کے نہیں چلتا۔ تو اتنا بڑا دنیا کا انتظام بغیر کسی منتظم کے کیونکر قائم رہ سکتا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے جو آج کل منکر خدا کی حیثیت سے نمایاں شہرت رکھتے ہیں غیر شعوری طور پر اس حقیقت کو نظم کیا ہے۔

نشاں جادہ نما راہ میں بتاتے ہیں
کہ تھوڑی دور پہ آگے سوار جاتے ہیں
ٹپک کے جھاڑیاں سے خون یہ بتاتا ہے
کہ زخم کھا کے ادھر سے شکار جاتا ہے
صنم تراش نہ ہو تو صنم نہیں بنتا
قدم نہ ہو تو نشان قدم نہیں بنتا
یونہی یہ راہ کہ ہے جس کا نام کاہکشاں
یونہی یہ نقش قدم راہ ونیر تاباں
یونہی یہ گرد سیہ راہ خوش نما تارے
رواں ہیں جن کی جبینوں سے حسن کے دھارے
زمیں کا نور ہیں اور آسماں کی زینت ہیں
کسی کی شوخیٔ رفتار کی علامت ہیں

آئمۂ طاہرینؑ کا اندازِ رہنمائی

آئمۂ اہل بیت علیہم السّلام نے جو پیغمبر اسلام کے حقیقی جانشین تھے۔ وجود خالق کو ذہن نشین کرنے میں اپنے مخاطب کے معیار فہم کے مطابق طرح طرح کے انداز اختیار کیے۔ کبھی تمثیلیاتی انداز سے ابوشاکر

دیصانی کے جواب میں جب اس نے خالق کے ثبوت پر دلیل معلوم کرنا چاہی تو امام جعفر صادقؑ نے فرمایا :-

"میرے نفس کو خود اپنے وجود کا باعث اگر مانا جائے تو وہ دو صورتوں سے خالی نہیں یا وہ اپنے وجود کا باعث ہوگا جبکہ وہ موجود تھا ۔ یا وہ اس کے وجود کا باعث ہوا ۔ جبکہ وہ معدوم تھا ۔ اگر وہ اپنے وجود کا باعث ہوا جبکہ وہ موجود تھا تو پھر اسے وجود بخشنے کی ضرورت کیا تھی (تحصیل حاصل لازم آتی ہے) اور اگر وہ اس کے وجود کا باعث ہوا جب کہ وہ معدوم تھا ۔ تو یہ کیونکر ہوسکتا ہے ۔ جبکہ معدوم کسی شے کو موجود نہیں بنا سکتا لہٰذا تیسری صورت ثابت ہوئی کہ اپنے وجود کا باعث یہ خود نہیں ہے ۔ بلکہ کوئی اور اس کا خالق ہے ۔ اور وہی خالق اللہ ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے"

کیسی بالکل سادہ الفاظ میں عوامی معیار فہم کے مطابق اسے طرح سمجھایا :-

"راستے میں اونٹ کی مینگنیاں نظر آئیں تو معلوم ہوگا کہ ادھر سے اونٹ گزرا ہے ۔ اور گدھے کی مینگنیاں ہوں تو معلوم ہوگا کہ گدھا گزرا ہے ۔ اور پیروں کا نشان دیکھ کر رہرو کا پتہ چلے گا ۔ پھر یہ بڑا آسمان اس لطافت کے ساتھ اور یہ زمین اس جسامت کے ساتھ کیونکر باریک بین دانا خبیر خالق کی دلیل نہ ہوں گے؟"

کیسی نفسیات کے ذریعہ سے ثابت کیا جب ایک شخص نے

پوچھا۔ آپ نے اپنے خدا کو کیونکر پہچانا؟ فرمایا :۔

"میں نے اپنے خدا کو پہچانا۔ مضبوط ارادوں کے ٹوٹ جانے سے۔ اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے۔ جب میں کوئی ارادہ کرتا ہوں۔ تو اکثر وہ میرے ارادہ کو شکست دے دیتا ہے۔ اور ہمت باندھتا ہوں۔ اور وہ ہمت کو پست کر دیتا ہے"

ایک دفعہ ایک دہریہ سے گفتگو نے طول کھینچا۔ تو امام نے اس کو زندگی کا ایسا ہنگام یاد دلایا۔ جب کشتی پر سوار ہوں۔ طوفان آ جائے۔ کشتی بالکل منجدھار میں ہو۔ نہ کوئی ساحل قریب ہو نہ کوئی درخت سامنے نظر آئے۔ بلکہ کشتی شکستہ بھی ہو چکی ہو۔ اور تختے الگ الگ ہو گئے ہوں یہ انسان ایک تختے پر بہتا جا رہا ہو۔ آپ نے فرمایا: کیا ایسا وقت کبھی پیش آیا۔ تو دل میں کوئی آسرا محسوس ہوتا تھا کہ اب بھی کوئی بچا سکتا ہے" اس نے کہا "بیشک مجھے تو آسرا ضرور تھا۔" فرمایا "ایسے وقت جس کا آسرا ہوتا ہے وہی خدا ہے"

جبر و اختیار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دھوکا کھایا ہے لوگوں نے اور کہہ دیا ہے کہ بندے اپنے اچھے برے تمام افعال میں مجبور ہیں اور کوئی کام ان کے ذاتی اختیار سے نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذمہ داری خدا کی طرف عائد ہے۔

دلیل یہ ہے کہ انسان جو کام بھی کرتا ہے اس کا علم خداوند عالم کو ازل سے ہے اور خدا کا علم ہو چکنے کے بعد اس کے خلاف ممکن نہیں لہٰذا انسان اپنے افعال میں خود مختار نہیں۔ مثلاً زید کہ جس نے جمعہ کے دن شراب پی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کو اس کا علم تھا یا نہیں؟ جواب یقیناً اثبات میں ملے گا۔ اچھا علم ہو چکنے کے بعد ہو سکتا ہے کہ زید شراب نہ پیے؟ ہرگز نہیں۔ ورنہ علم باری کا غلط ہونا لازم آئے گا۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ زید کے لیے ناممکن تھا کہ وہ شراب نہ پیے بلکہ شراب پینا اس کے لیے ضروری تھا اور یہی معنی جبر کے ہیں۔

یہ دلیل ہے جس پر عقیدۂ جبر کی بنیاد قرار پائی ہے اور ظاہری نظر میں بہت مضبوط ہے۔ لیکن جب غائر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔

ضرورت ہے اس بات کے سمجھنے کی کہ علم اور معلوم میں تعلق کی

نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کیا علم سبب ہوتا ہے وجود معلوم کا یا وجود معلوم باعث ہوتا ہے تحقق علم کا۔ اگر علم وجود معلوم کا سبب ہے یعنی چونکہ خدا کو علم تھا اس بات کا کہ شراب پیئے گا اس لیے اس نے شراب پی تو یقیناً جبر ہے، لیکن اگر معلوم باعث ہوتا ہے علم کا یعنی چونکہ زید شراب پینے والا تھا اس لیے خدا کو علم تھا تو اس میں جبر کا پتہ بھی نہیں ہے۔ صورت واقعہ یوں ہی ہے یعنی ہمیشہ تحقق معلوم باعث ہوتا ہے علم کا، نہ یہ کہ علم معلوم کے وجود کا سبب ہے۔

مثال کے طور پر دیکھنا چاہیے کہ رمال، جفار، منجم وغیرہ زائچہ کھینچتا ہے اور اس سے انکشاف ہوتا ہے کہ زید فلاں تاریخ یہ کام کرے گا۔ اب اگر وہ شخص اپنی نجوم میں ناقص ہے اور اس کا علم نامکمل ہے اور اس لیے اس کا انکشاف مطابق واقع نہ ہوا تو اس سے تو کوئی بحث نہیں لیکن اگر اس کا علم مکمل ہے تو وہ ضرور ہی مطابق واقع ہوگا۔ اور وہ شخص تاریخ معین پر اس کام کو انجام دے گا۔ تو کیا رمال کے علم نے اس شخص کو مجبور کر دیا؟ چونکہ وہ شخص باختیار خود اس کام کو کرنے والا تھا اس لیے رمال کو علم ہوا۔ یقیناً ایسا ہی ہے اگر رمال زائچہ نہ کھینچتا اور اس کو علم نہ ہوتا تو بھی یہ شخص اس کام کو کرتا۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ اس نے زائچہ کھینچا اور اس کو علم بھی اس ہونے والے واقعہ کا ہو گیا۔ اس سے زیادہ واضح مثال جس کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے یہ ہے کہ ایک شخص کوئی کام کر رہا ہے اور آپ اس کو دیکھ رہے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس وقت محض

ہے کہ وہ شخص اس کام کو نہ کر رہا ہو؟ آپ فرمائیں گے ہرگز نہیں ممکن اس لیے کہ میں خود دیکھ رہا ہوں۔ پھر کیا آپ کے دیکھنے نے اس کو اس فعل پر مجبور کر دیا؟ نہیں ایسا بھی نہیں بلکہ وہ باختیار خود اسس کام کو کر رہا تھا۔ مگر چونکہ اتفاق سے آپ کے سامنے تھا اس لیے آپ دیکھ بھی رہے ہیں۔

بس یہی نوعیت سمجھنا چاہیے علم باری تعالٰی کی، فرق اتنا ہے کہ ہمارا ادراک ناقص ہے۔ لہٰذا ہم اسی چیز کو دیکھ سکتے ہیں جو ہمارے سامنے ہو لیکن جب پردہ پڑا ہو، دیوار سامنے ہو، حد سے زیادہ بعد پایا جاتا ہو تو ہماری نظر کام نہیں کرتی اور ادراک ہمارا ساتھ چھوڑ دیتا ہے لیکن خداوند عالم کا علم ان موانع و عوائق سے علیحدہ ہے۔ اس کے سامنے کوئی پردہ نہیں اور کوئی حجاب حاجب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

اس کے علاوہ ہم چونکہ زمانہ کے اندر ہیں اور زمانہ سیال ہے جس کے اجزاء اجتماعی صورت سے وجود نہیں رکھتے بلکہ ہر جزو اس کا دوسرے جزو کی رفتار کے بعد آتا ہے اور جب تک یہ جزو جا نہیں لیتا بعد والے جزو کا موقع نہیں ہوتا اس لیے جو حوادث اس میں ہوتے ہیں وہ بھی گذشتنی و گذشتی ہیں اور مختلف اوقات میں ہونے والے حوادث ایک وقت موجود نہیں اور اس لیے مشاہدہ ان ہی حوادث کا ممکن ہوتا ہے جو باعتبار زمانہ اس مشاہدہ کے متقارن ہیں اور اسی وجہ سے اس وقت آپ کل ہو چکنے والے اور آئندہ ہونے والے واقعات کا مشاہدہ نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن خداوند عالم کو

جو زمان و زمانیت سے بالاتر ہے اور ان پابندیوں سے علیحدہ - اس کے لیے زمانہ کا تفرقہ کوئی تفرقہ نہیں ہے۔

جس طرح ایک وسیع میدان میرے سامنے ہو جس میں مختلف مقامات پر جو ایک دوسرے سے تھوڑا تھوڑا سا فاصلہ رکھتے ہوں مختلف اشخاص مختلف کاموں میں مصروف ہوں وہ باعتبار وجود خارجی کے ایک دوسرے سے تفرقہ رکھتے اور جدا جدا ہیں لیکن چونکہ نظر میری ان سب کو محیط ہے اس لیے ان مختلف لحاظ پر موجود ہونے والے اشیاء کا وہ ایک ساتھ ادراک کرے گی اور باوجود اپنے ذاتی تفاوت و اختلاف مراتب کے مشاہدہ میں وہ وقت واحد ایک ساتھ آئیں گے ہیں اسی صورت پر سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک طویل سلسلہ حوادث عالم تکوین کا جس کی ابتدا ابتدائے خلقت عالم سے اور انتہا انتہائے عمر زمانہ تک ہے پورا جناب باری کے لیے جو ان زمان و زمانیات سے آگے ہے ازل سے پیش نظر ہے۔

اس سلسلہ میں ہونے والے حوادث اگرچہ باعتبار وجود خارجی کے آپس میں فاصلہ رکھتے ہیں یعنی ایک آج ہونے والا ہے اور ایک کل اور ایک سو برس قبل اور ایک ہزار برس بعد لیکن علم باری چونکہ اس تمام سلسلہ کو محیط ہے اس لیے یہ تمام حوادث باوجود اپنے تفرقہ اور جدائی کے اس کے علم میں ایک ساتھ ہیں اور وہ ان سب کو برابر سے اپنی نظر قدرت سے دیکھ رہا ہے - پھر جس طرح کہ کسی شخص کو کام کرتے دیکھنا ہمارا اس کے مجبور بنا دینے کا باعث نہیں ہے - یعنی ایسا نہیں ہے کہ چونکہ ہم

دیکھ رہے تھے اس لیے وہ اس کام کو کر رہا ہے بلکہ چونکہ وہ
کر رہا ہے اس لیے ہم دیکھ رہے ہیں۔ تو اسی صورت پر خداوند
عالم کو اطلاع حاصل ہونا زید کے ہاتھوں ہونے والے کام کی
اس کام کے ہونے کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ اس کے علم کی
بنیاد خود اس کام کا زید سے صادر ہونا ہے۔ یعنی وہ
کام کرنے والا تھا اس لیے خدا کو اس کا علم تھا۔

بے شک علم ہو چکنے کے بعد ناممکن ہے کہ وہ فعل نہ
ہو۔ لیکن یہ عدم امکان فرض وقوع کی بنا پر ہے۔ ہر چیز
جس کے وقوع کو فرض کر لیا جائے اس کا عدم ممتنع ہے
کیونکہ اجتماع نقیضین محال ہے۔ مثلاً میں عرض کروں کہ فرض
کیجیے کہ میں آپ کے یہاں حاضر ہی ہو گیا ہوں تو کیا اس فرض کی بنا
پر ہو سکتا ہے کہ میں حاضر نہ ہوا ہوں جواب نفی میں ہی ملے گا۔ یعنی
اس فرض کی بنا پر ناممکن ہے کہ ایسا نہ ہوا ہو۔ علم وقوع کے بعد اس
کے خلاف ممکن نہ ہونا اسی نوعیت کا ہے اس لیے کہ علم خدا کو
اس کے وقوع کا جب ہی ہوگا کہ جب وہ فعل حقیقتاً اپنے وقت پر
واقع ہو اور جب کہ فرض یہ ہے کہ وہ فعل اپنے وقت پر واقع ہوگا
تو اب ناممکن ہے کہ واقع نہ ہو ورنہ خلف لازم آئے گا۔ ہاں اگر
وہ اپنے وقت پر واقع نہ ہو تو خدا کو علم ہی اس کے وقوع کا نہ ہوگا
بلکہ عدم وقوع کا علم ہوگا۔ لہٰذا عدم امکان وقوع بعد علم بوقوع
فرض وقوع کی بنا پر ہے نہ یہ کہ علم اس فعل کے وقوع کی
علت تامہ ہے اس لیے اس کے خلاف ناممکن ہو گیا ہے۔

معلوم ہوا کہ علم کی بنیاد پر جبر کے عقیدہ کو ثابت کرنا بالکل بے بنیاد

ہے۔ دوسری دلیل جبر کی یہ پیش کی جاتی ہے کہ وہ فعل مثلاً نماز یا
روزہ وغیرہ جو کسی انسان سے صادر ہوتا تو پوچھا جاتا ہے کہ خدا اس کو
چاہتا ہے یا نہ؟ جواب یقیناً اثبات میں ہوگا۔ کہ بیشک خدا چاہتا
ہے۔ اچھا جس بات کو خدا چاہے اس کے خلاف ہو سکتا ہے؟ جواب
نفی ہی میں ملے گا کہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ پھر انسان اپنے
فعل میں مجبور ہے یعنی جو کچھ وہ کرتا ہے اس کے خلاف اس سے ناممکن ہے
جواب اس کا یہ ہے کہ اکثر کسی لفظ کے دو معنی میں غلط یا کسی مفہوم کی دو مختلف
قسموں کے درمیان تفرقہ نہ کرنے کے سبب انسان دھوکے میں مبتلا ہو جاتا ہے
مثلاً ایک گھوڑے کی تصویر ہے جو دیوار پر بنی ہوئی ہو اور ایک گھوڑا وہ ہے جو
سچ مچ زمین پر چلتے پھرتے نظر آتے ہیں ان دونوں کے اختلاف سے قطع نظر کرتے ہوئے
دو شخصوں میں اختلاف ہوتا ہے ایک کہتا ہے کہ گھوڑے پر سوار ہونا ناممکن ہے
مقصود وہ گھوڑا ہے جو دیوار پر بنا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ میں سیکڑوں مرتبہ گھوڑے
پر سوار ہوا مقصود وہ گھوڑا ہے جو چلتا پھرتا ہے جاندار حیوان صاہل ہے۔ بات دونوں
ٹھیک کہتے ہیں لیکن ایک جگہ گھوڑے کے معنی ایک اور دوسرے میں
گھوڑے کے معنی دوسرے ہیں اگر معنی کھل جائیں تو دونوں باتوں میں کوئی
اختلاف نہ رہے لیکن معنی کے اختلاف کو نہ سمجھتے ہوئے الجھن پیدا ہوتی
ہے یا یوں سمجھیے کہ گھوڑے کی دو قسمیں ہیں ایک اسپ صوری اور ایک
اسپ حقیقی۔ ان دونوں کے احکام میں خلط کا نتیجہ غلط بحث کی صورت میں ظاہر ہوا۔
بالکل یوں ہی سمجھنا چاہیے کہ انسان جو نماز پڑھتا ہے اور روزہ رکھتا ہے
تو یہ ایسی بات ہے جسکو خدا چاہتا ہے ٹھیک ہے اور یہ بھی کہ جو خدا چاہے
اس کے خلاف ہو نہیں سکتا یہ بھی ٹھیک ہے لیکن چاہنے کے معنی دونوں جگہ مختلف
ہیں۔ بات یہ ہے کہ ارادہ کی دو قسمیں ہیں۔ ارادہ تکوینیہ اور ارادہ تشریعیہ

وہ کہ جس کے خلاف ممکن نہیں ارادہ تکوینیہ ہے اور وہ کہ جو افعال عباد سے
متعلق ہوتا ہے ارادہ تشریعیہ ہے اور اسکی وجہ سے فعل کا صدور
لازمی نہیں ہوتا۔ عام فہم الفاظ میں عرض کیا جاتا ہے کہ چاہنا دو قسم کا
ہوتا ہے اس کام کا جو خود خداوند عالم کے کرنے کا ہے اللہ بھی چاہتا ہوتا ہے
ایسے کام کا جو دوسرے کے ہاتھ سے اسکے ارادہ و اختیار سے ہونا منظور ہے۔
اگر چاہنے کا تعلق ایسے کام سے ہے جو خود اسکے کرنے کا ہے تو وہ کام ہونا
ضروری ہے اس لیے کہ کام خود اسی کا ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ اور اس کی
قوت قاہرہ کے مقابلہ میں کوئی مانع بھی نہیں ہو سکتا لیکن اگر وہ چاہتا ہے دوسرے
کے کام کو اسکے ارادہ و اختیار سے تو اس چاہنے کا لازمی نتیجہ صرف اتنا ہے
کہ وہ صرف حکم دے اور پوری تاکید سے اسکو اس فعل کی بجا آوری پر آمادہ
کرے۔ اگر وہ نہ کرے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ فعل زبردستی اس سے
صادر کرایا جائے اس لیے کہ بجبر اس سے فعل صادر کرایا گیا تو درحقیقت جس
سے مشیت کا تعلق تھا وہ حاصل نہ ہوا یعنی جو چاہا تھا وہ نہ ہوا۔ کیونکہ چاہا تو
یہ تھا کہ فعل اس دوسرے شخص سے ارادہ و اختیار کے ساتھ ہو اور ہوا یہ کہ
فعل خداوند عالم کے جبر و قہر سے اس سے بے اختیار صادر ہوا یہ بھی
تخلف مراد کا ارادہ سے اور واقعہ کی مخالفت اسکی مشیت سے ہے جو کسی طرح
صحیح نہیں ہے لہذا جو دلیل عقیدہ جبر کے اثبات میں پیش کی گئی تھی یعنی یہ
کہ تخلف مراد کا ارادہ سے محال ہے لہذا اس فعل کا ہونا ضروری ہے وہ ہی
عقیدہ جبر کا ابطال کرتی ہے اس لیے کہ ارادہ کا تعلق یوں ہی ہوتا ہے کہ
فعل انسان سے اسی کے ارادہ و اختیار سے صادر ہو لہذا اگر ارادہ و
اختیار سے صادر نہ ہو تو تخلف مراد کا ارادہ سے لازم آئیگا جو ناممکن ہے
یہ تھا عقیدۂ جبر کے ابطال کا ابطال جو بحمد اللہ کافی توضیح سے عرض کیا گیا۔ اب

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ خرابیاں عقیدہ جبر کی عرض کر دی جائیں۔ جبر کے عقیدہ کی پہلی خرابی یہ ہے کہ جزا و سزا باطل ہو جاتی ہے اور روز قیامت کا وجود بیکار۔ اس لیے کہ کسی اچھے کام کی جزا اور برے کام کی سزا کا استحقاق عقل کے نزدیک اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ فعل کرنے والے سے باختیار صادر ہو۔ اگر کوئی باپ اپنے بچے کے ہاتھ میں قلم دیکر خود اسکا ہاتھ مضبوط پکڑ کے ایک نقش کاغذ پر بنا دے اور پھر اسکا ہاتھ پکڑ کر ایک قیمتی کتاب کو پھاڑ ڈالے تو یہ امر کسی طرح جائز نہ ہوگا کہ وہ پھر بچہ کو اس نقش کے بنانے کا انعام اور اس کتاب کے پھاڑ ڈالنے کی سزا دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو یقیناً احمق بے وقوف اور ظالم بے انصاف سمجھا جائے گا۔ اس لیے کہ اس اچھے برے کام کی ذمہ داری اس بچہ کی طرف عائد نہیں بلکہ خود اسکے باپ کے ذمہ ہے بس اسی صورت پر اگر خدا بندوں سے بجبر اچھے برے افعال سب کراتا ہے تو اچھے افعال پر جزا اور برے افعال پر سزا دینے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ دونوں قسم کے کام اس نے خود کرائے ہیں جس میں انسان کے قدرت و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اب چاہیے ان لوگوں سے کہ نکال دیں قرآن سے ان آیات کو جن میں وعدہ وعید اور حشر و نشر ثواب و عقاب کے تذکرے ہیں اور پھاڑ ڈالیں ان احادیث کے کتب کو جن میں یہ حقائق اخبار ہیں اسکے بعد وہ جبر کے قول کو زبان سے نکالنے کا حق رکھیں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء و رسل کا بھیجنا اور اوامر و نواہی کا نافذ کرنا شریعتوں کا جاری کرنا کتب کا نازل کرنا سب بیکار قرار پائیگا۔ اسلیے کہ جب اچھے برے کام سب خدا خود ہی کراتا ہے تو انبیاء و رسل کی زبانی احکام شریعت کے تحت میں آسمانی کتب کے ذریعہ اوامر نواہی نافذ کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ ایسا کرو ایسا نہ کرو۔ اس لیے کہ کرنے نہ کرنے کا تعلق تو خود اسی سے ہے جس کام کو چاہتا انسان سے جبراً کرا دیتا جس کو نہ چاہتا

ترک کرا دیا۔ پھر ان سب انبیاء و رسل کی تبلیغ اور عظیم الشان عالم تشریع کی بنیاد لغو، عمل بے فائدہ اور لاحاصل نہیں قرار دیا ہے۔ تبلیغ احکام اور ہدایت خلق کی یہ تمام اہتمامات خود اس کی دلیل ہیں کہ اچھے برے کاموں کا کرنا خود بندوں سے تعلق رکھتا ہے اور خداوند عالم کا کام صرف ہدایت کرنا ہے۔ قانون بنانا، اسباب و آلات مہیا کرنا۔ وہ تعلیمات بھیجتا ہے اور راہنمائی کرتا ہے لیکن انسان اپنی قدرت و اختیار سے کبھی ان کی تعلیمات پر عمل کرتا اور کبھی ان کی مخالفت کرتا ہے جس پر اس کو جزا یا سزا کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر وجدان پر نظر کی جائے تو وہ بھی عقیدۂ جبر کے خلاف ہے۔ کیونکہ انسان بداہۃً اپنے بدن کے جسمانی حرکات میں دو قسم کے افعال پاتا ہے۔ ایک وہ کہ جو بلا اختیار صادر ہوتے ہیں جیسے مرتعش کے ہاتھ کی حرکت اور بعض وہ ہیں جو باختیار صادر ہوتے ہیں جیسے کاتب کی گردش قلم یہ ایسی بدیہی بات ہے جس کو معمولی سے معمولی عقل کے افراد حتیٰ کہ بچے تک سمجھتے ہیں۔ تین چار برس کی عمر کا کمسن بچہ جو بات چیت کر لیتا ہے اور پیروں چلتا ہے ایک دفعہ اس کا قدم پھسلتا ہے اور گر پڑتا ہے۔ دوسرے موقع پر وہ شرارت سے ایک بلند مقام سے جست کرتا ہے اور زمین پر گرتا ہے کہ جس سے چوٹ لگتی ہے۔ پہلے مقام پر باپ خفا ہو تو وہ یہی کہتا ہے کہ کیا کروں میرا پاؤں پھسل گیا، میں جان کے تھوڑی گرا۔ دوسرے موقع پر جب خفا ہو تو سر جھکا کے کہے گا کہ قصور ہوا۔ اب ایسا نہ کروں گا۔ پہلے موقع پر کیوں نہیں کہتا کہ قصور ہوا اب ایسا نہ کروں گا اس لیے کہ جانتا ہے وہ میرے بس کی بات نہیں۔ کہنے کو کہہ دوں کہ نہیں کروں گا لیکن اگر اس کے بعد بھی پیر پھسل جائے تو کیا کروں گا۔ اور دوسرے موقع پر وہ جانتا ہے کہ شرارت میری تھی اور میرے ارادہ و اختیار سے تھی اس لیے آئندہ کے متعلق

ایسا نہ کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

یہ دلیل وجدانی ایسی ہے جس کے مقابل بڑی سے بڑی دلیل برہانی کوئی وقعت نہیں رکھتی جب دلیل عقلی بداہت وجدان سے تصادم کرنے لگے تو ماننا پڑیگا کہ دلیل مغالطہ کی حیثیت رکھتی ہے جس کی حقیقت ظاہر نہیں ہے۔

عقیدۂ جبر کی ان ہی خرابیوں پر نظر کرتے ہوئے معتزلہ ایسے متوحش ہوئے کہ انہوں نے ایک مرتبہ تفویض کے نقطہ پر جا کر دم لیا اور وہ قائل ہو گئے کہ انسان بالکل مطلق العنان ہے اور اس سے جو صادر ہو اپنے افعال میں خدا کو کوئی دخل ہی نہیں ہے خدا کا جو کچھ کام ہے وہ ایسے امور سے متعلق ہے جو انسان کے افعال میں سے نہیں جیسے جلانا، موت دینا، پانی برسانا، آندھیاں لانا وغیرہ لیکن انسان کے افعال میں اس کا کوئی دخل نہیں۔ لیکن غور کرنے پر یہ خیال بھی نقطۂ حقیقت سے دور معلوم ہوتا ہے جبر و تفویض دونوں ہی افراط و تفریط کے دو نقطے ہیں اور واقعیت ان دونوں کے وسط میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر چیز جو ہوا کرتی ہے اس کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے مقتضی، شرط، اور عدم مانع جب وہ تینوں مجتمع ہو جائیں تو وہ امر ہوتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی ایک مفقود ہو تو وہ امر نہیں ہوتا۔
مقتضی وہ ہے جو درحقیقت کسی فعل کا اصلی سبب اور باعث ہوتا ہے جس کی طرف وہ فعل منسوب ہوتا ہے جیسے آگ اس کا کام ہے جلانا۔ شرط وہ ہے جس پر مقتضی کا اپنے اثر میں کامیاب ہونا موقوف ہے۔ مانع وہ قوت ہے جو مقتضی کو کامیاب ہونے سے روک دے۔ انسان کے افعال اختیاریہ میں مقتضی تو خود اس کا ارادہ و اختیار ہے اور اسی لیے جو کام صادر ہوتا ہے وہ خود اسکی طرف منسوب ہے لیکن شرائط و موانع کے سلسلوں کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے یعنی انسان جب کسی فعل کا ارادہ کرتا ہے تو کامیابی اس کو اپنے ارادہ میں جب ہی ہو سکتی ہے کہ جب خدا کی قوت قاہرہ سے تصادم نہ ہو اس لیے اکثر مضبوط سے مضبوط ارادے

ولوں کے پیدا ہوجانے کے سبب ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جس سے ارباب معرفت نے خدا کی معرفت حاصل کی ہے۔

پوچھا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کیوں کر پہچانا۔ امامؑ نے فرمایا عرفت ربی بفسخ العزائم ونقض الھمم اذا عزمت فسخ عزمی واذا ھممت فنقض ھمی۔ میں نے اپنے خدا کو پہچانا مضبوط ارادوں کے ٹوٹ جانے اور ہمتوں کے پست ہوجانے سے۔ جب میں کوئی ارادہ کرتا ہوں تو وہ میرے ارادے کو توڑ دیتا ہے اور ہمت کرتا ہوں وہ میری ہمت کو پست کر دیتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ میری قدرت و قوت سے مافوق قوت قاہرہ ہے جس کے مقابل آکر میری قوتیں عاجز اور درماندہ ہو کر ناکام رہ جاتی ہیں۔

اسی بنا پر ہر آیندہ کام کے متعلق انشاء اللہ کہنے کی ہدایت ہوئی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ میں تو اس کام کا ارادہ رکھتا ہوں اور پوری کوشش اسکے لئے کروں گا۔ بشرطیکہ خدا اپنی جانب سے کوئی مانع پیدا نہ کر دے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انشاء اللہ کا صرف اکثر غلط محل پر ہوتا ہے۔ درحقیقت انشاء اللہ کہنے کا موقع یہ ہے کہ انسان اپنے طور سے اس فعل کے کرنے پر عازم ہو اور ارادہ رکھتا ہو اس وقت وعدہ کرنا چاہے تو بے شک اس فعل کے وجود کو خدا کی مشیت پر محول کرنا درست ہے لیکن اگر انسان خود ہی اس فعل کے کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس فعل کے وجود کو خدا کی مشیت پر محول کرنا اور اپنی ذمہ داری خدا پر عائد کرنا بالکل بے موقع ہے۔

یقیناً انسان کا اپنے کسی مقصد میں کامیاب ہونا اسی وقت ممکن ہے جب خدا کی قوت وطاقت سے تصادم نہ ہو اور توفیق کہتے ہیں کہ انسان کو خدا سے ہر امر خیر میں طالب رہنا چاہیے اس کے معنی یہی ہیں کہ انسان جس امر خیر کا ارادہ رکھتا ہو خداوند عالم کی جانب سے

اس میں موانع پیدا نہ ہوں اور اسباب مہیا ہو جائیں۔

خلاصہ کلام شخص ایسے ہیں کہ جن کو عتبات عالیات کی زیارت کا انتہائی شوق ہے اور وہ اس کے لیے بے چین اور مضطرب ہیں۔ لیکن ایسے اسباب نہیں مہیا ہوتے کہ وہ اپنے مقصد کو حاصل کریں۔ بلکہ بہت سے باقتدار افراد کی نظیریں پائی جاتی ہیں جنہوں نے تمام سامان سفر درست کر لیا اور ظاہری طور پر اسباب مہیا ہو گئے لیکن کچھ ایسے موانع پیدا ہوئے کہ وہ اس شرف سے مشرف نہ ہوئے۔ اس کے برخلاف بہت سے لوگ ایسے ہیں جنہیں کسی زمانہ میں خاص طور پر زیارت کا اشتیاق بلکہ خیال بھی نہیں، نہ اسباب سفر مہیا ہیں لیکن دفعتہً ایک قریب ترین عزیز یا دوست جو ان کے ہم سفر ہونے کا متمنی ہے ان سے خواہش کرتا ہے کہ تم میرے ساتھ چلو میں تمہارے مصارف کا بھی متکفل ہوں۔ یہ عذر کرتا ہے کہ میرے متعلقین کے لیے کیا ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ میں ان کے مصارف کا بھی ذمہ دار ہوں یہ ہے توفیق الٰہی جو انسان کے شامل حال ہوتی ہے اور جس کی انسان کو اعمال و عبادات کی بجا آوری میں ہر وقت ضرورت ہے۔

تقیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علیٰ سید الانبیاء والمرسلین
محمد ن المصطفیٰ وآلہ الطیبین الطاہرین ۔

آیت لا یتخذ المومنون الکافرین اولیاء من دون المومنین
ومن یفعل ذالک فلیس من اللہ فی شیء الا ان
تتقوا منھم تقٰۃ ویحذرکم اللہ نفسہ والیہ المصیر ۔

تمہید ۔ "تقیہ" کا موضوع اکثر غلط فہمیوں کا مرکز رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ افراد جنہیں اس کی حقیقت سے واقف ہونا چاہیے وہ بھی اکثر اوقات اس لفظ کے استعمال میں غلطی کر جاتے ہیں۔ اور "تقیہ" کے لفظ کو جھوٹ کے مترادف کی حیثیت سے استعمال کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے اس پر بحث کرنا ایک علمی و مذہبی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے علاوہ سیرت معصومینؑ کے سمجھنے میں بھی اس کے مختلف پہلوؤں کا نظر کرنا نہایت ضروری ہے۔ بالخصوص حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے مجاہدۂ کربلا کی ضرورت و اہمیت کے سمجھنے میں یہ ایک اصلی سوال زیر غور آتا ہے کہ اگر تقیہ نظام حیات میں کوئی ضروری عنصر ہے تو حضرت سید الشہداء نے تقیہ سے کام لے کر بیعت یزید کا اقرار کیوں نہ فرمایا۔ اس ذیل میں اس تضاد کا دور کرنا ضروری ہو گا جس کا آپ کی سیرت اور دیگر ائمہ معصومین

علیہم السلام کی سیرت میں نظر آتا ہے جنھوں نے اپنے اپنے دور میں تقیہ کی عملی پابندی کا مظاہرہ فرمایا اور اس بارے میں اپنے متبعین کو بھی ہدایتیں فرمائیں۔

پھر چونکہ تقیہ جن حالات و اسباب سے متعلق ہوتا ہے وہ اکثر و بیشتر ہر دور ہی میں پیش آیا کرتے ہیں۔ اس لیے اسے وہ حیثیت حاصل نہیں ہے جو خالص فلسفی یا تاریخی مسائل کو ہوتی ہے جن کا ماحصل صرف ایک عقیدے کا درجہ ہوتا ہے اور ان کا عملی زندگی پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ عملی حیثیت سے ایک زندہ مسئلہ ہے جس میں ہمیں صحیح طریقۂ کار کا علم ہونا اکثر اوقات ہماری رہنمائی کا باعث ہو سکتا ہے۔

معنیٔ آیت

آیت جسے سرنامۂ بحث قرار دیا گیا ہے سورۂ آل عمران کی آیت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اہلِ حق کو نہیں چاہیے کہ وہ اہلِ حق کو چھوڑ کر پرستارانِ باطل سے تعلقاتِ محبت و موافقت قائم کریں۔ اور جو ایسا کرے گا اسے اللہ سے اپنے کو بے تعلق سمجھنا چاہیے۔ ہاں مگر یہ کہ تمہیں ان سے اپنا بچاؤ کرنا ہو اور بہرحال تمہیں اللہ اپنے غضب سے ڈرنے کی دعوت دیتا ہے اور بازگشت تو اسی کی طرف ہے۔

لفظ تقیہ کی تحقیق

تقیہ کی اصطلاح در اصل اسی آیت کے الا ان تتقوا منهم تقاة کے جزو سے قائم ہوئی ہے تقاۃ اور تقیہ کے الفاظ چاہے دیکھنے میں الگ الگ ہوں مگر ان کا مادہ ایک ہی ہے اور وہ وہی ہے جس سے تقویٰ کا لفظ ماخوذ ہے۔ بلکہ سابق زمانہ کے بعض قاریوں نے جن کے اقوال کتب میں موجود ہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ تقاۃ کے بجائے تقیۃ پڑھا ہے یعنی ان کے نزدیک آیت یوں ہے الا ان تتقوا منهم تقیة۔ اس کا ذکر علامہ

بیضاوی وغیرہ مفسرین نے اپنی تفاسیر میں بھی کیا ہے۔

بہر حال وہ لفظ تقٰـة ہو یا تقیة معنی دونوں کے ایک ہی یعنی بچاؤ کا سامان کرنا۔ چنانچہ تقوے کو تقوے بھی اسی معنی سے کہتے ہیں۔ کہ وہ عذاب آخرت یا غضب الٰہی سے بچاؤ کی فکر ہے۔

حکم الٰہی کی تشریح

وہ حکم خداوندی جو آیت قرآنی میں دیا گیا ہے عام فہم انسانی کی سطح سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔

قانون عام یہ ہے کہ اہل حق اہل باطل کو اپنا دوست نہ بنائیں، مگر ایک عملی ہے دوستی اور معاونت جسمانی اور بشری اعتبار سے۔ اور معاشرتی تعلقات اور نظم مملکت کے لحاظ سے جیسے بیماری یا کسی وقت مصیبت میں تیمارداری یا کسی دوسرے کی غمگساری کرنا۔ بھوک میں سیر یا پیاس میں سیراب کرنا گرتے ہوئے کو سنبھال لینا شخصی خدمات اور ذاتی امور انجام دینا۔ یہ تو منع نہیں ہے بلکہ اسلام میں متعدد مقامات پر ایسے حقوق انسانی کا پتہ دیا گیا ہے جو مذہب وملت کی تفریق سے علیحدہ ہیں۔ اس طرح کے خدمات بلا معاوضہ بھی انجام دیئے جاسکتے ہیں اور بہ معاوضہ بھی اور اسی طرح دوستی اور معاشرتی تعلقات قائم کرنے میں کوئی مضر نہیں ہے — مذکورہ آیت قرآنی کا تعلق ان تعلقات وروابط کے ساتھ ہے

دوسری چیز یہ ہے کہ ہم کسی باطل کی پالیسی میں شامل ہوں اور ان کے غلط مقاصد میں ان کے ساتھ اتحاد عمل کریں۔ اور وہ باتیں پیدا کریں جن کے لیے ان کے باطل پرستانہ جذبات متقاضی ہیں۔ یہ وہ اتحاد عمل معاونت اور ولائی ہے۔ جسے قرآن کریم نے منع کیا ہے۔ اب جبکہ یہ صورت ہے تو مستثنیٰ یہی ہوا کہ الا ان تتقوا منهم تقٰـة مگر یہ کہ ان سے بچاؤ کرنا ہو۔

ظاہر ہے کہ استثنا کا مقصد اپنے ماقبل کے حکم کو ماقبل سے الگ کرنا ہوتا ہے۔ اگر ماقبل استثناء ثبوت ہے تو استثناء کے بعد نفی ہوگی اور اگر قبل میں نفی ہے تو اس کے بعد ثبوت ہوگا۔ لہٰذا جبکہ لا یتخذ المؤمنون الکافرین اولیاء کے بعد استثناء وارد ہوا تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ جو چیز لا کے ذکر سے پہلے ممنوع قرار دی گئی تھی اسی کو الا کے بعد والی صورت میں جائز قرار دیا گیا ہے۔

اب یہ وہ منزل ہے جہاں یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ اس صورت میں ضمیر کے خلاف اظہار لازم ہوگا اور اسی کا نام جھوٹ ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جھوٹ بعض اوقات ضروری، مستحسن یا کم از کم جائز ہوتا ہے۔

فرقہ وارانہ اختلاف کا سبب

ظاہر ہے کہ قرآن مسلمانوں کے کسی ایک فرقہ کی کتاب نہیں ہے پھر آخر اس بحث کو مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ حیثیت کیوں حاصل ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک فرقہ جو اکثریت رکھتا ہے۔ اسے شروع سے با اقتدار رہنے کے مواقع حاصل ہوئے۔ لہٰذا اس کے لیے اس قرآنی آیت کے مطابق اپنے بچاؤ کی فکر کا کوئی سوال نہیں تھا۔ اس کے برخلاف دوسرا فرقہ جو اقلیت میں تھا اس کو خطرے درپیش ہوتے تھے، اور اسے اپنے بچاؤ کے سامان کی ضرورت ہوتی تھی۔ لہٰذا ان کے لیے اس قرآنی آیت کی توضیح و تفصیل اپنے نظام زندگی کی تشکیل کے لیے ضروری تھی۔ اور یہی اس طرح کہ اکثر سواد اعظم کی ان چیرہ دستیوں کے منصوبوں کی شکست کا باعث ہو جاتے تھے جن کے ماتحت وہ ان کی آزادی زندگی کا مکمل استیصال کر دینا چاہتے تھے۔ چونکہ اکثریت کے منصوبوں کے شکست کی ذمہ داری اس حکم تقیہ پر تھی، لہٰذا فطری طور پر انھیں اس حکم سے بجائے مخالفت پیدا ہو

گئی اور انھوں نے تقیہ پر عمل کو اقلیت کے لیے سرمایۂ طعن و تشنیع بنا لیا اور مناظروں کے محل پر یہ الزام عائد کرنے لگے کہ شیعوں کے یہاں تو جھوٹ بولنا جائز ہے۔ جبکہ تفسیر قرآن یا فقہ و کلام کے تصانیف میں جہاں تقیہ کا محل ہوتا تھا۔ تقیہ کی مشروعیت ہی نہیں بلکہ بعض اوقات وجوب کی تصریح بھی کر دی جاتی رہی جو کسی ایک فرقہ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ علمائے اہل سنت بھی اس سے متفق ہیں اور درحقیقت نص قرآنی کے بعد مسلمانوں کے درمیان اس مسئلہ میں کسی اختلاف و افتراق کا وجود ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔

حکم تقیہ کی بنیاد

خطرہ سے بچنے کے لیے بعض اوقات وہ باتیں جائز ہو سکتی ہیں جو بغیر اس کے جائز نہیں۔

اس حکم کی سب سے بڑی بنیاد اس پر ہے کہ انسانی جان اور اس دنیاوی زندگی کی کوئی قدر و قیمت ہے یا نہیں۔ اگر انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے اور یہ دنیاوی زندگی بالکل بے کار چیز ہے تو حفاظت جان کی خاطر تقیہ کا حکم درست نہ ہوگا۔ لیکن اس صورت میں پھر خودکشی کو کوئی جرم یا گناہ کی حیثیت نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایک بے کار شے کا باقی رکھنا اور تلف کر دینا یکساں حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن خودکشی اجماع مسلمین ایک گناہ اور باتفاق عقلاء ایک جرم کی حیثیت یقیناً رکھتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جان کی قدر و قیمت یقینی ہے۔ پھر جب ایسا ہے تو اس کی حفاظت اور عدم حفاظت کے لیے قواعد و ضوابط ہونا چاہئیں۔ کوئی اہم موقع ایسا ہونا چاہیے جہاں جان کا دینا لازم ہو اور بعض مواقع ایسے ہونا چاہئیں۔ جہاں جان کا بچانا لازم یا کم از کم جائز ہو۔ شریعت اسلام میں وہ وقت جہاں جان کے دینے پر تیار ہونا چاہیے موقع جہاد اور وہ وقت جہاں جان کا بچانا لازم یا جائز ہو ایک

تقیہ ہے۔

حسن اور قبح کی بحث

کہا جاتا ہے کہ جھوٹ ایسی بری چیز ہے کہ کبھی جائز نہیں ہو سکتی اور تقیہ ایک قسم کا جھوٹ ہے۔ لہٰذا وہ ہرگز جائز نہیں قرار پا سکتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس بحث کا اصل سرچشمہ سچ اور جھوٹ کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی اصل بنیاد افعال انسانی میں حسن اور قبح کے معیار سے متعلق ہے جس سے اس جماعت کو تو کوئی غرض نہ ہونا چاہیے جو حسن و قبح عقلی کی قائل نہیں ہے۔ ان کے نزدیک حسن اور قبح صرف حکم شریعت پر منحصر ہے اس لیے اگر کسی وقت میں شریعت کی طرف سے سچ کی ممانعت ہو جائے اور جھوٹ کی اجازت ہو تو انہیں اس پر انگشت نما ہونے کا کوئی موقع نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک سچ میں حکم شریعت سے قطع نظر کوئی اچھائی اور جھوٹ میں ممانعت شرعی سے قطع نظر کوئی برائی ہی متصور نہیں لیکن ہم کہ جو حسن و قبح عقلی کے قائل ہیں، ہمیں خود اپنی جگہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

افعال انسانی کے مراتب اور حسن و قبح کی نوعیتیں

یاد رکھنا چاہیے کہ افعال انسانی میں ایک تو ذات فعل ہوتی ہے اور ایک وہ عنوانات ہوتے ہیں جو اس پر مرتب ہوتے ہیں۔ پھر عناوین میں کچھ عناوین اوّلیہ ہوتے ہیں اور کچھ عناوین ثانویہ جو ان پر مرتب ہیں۔ مثلاً ضرب ایک کام ہے۔ اس میں ذات فعل کیا ہے؟ ہاتھ کی جنبش جو مارنے کے وقت ہوتی ہے۔ یہ جنبش بہر صورت ذاتی طور پر ناروا نہیں ہے۔ فرض کیجیے کہ اس قسم کی حرکت ہاتھ کو ہوتی کہ مقابل میں کوئی جسم نہ ہوتا جس پر مار پڑے۔ اس صورت میں

حرکت ویسی ہی مستحق ہے جو ضارب میں ہوتی ہے۔ مگر وہ مضروب نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ ضرب ذاتی فعل نہیں ہے۔ ایک عنوان ہے جو خاص مصداقوں میں اس حرکت پر منطبق ہوتا ہے۔ ایسے ہی دیگر افعال حقیقتاً افعال اختیاریہ ذات صرف چار ہیں۔ جنھیں حکماء نے "اکوان اربعہ" کہا ہے یعنی حرکت سکون، اجتماع اور افتراق۔

ان ہی چاروں میں سے ہر ایک کچھ متعلقات اور کچھ اضافات کے ساتھ انواع و اقسام کے افعال کے عناوین سے معنون ہوتا ہے۔ جیسے قیام قعود، ضرب، اکل، شرب، مشی وغیرہ وغیرہ۔ یہ افعال کے عناوین اولیہ ہوتے ہیں۔ پھر ان عناوین پر عناوین ثانیہ مرتب ہوتے ہیں۔ مثلاً ضرب اس پر ایک دوسرا عنوان مرتب ہوتا ہے اور وہ ہے ظلم۔ یہ عنوان لازم عنوان اول نہیں ہے۔ کیونکہ ضرب بقصد اصلاح یا بصورت علاج وغیرہ بھی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں وہ ظلم کا مصداق نہ ہوگی بلکہ احسان میں داخل ہوگی لیکن اگر کسی یتیم اور دوسرے بے گناہ کو ایذا رسانی کے لیے مارے تو وہ مارنا ظلم ہوگا۔ معلوم ہوا کہ یہ عنوان ثانوی ہے جو بعض صورتوں میں عنوان اول یعنی ضرب پر منطبق ہوتا ہے۔ اسی طرح کبھی اس دوسرے عنوان کے ساتھ ساتھ اور کبھی اس عنوان کے واسطے سے دوسرے عناوین منطبق ہوتے ہیں۔ مثلاً گناہ اور معصیت وغیرہ اس بنا پر کہ خالق اس سے ناراض ہوتا ہے اور اس نے ممانعت فرمائی ہے۔ ہم یہاں تک غور کرتے ہیں کہ کہ جو ذاتی حیثیت سے حسن یا قبح کے ساتھ متصف ہیں اس طرح کہ ان سے حسن یا قبح کسی وقت اور کسی حال میں جدا ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ زیادہ تر ثانوی اور ثالثی عناوین ہیں۔ جیسے احسان و ظلم، اطاعت و معصیت اور نیکی و گناہ یعنی احسان، اطاعت الٰہی اور نیکی بہر حال مستحسن ہی ہیں اور ان میں اشتباہ کی

کوئی گنجائش نہیں۔ نہ کوئی قید لگائی جا سکتی ہے کہ اس حالت میں احسان اچھا ہے اور اس حالت میں برا۔ خاص شکل میں اس صورت میں اچھی ہے اور کسی صورت میں نہیں۔ یہ تفرقہ ناممکن ہے کیونکہ احسان اطاعت الٰہی اور نیکی کے تو مفہوم میں اچھائی داخل ہے۔ لہٰذا یہ صفت حسن سے جدا کیونکر ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ان کے مقابل عناوین یعنی ظلم معصیت الٰہی اور گناہ وغیرہ کسی حال میں مستحسن نہیں ہو سکتے۔ ان کے مفہوم کے اندر قبح داخل ہے۔ اور یہ کبھی حسن سے تبدیل نہیں ہو سکتا لہٰذا ان کے قبح میں استثناء یا قید کی گنجائش نہیں۔ ان کے بالمقابل پہلی چیز یعنی ذات فعل کبھی بھی حسن یا قبح سے متصف نہیں ہے۔

کوئی حرکت اور کوئی سکون ایسا نہیں جس کے تصور کے ساتھ ہی ہم اسے مستحسن یا غیر مستحسن کہہ سکیں۔ لیکن وہ درمیانی درجہ یعنی عناوین اولیہ ان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ بعض خصوصیات کے ساتھ مستحسن ہو جاتے ہیں اور بعض خصوصیات کے ساتھ غیر مستحسن یعنی ان میں حسن اور قبح دونوں کی صلاحیت ہوتی ہے مثلاً ضرب یعنی مارنا۔ یہ جب بعنوان ظلم ہو تو قبیح ہوگا اور جب بعنوان تادیب وغیرہ ہو تو مستحسن ہوگا۔ اب دیکھئے کہ صدق اور کذب، یہ ان تینوں درجوں میں سے کس درجہ کی چیز ہے۔ یہ ذات فعل تو نہیں ہے کیونکہ ذات فعل زبان کی حرکت ہے۔ وہ حرکت جب بصورت کلام ہو اور کلام بھی از قسم خبر تو اس میں صدق اور کذب کے عناوین سے اتصاف ہوتا ہے۔ پھر یہ صدق اور کذب کبھی دوسرے عناوین سے متصف ہوتا ہے جیسے اصلاح یا فساد۔ اب جبکہ صدق اور کذب کی حیثیت درمیانی درجہ کے عناوین کی سی ہے اور ان پر عناوین ثانویہ منطبق ہو سکنے کا امکان ہے جس میں حسن اور قبح ذاتی پیدا کرتا ہے جیسے اصلاح۔ یہ ایک ایسا عنوان ہے جس میں سوائے حسن کے قبح کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح فساد

جس میں سوائے قبح کے حسن متصور ہی نہیں ہے تو اب صدق اور کذب کو یا تو
ایسا ماننا پڑے گا کہ قطع نظر ان عناوین کے جو ان پر مرتب ہیں ان میں کوئی
پہلو حسن یا قبح کا ہو گا نہ اور یا زیادہ سے زیادہ ایسا مانا جا سکتا ہے اور
یہی درست کہا ہے کہ صدق میں بجائے خود تقاضا حسن کا ہے مگر اس وقت
تک کہ جب تک عنوانِ افساد اس پر منطبق نہ ہو اور کذب میں تقاضا قبح
کا ہے مگر اس وقت تک کہ جب تک عنوانِ اصلاح اس پر منطبق نہ ہو لیکن
اگر صدق میں افساد ہو اور کذب میں اصلاح تو پھر حسن اور قبح کا حکم بالعکس ہو
جائے گا۔ اسے علمی الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ صدق اور کذب میں
واقع حسن اور قبح ہے تو مگر بطور مقتضی ہے۔ علت تامہ کے طور پر نہیں ہے
لہٰذا اس تقاضائے قبح کے ساتھ جب وہ عنوان صادق آجاتا ہے جو علت
تامہ حسن کی ہے، تو اس قبح کا زائل ہو جانا لازمی ہے اور اسی طرح جب
تقاضائے حسن کے ساتھ وہ عنوان صادق آ جائے گا جو علت تامہ قبح کی
ہے تو اس حسن کا زائل ہو جانا لازمی ہو گا۔ اسی لیے مصلح الدین سعدی
شیرازی نے یہی کہا ہے۔ "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" اور
اس کے بعد مسئلہ تقیہ میں عقلی طور پر کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔

حقیقت اور اس کے اظہار و اخفا کے مواقع

عقل اور اس کی اشاعت

حکم اور احساس کا اجرا، حقیقت اور اس کا اظہار۔ یہ مختلف منزلیں ہیں جن میں
سے ہر ایک میں جداگانہ مصالح کا مدنظر رکھنا آمر حکیم اور ناقل حکیم کے لیے ضروری
ہے اور وہ مصالح کلی جس پر کسی حکم کی فعلیت کا انحصار ہے ان تمام پہلوؤں کو
مدنظر رکھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ حالات و واقعات اور خصوصیات کے لحاظ
سے مصالح و حکم کی تبدیلی احکام شرعیہ میں نسخ اور احکام تکوینیہ میں بدا کے نام

سے ایک مستقل حقیقت ہے جس پر بحث علم کلام کا ایک مستقل باب ہے۔ جس طرح رفتار کے پہلے قدم اور ترقی کے پہلے زینے آخر میں اس پر یہ معلوم ہے کہ منزل تک پہنچنے سے اصل مصلحت کا تعلق اس آخری قدم سے ہے جس کے ساتھ منزل تک پہنچنا ہوتا ہے۔ مگر پہلے لمحہ میں اس منزل پر قدم پہنچانے کا حکم کسی طرح درست نہیں ہے بلکہ بہت ممکن ہے کہ امکان و استطاعت سے زیادہ قدم آگے بڑھانے اور ایک دم سے منزل تک پہنچنے کی کوشش اس طرح منہ کے بل گرا دے کہ ہمیشہ کے لیے منزل تک پہنچنے سے محرومی ہو ہی جائے۔

نظام تعلیم میں اسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ اصل شے جس سے نفع و مصلحت کا تعلق ہے وہ تعلیم کا ایک بلند نقطہ ہے جہاں تک پہنچنا اصل میں مد نظر ہے۔ مگر بچہ کو پہلے دن سے اس تعلیم سے روشناس بنانے کی کوشش سعی لاحاصل اور نقش بر آب ہوگی۔ اور بسا اوقات طالب علم کی ذہنی بدمزگی کا باعث ہوگی کہ وہ ہمیشہ کے لیے تعلیم ہی سے متنفر ہو جائے۔ اس لیے اس کی سطح دماغی کی مناسبت سے آگے بڑھانا ہی مناسب و ضروری ہے۔ کیا شبہ کہ وہ حقیقتیں جو نصاب تعلیم کی آخری منزل میں بتائی جائیں گی حقیقت ہی ہیں۔ مگر ان حقیقتوں کے سمجھنے کی ابھی اس کے دماغ میں صلاحیت نہیں لہٰذا ابھی اس سے ان حقیقتوں کا پردہ میں رکھنا ہی بہتر و انسب ہے۔ یہی ہدایت اور تلقین صداقت کی صورت ہے۔

افراد و مخاطبین کی سطح دماغی اکثر ویسی ابتدائی منزل ہوتی ہے کہ وہ بلند حقیقتوں کے تحمل کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لیے ابتداءً ان کے سامنے سیدھی سادی باتیں رکھ دی جاتی ہیں جنہیں وہ بآسانی قبول کر لیں۔ اس حالت میں بھی ان بلند حقیقتوں کے حقیقت ہونے میں شک نہیں۔ مگر ان کا بتانا اور سمجھانا اکثر حالات میں مناسب نہیں ہوتا ہے بلکہ سخت

"اخفائے حقیقت" کہا جاسکتا ہے - مگر یہ اخفا رعایت حقیقت کی بنا پر نہیں بلکہ مفاد حقیقت کے لحاظ سے ہوتا ہے۔ یہ حقیقت پوشی ناحق کوشی نہیں بلکہ حقیقت پروری ہوتی ہے - انبیاء و مرسلین کے تعلیمات کا ارتقاء اسی محور پر گردش کرتا ہے -

یاد رکھنا چاہیئے کہ اصول تعلیم از آدمؑ تا خاتمؐ ایک ہی ہے ان میں کوئی فرق نہیں - وہ تمام حقیقتیں جو حضرت محمد مصطفیٰؐ کی زبانی دنیا تک پہنچائی گئیں اس وقت بھی حقیقت ہی تھیں کہ جب آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ مبعوث ہوئے تھے - مگر عام انسانی سطح اتنی بلند نہ تھی کہ اسے ان تفصیلی حقائق سے آگاہ کیا جاتا۔ اس لیے ہر وقت اجمالی طور پر آخرت اور جزا و سزا کی اطلاع دے دی گئی - مگر جس تفصیل، تجزیے اور تحلیل کے ساتھ ان باتوں کا ذکر قرآن مجید اور احادیث پیغمبر اسلامؐ میں آیا ہے - اس کا ذکر گزشتہ کتب اور انبیاءؑ کے بیانات میں نظر نہیں آتا۔

یونہی احکام عبادات و معاملات ہیں - یقیناً روزہ میں جو خوبیاں ہیں وہ ہمیشہ سے تھیں مگر افراد خلائق کی نفسیاتی کیفیت اس لائق نہ تھی کہ اس پر یہ بار ڈالا جاتا - جب خالق حکیم کی نگاہ میں خلق خدا کی سطح نفسانی اس کے لائق ہوئی تو اس پر یہ فریضہ عائد کیا گیا - اسی طرح مثلاً شراب پینے کی مضرتیں یہ اس عمل کے ساتھ ہمیشہ ہی سے وابستہ ہیں - مگر شروع میں جامعۂ مذہب کے افراد اس صلاحیت کے درجہ تک نہ پہنچے تھے کہ ان کے سامنے اس حکم کو لایا جاسکے لہٰذا اس ممانعت کا اجرا نہیں ہوا۔

شرائع کا یکے بعد دیگرے تبدیل ہونا اور ایک ہی شریعت میں تدریجی طور پر احکام کا اجرا جو تمام عالم اسلامی میں متفقہ حیثیت سے تسلیم شدہ ہے - اسی حقیقت کا آئینہ دار ہے -

اب غور کیجیے کہ روزہ کی فرضیت سے قبل روزہ کی منفعت و ضرورت پردہ میں رکھی گئی یا نہیں۔ تحریم شراب کے پہلے شراب کی مضرت پردہ میں رکھی گئی یا نہیں۔ اس کے بعد کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ اخفائے حقیقت مطلق طور پر غیر مستحسن یا مذموم ہے۔

اسی سے اظہار واقعہ بصورت خبر کو بھی کہا جا سکتا ہے کسی بات کا زبان پر لانا۔ اس پر صرف اس بات کا حق ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ اس حق کے زبان پر لانے کے نتائج کیا ہوں گے؛ اور ان نتائج کے دو رخ ہیں منفعت ہے یا مضرت۔ اگر وہ نتائج چند مفاسد کے سلسلے میں منفعت کے حامل ہیں تو اس حقیقت کا زبان پر لانا درست ہوگا اور اگر وہ نتائج بحالات موجودہ مضرتوں کے حامل ہیں تو ایسے ہنگام میں حقیقت کا اظہار بسا اوقات بدترین جرم قرار پائے گا۔

یہ مضرتیں شخصی بھی ہو سکتی ہیں اور قومی بھی۔ نیز کبھی شخصی اور قومی مفاد میں تصادم پیدا ہو جائے گا۔ تو وہاں دونوں کی اہمیت کے توازن سے کوئی حکم لگایا جا سکے گا۔ یہی وجہ ہے جس کی بناء پر علماء نے کہا ہے کہ تقیہ کا کوئی ایک حکم نہیں ہے بلکہ کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب، کبھی مباح، کبھی مکروہ اور کبھی حرام۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ بے شک حقیقت کا اظہار بعض اوقات نامناسب ہو سکتا ہے مگر یہ ایک منفی عمل ہے۔ اس کے لیے خلاف واقعہ اظہار کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ جھوٹ ہوگا۔ جھوٹ کبھی جائز نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ جس غرض سے حقیقت کا اخفاء مناسب ہوتا ہے وہ غرض جب منفی صورت سے پوری ہو جائے تو پھر ہم بھی خلاف واقعہ اظہار کو جائز نہ کہیں گے۔ لیکن اگر وہ غرض بغیر ایجابی پہلو کے پوری ہی نہ ہو تب!

اس کے علاوہ عدم اظہار میں اکثر اوقات کسی نہ کسی حیثیت سے اظہار خلافِ واقعہ بھی داخل ہو ہی جاتا ہے۔

اس کے لیے سنت کی قسموں کا یاد رہ جانا کافی ہے۔ تمام علمائے اسلام کے نزدیک متفقہ طور پر سنتِ رسول کی تین قسمیں ہیں۔ قول، فعل، تقریر۔ کسی بات پیغمبرِ خدا نے زبان سے ارشاد فرمائی۔ یہ ہوا قول۔ کوئی امر عمل میں لا کر دکھایا۔ یہ ہوا فعل۔ کسی عمل کو دیکھ کر سکوت اختیار فرمایا یہ ہے تقریر۔ اب فرض کیجیے کہ وہ وقت کہ جب اظہارِ واقعہ مناسب نہیں ہے یا اس کا محل نہیں ہے اور اس صورت میں پیغمبرِ خدا نے کسی کو اس عمل کو انجام دیتے دیکھا جسے حقیقتاً اسے عمل میں نہ لانا چاہیے۔ اب اسے دیکھ کر رسول تائید بھی نہ فرمائیں تو کم از کم سکوت فرمائیں گے (جبکہ مفروضہ یہ ہے کہ اظہار مناسب نہیں ہے) مگر یہ سکوت بھی سنت کی تیسری قسم میں داخل ہو کر دلیلِ جواز بن جائے گا اور اس طرح تقریری حیثیت سے یہ عدم اظہارِ مخالفت اظہارِ موافقت ہو کر قرار پا جائے گا۔ جب عدم اعلان صرف منفی دائرہ میں کہاں منحصر رہا۔ اس کے خلاف کسی نہ کسی حد تک تو عمل ہو ہی گیا۔ ایسا ہی اکثر ان مواقع پر سمجھنا چاہیے جہاں حقیقت کا اظہار مناسب نہ ہو۔

عقلِ عمومی کا فیصلہ اور تمدنِ حاضر کا تقاضا

آج کل کی متمدن دنیا میں بھی خطرناک موقع پر افراد اور جرائد پر یہ پابندیاں عائد ہوتی رہتی ہیں کہ وہ مفادِ ملکی کے خلاف کوئی بات نہ کہیں اور نہ لکھیں۔ ظاہر ہے کہ دل پر تو قابو پانا کسی حکومت کا کام نہیں ہے۔ یہ امر کہ تمہارے دل و دماغ میں کوئی خیال نہ پیدا ہو جو مصالحِ ملک کے خلاف ہو، تمہارے دل کی گہرائیوں میں کوئی ایسا اعتقاد نہ ہو جو سیاستِ وقت

کے خلاف ہو۔ اس کا مطالبہ اور اس پر پابندی دنیا کی کوئی قوت نہیں کر سکتی۔
اس لیے اس پابندی کا مطلب صرف یہ ہے کہ تمہارے دل میں چاہے جو ہو مگر
تم کوئی بات ایسی زبان پر نہ لاؤ اور نہ کرو جو ملک کے مفاد کے خلاف ہو۔ اس
باب میں اگر سچائی کی قدر و قیمت سمجھی جائے تو جب اس قسم کا کوئی مقدمہ سچے
ملزم کی طرف سے یہ صفائی قابل قبول ہونا چاہیے کہ ہم نے جو کہا ہے ہم
سمجھتے ہیں ویسا ہی، اور ہم نے جو کہا ہے وہ سچ کہا ہے۔ مگر سب کو معلوم ہے کہ
یہ صفائی کسی بھی تمدن و تہذیب کے موجودہ ماحول میں قابل قبول نہیں ہو گی
اس کا مطلب یہی ہے کہ ہم سے بتقاضائے تمدن مطالبہ یہی ہے کہ تم سمجھتے چاہے
جو کچھ ہو لیکن جب تک تم اس نظام حکومت کے ماتحت رہتے ہو اور اس
جماعت کی فرد ہو اس وقت تک کوئی ایسی بات جو اس ملک یا
حکومت کے حق میں مضر ہو اس کے ساتھ اگر یہ بھی بڑھا لیا جائے کہ جو خود
تمہاری جان و مال یا آبرو کی حیثیت سے خود تمہارے لیے مضر ہو تو اصلاً اس
میں کیا خرابی واقع ہو سکتی ہے۔

بس یہی فیصلہ ہو جو عقل عمومی کے ماتحت تمام متمدن دنیا کا ہے اس کو مناسب
حدود میں اسلام نے قانونِ تقیہ کے تحت میں منضبط کیا ہے اور اس نے وہ حدود
بتلائے ہیں جن کے مطابق نظام اجتماعی کے اس مطالبہ کا احترام کیا جا سکے اور وہ
حد بھی کہ جہاں ایک بندۂ خدا کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ نظام اجتماعی کی اصلاح
کے لیے طاقت و اقتدار والے عناصر کے اس مطالبہ کو ٹھکرا دے اور وہ سب کچھ
اور کرنے کے لیے تیار ہو جائے جو اس کے ضمیر کا واقعی فیصلہ ہے۔ یہی وہ
منزل ہے جہاں تقیہ حرام ہے اور جس کی بہترین مثال حسین ابن علی نے
کربلا کے میدان میں پیش فرمائی۔

خوف اور اس کے اقسام و احکام | چونکہ تقیہ کا موضوع خوف ہے

مال کا خوف، جان کا خوف، اپنے عزت وناموس کا خوف، اور سب سے
بڑھ کر یہ کہ انسان کے دل سے اس مقصد کو نقصان پہنچنے کا خوف جس کی محافظت
اپنا اہم نصب العین ہے۔ اس لیے اس کے خلاف کبھی ایسی آیتیں قرآن
کی پیش کی جاتی ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کو کبھی خوف و خطر ہی
نہیں ہونا چاہیے جیسے الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیہم ولا ہم یحزنون
دوستداران خدا پر نہ کبھی خوف طاری ہوتا ہے اور نہ حزن و ملال۔ مگر
ان کی بات پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دو قسم کی آیتیں ہیں۔ ایک
وہ کہ جن میں خوف اور حزن سے مراد آخرت کا خوف و حزن ہے۔ اس کا دار دنیا
کے خوف و حزن سے کوئی تعلق نہیں ہے اور دوسری قسم ان آیتوں کی ہے
جن کا مطلب یہ ہے کہ خوف خلائق سے حکم خالق کی مخالفت درست نہیں ہے
جیسے افلا تخافوھم وخافون ان کنتم مومنین
ان سے نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔
اتخشون الناس واللہ احق ان تخشوہ
"تم انسانوں سے ڈرتے ہو۔ اللہ زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اس سے ڈرا جائے"
اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر اللہ سے اندیشۂ ضرر پیدا ہی نہیں ہوتا۔ یہ اندیشہ تو
اسباب ونیویہ سے متعلق ہے۔ اگر کوئی زبردست ظالم ہے جو ضرر رسانی پر تلا ہوا ہے
اور ہمارے پاس مدافعت کے اسباب نہیں ہیں تو اس سے ضرر پہنچنے کا احتمال
یا گمان ضرور پیدا ہوگا۔ اسی احتمال یا گمان کا نام خوف ہے۔ مگر اس خوف
سے متاثر ہو کر انسان کو وہ طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے جو حکم الٰہی کے خلاف ہو۔ یہی
وہ ہے جس کی ان آیتوں میں ممانعت کی گئی ہے۔ اب جب اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ
صاحبان ایمان کو اندیشۂ ضرر پیدا ہی نہیں ہوتا تو اگر اس اندیشۂ ضرر کی وجہ سے خود
خالق کریم کی طرف سے انسان کے لیے کوئی حکم امتناعی یا رعایتی ثابت ہو جائے تو

اس پر کاربند ہونا مذکورہ بالا آیات کے خلاف کہاں قرار پا سکتا ہے۔

ہم جب احکام شرعیہ پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سے احکام کا موضوع خوف ہی ہے۔ مثلاً جب خوف مرض ہو تو وضو کے بجائے تیمم کرنا ہوگا۔ خوف مرض ہو تو روزہ تو صیام ہی نہ رکھا جائے بلکہ دوسرے زمانے میں قضا کر لیا جائے۔ خوف مرض کے ساتھ سفر کیا جائے تو اس سفر میں قصر صلوٰۃ نہ ہوگا۔ بلکہ نماز پوری پڑھی جائے گی۔ جنگ میں نماز کی ایک خاص صورت ہے جس کا نام ہی ہے صلوٰۃ خوف۔

اگر خوف کی کیفیت کا ذہن میں پیدا ہونا ہی شانِ ایمان کے خلاف ہوتا تو یہ احکام بیکار ہو جاتے اور ان کا موضوع ہی متحقق نہ ہوتا۔ خاص طور پر یہ آیت قابلِ لحاظ ہے جس میں اہلِ ایمان کے امتحانات کا ذکر ہے۔

ولنبلونکم بشیء من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات ا

"ہم ضرور تمہارا امتحان لیں گے کچھ نہ کچھ چیزوں کے ساتھ، خوف، بھوک اور نقصان اموال و ثمرات۔" اس میں سب سے پہلی چیز جسے ذریعۂ امتحان بتایا گیا ہے وہ خوف ہے۔ اس کے بعد یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے کہ خوف کا پیدا ہونا شانِ ایمان کے خلاف ہے۔

اب نظامِ شریعت میں نظر کیجئے تو آپ کے سامنے مختلف مثالیں ایسی آئیں گی کہ شریعت نے ہماری جان، مال کے تحفظ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اپنے احکام میں تبدیلی پیدا کر دی۔ نماز کے لیے اصل حکم وضو کا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صلاح کل نماز کا باوضو ادا کرنے میں ہے لیکن اگر نقصان کا اندیشہ ہو خواہ مرض کے پیدا ہونے کا یا مرض میں طول ہو جانے کا یا علاج کے دشوار ہو جانے کا تو شرعِ مقدس کی جانب سے حکم میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اب وضو کے بجائے تیمم کا حکم ہو جاتا ہے۔ اگر شانِ عبودیت ہر حال میں یہ ہوتی کہ اپنے مفادِ جسمانی سے قطع نظر کی جائے تو معیارِ کمالِ عبادت یہ ہونا چاہیے کہ مر جاؤ مگر نماز باوضو ادا کرو۔ معلوم ہوتا ہے خالق کائنات رحیم ہے۔ یہاں تک کہ اگر کوئی جہالت سے کام لے کر اس طرح ذوقِ عبودیت کو پورا کرنا چاہے تو

اس کی نماز باطل ہوگی اور وہ وضو صحیح نہ ہوگا۔

اسی طرح روزہ کا حکم اور قصر نماز کا حکم۔ وغیرہ وغیرہ۔

آخر یہ سب ہماری عزیز ترین ہماری جسمانی تکلیفیں، ہماری صحت جان کی حفاظت کے لیے ہے۔ پھر خوفِ مرض سے جان جانے کا ہی نہیں بلکہ اس سے کم درجہ کا اندیشہ ہو تو حکم یہ تبدیلی ہو جائے اور اس پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے لیکن اگر کسی ظالم کے ظلم سے جان جانے کا اندیشہ ہو اور اس اندیشہ کی وجہ سے حکم شریعت میں تبدیلی ہو جائے تو یہ شانِ اطاعت و عبودیت کے خلاف کہہ دیا جائے اور قابلِ اعتراض چیز بن جائے! یہ منطق ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

جب خالق ہمارے جسم و جان کا خالق ہی نہیں بلکہ سبب ہی ہے یعنی اسبابِ بقا کا فراہم کرنے والا تو اگر وہ اپنی شانِ ربوبیت سے ہماری بقائے زندگی کے لیے کوئی مراعات کرے تو اس مراعات پر عمل کرنا شانِ عبودیت کے خلاف کیونکر ہوگا یاد رکھنا چاہیے کہ جس طرح نماز اس کی ہے، روزہ اس کا ہے، اسی طرح ہماری جان بھی حقیقتاً اسی کی ہے اور اسی نے اس کا تحفظ فرض قرار دیا ہے۔ لہٰذا خوفِ جان سے کسی عبادت کے ترک کرنے یا صحیح صورت کے خلاف عمل میں لانے کو یوں تصور کیا جائے کہ ہم نے خدا کے حکم کے مقابلہ میں اپنی جان کو ترجیح دی بلکہ اسے یوں سمجھے کہ ہم خالق کے ایک حکم کی تعمیل کے لیے جو اہم ہے یعنی حفاظتِ جان اس کے دوسرے حکم کی تعمیل سے قاصر رہے۔

تقیہ یا جھوٹ

تقیہ کی تعبیر جھوٹ کے ساتھ ایک عام تخیل بن گیا ہے جسے مناظرہ کے میدان میں اتنا زیادہ پھیلایا گیا ہے کہ اب اکثر اردو محاورہ میں یہ دونوں الفاظ بطور مترادف کے استعمال ہونے لگے ہیں

حقیقت امر یہ ہے کہ افراط و تفریط کے نقطوں کے درمیان جو اعتدال کا نقطہ ہے وہی تحقیقی طور پر صحیح نقطۂ نگاہ ہوتا ہے مگر تعبیرات کی وسعت میں افراط یا تفریط کے

فقروں کو سامنے رکھئے جیسے ایک ذرا سے الٹ پھیر کے ساتھ ان پر کسی ایسے نام کا اطلاق کر دینا بہت آسان ہوتا ہے جو انتہائی قابلِ مذمت ہو۔

مثلاً ان مذاہب کے معیارِ نگاہ سے جو رہبانیت کو اکمل ورزش سمجھتے ہیں کثرتِ ازدواجی بیاہ نہ کرنے ... اسلام کے ترغیبِ ازدواج ہی نہیں بلکہ تعدادِ ازدواج کے حکم کو بآسانی ان فقروں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے عیاشی کی تعلیم دی ہے اور کوئی شک نہیں کہ یہ لفظ بہت برا ہے مگر اس برے لفظ کے ساتھ تعبیر کر دینے سے وہ طریقِ عمل برا نہیں قرار پا سکتا ہے جسے ضبطِ اولاد اور اعتدال کے ساتھ اسلام نے جاری کیا ہے۔ اسی طرح مطلق عدم تشدد والے نظریہ کی جانب سے مخصوص حدود و شرائط کے ساتھ تلوار اٹھانے کی اجازت کو خونریزی کی تعلیم سے تعبیر کر دینے میں کیا دشواری ہے اور کوئی شک نہیں کہ خونریزی بری چیز ہے مگر کیا اس سے اسلام کی اس تعلیم پر واقعی کوئی حرف آ سکتا ہے؟ یا بازی کے اس معیار پر جو تہوّر کی حد میں داخل ہوتا ہے کسی مناسب موقع و محل پر دانشمندانہ طرزِ عمل یا صلح پسندی و دامن بچانے کو بزدلی کہہ دیا جاتا ہے اور بزدلی کے برے ہونے میں کوئی شک نہیں مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ صلح اپنی جگہ بری شے ہے۔ اسی طرح سخاوت کو فضول خرچی میں، میانہ روی کو بخل میں، متانت کو بداخلاقی میں اور حکمتِ عملی کو مکاری میں داخل کر دینا نہایت آسان ہے۔

بسا اوقات ان باتوں میں ایسا بال کا سا باریک فرق ہوتا ہے کہ اسے فقروں میں سمجھانا بھی دشوار ہوتا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ انکی برائی میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، نہ وضاحتاً کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ مثلاً کون کہے گا کہ عیاشی اچھی چیز ہے، خونریزی بہتر ہے، بزدلی قابلِ تعریف شے ہے، فضول خرچی مناسب بات ہے، بخل سلامتی فعل ہے، اور مکاری مستحسن عمل ہے۔ یقیناً یہ سب باتیں بہت بری ہیں پھر بھی ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ وہ کام جو ان الفاظ کے تحت میں بسا اوقات داخل کر لیے

جاتے ہیں اکثر حالات میں نہایت صحیح، مناسب اور قابل مدح و ستائش ہوتے ہیں جن کو صرف بد اندیشی یا غلط فہمی سے ان ناموں کے تحت میں داخل کر دیا جاتا ہے مگر حقیقتاً وہ ان کے مستحق نہیں ہوتے۔

اسی طرح "جھوٹ" نام یقیناً بہت برا ہے اور اس کی برائی ایسی ہے کہ اس میں کسی اچھائی کا تصور کرنا قطعاً مشکل بلکہ ناممکن ہے مگر جس جس بات کو جھوٹ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہ بسا اوقات اپنی جگہ نہایت مناسب بلکہ ضروری ہوتی ہے۔

اب اگر برائی جھوٹ میں لازم ذات محسوس ہوتی ہو تو چاہیے لفظوں میں فرق کیا جاتا اور چاہے ناگوار ہو مگر ماننا پڑے گا کہ وہ صورتیں جو یقیناً مناسب و مستحسن ہیں جھوٹ سے خارج ہیں کیونکہ وہ مستحسن ہیں اور جھوٹ کلیتہً بری چیز ہے اور نہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ جھوٹ کلیتہً برا نہیں ہے بلکہ اس میں دونوں صورتیں نکلتی ہیں۔ اچھائی بھی اور برائی بھی جیسا کہ مصلح الدین سعدی شیرازی نے کہا ہے "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" غرض اسی طرح کہ جھوٹ کو ایک جامہ زیب چیز مانا جائے جس میں ذاتاً نہ اچھائی ہے اور نہ برائی۔ بلکہ یہ دونوں باتیں دو خصوصیات سے پیدا ہوتی ہیں یا پھر یہ مانا جائے کہ جھوٹ میں بذات خود تقاضا تو برائی کا ہے لیکن کوئی اہم ضرورت و مصلحت ایسے تقاضائے طبعی پر غالب آ کر اسے حسن کی صفت سے متصف بنا دیتی ہے لہٰذا وہ جھوٹ جو بے وجہ بولا جائے جس کے لیے کوئی ضرورت داعی نہ ہو یقیناً بلحاظ ذات برا ہوگا اور قابل مذمت گناہ ہوگا۔ نہ یہ کہ وہ جس میں کوئی اہم مصلحت مضمر ہو۔

صدق اور کذب کے مختلف پہلو

یہ خاص حد پر قابل لحاظ امر ہے کہ "جھوٹ" کا دائرہ چاہے کتنا ہو مگر چونکہ وہ صدق کے مقابل میں ہے لہٰذا صدق کے حدود پر نظر کرنا ضروری ہے کہ اس میں کون کون سے پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً صدق میں داخل ہے صدق قول یعنی وعدہ

کا سچا ہونا۔ اب فرض کیجئے کہ آپ نے کسی سے یہ وعدہ کیا ہے کہ میں کبھی تمہارے راز کو افشا نہ کرونگا۔ اب اس نے اسی وعدہ پر کوئی راز آپ کے سپرد کیا۔ اس کے بعد اس کا کوئی دشمن اسکے اس راز کو آپ سے دریافت کرتا ہے تو اب دیکھئے کہ یہاں حقیقت کا اظہار کر دینا سچائی ہے یا نہیں۔ خود اس کلام اور اس کے مطابق واقعہ ہونے کے لحاظ سے دیکھئے تو وہ سچا ہوگا۔ مگر اس وعدہ کے لحاظ سے دیکھئے جو آپ نے افشائے راز نہ کرنے کے متعلق کیا تھا تو یہ اظہار کرنا سچائی کے خلاف ہے۔ اب جتنا یہ راز اہم ہو اور جتنی اس کے افشا کی مضرت زیادہ ہو اتنا ہی یہ سچ کہہ دینا قابل مذمت و ملامت ہوگا۔ اور گناہ قرار پائے گا۔ اب اسے یوں کہنے کو کہہ دیا جائے کہ وہ جھوٹ ہے مگر حقیقت میں وہ ایک عظیم تر جھوٹ سے بچنے کی کوشش ہے۔ اسی طرح صدق وعد یعنی قول و قرار اور پیمان کو پورا کرنا۔ اس کی مخالفت بھی ایک جھوٹ ہی ہے مگر کبھی لفظی سچائی اس جھوٹ کی مستلزم ہوتی ہے اور اس سچائی کا لحاظ کرنا لفظی طور پر جھوٹ کے الزام کا باعث ہوتا ہے مگر ایک فرض شناس انسان کو اسے اختیار کرنا پڑتا ہے جو درحقیقت سچائی پر قائم رہنے کی کوشش ہے چاہے دنیا والے اسے غلطی یا عداوت میں جھوٹ کہہ کر مطعون کرنے کی کوشش کریں۔

یہ عہد و پیمان کبھی خود اختیاری ہوتا ہے جیسے کسی نے اپنے اوپر عائد کر لیا ہے اور کبھی تقاضائے ایمان خالق حکیم کی جانب سے ہوتا ہے۔ جیسے نفس محترم کی حفاظت۔ یہ خالق کی طرف کا عہد ہے جب تک اس نفس کے احترام کا موقعہ جو تقاضا ہو تا ہم اس کی حفاظت کا عہد ہوگا۔ لہذا وہ جیسے اپنی جان کا اس سے زیادہ کسی دوسرے بے گناہ کی جان کا۔ اس سے عظیم تر کسی کی اقدا

کسی نبی یا رسول کی جان کا اور سب سے بڑھ کر خاتم المرسلین کی جان - اب اگر کوئی موقع ایسا ہے کہ اظہار واقعہ کسی جان کی تلف کا باعث ہے تو واقعہ کا اظہار بجا طور پر سچائی ہے مگر وہ اسی عہد الٰہی کی مخالفت ہونے کی بنا پر جو حفاظت نفس سے متعلق ہے ایک بہت بڑا سچائی کے خلاف عمل ہے - یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کون سچائی زیادہ قیمت رکھتی ہے - یہ لفظی سچائی جو واقعہ کے بیان سے متعلق ہے یا وہ عہد کی سچائی جس کے پورا کرنے کے متعلق خالق کا حتمی مطالبہ ہے یہ وہ منزل ہے جہاں سنت انبیاء بھی خود ہمارے لیے رہنمائی کرنے کے لیے موجود ہے -

جھوٹ کا الزام آخر کس چیز پر عائد کیا جاتا ہے ؟ وہی لفظی عمل جس سے مخاطب واقعہ کی حقیقت کے خلاف سمجھے - اب اس ذیل میں ان صورتوں پر آپ نظر ڈال سکتے ہیں جو خالق کریم نے اپنے کلیم موسیٰ اور پھر حضرت عیسیٰ اور آخر میں بموقع ہجرت جناب خاتم النبیین ص کی حفاظت کے لیے اختیار فرمائیں - اس کے بعد کون ہوگا جو تقیہ پر کوئی اعتراض کر سکے -

تقیہ کے شرائط

گذشتہ بیانات سے تقیہ کی مشروعیت اور ضرورت پر کافی روشنی ڈالی جا چکی ہے - پھر بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تقیہ ہر موقع و محل پر خلاف واقعہ امر کے اظہار کا نام نہیں ہے - نہ ہر موقع پر تقیہ درست ہے -

اس کے لیے حسب ذیل شرائط و قیود کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے

۱- تقیہ دفع مضرت کے لیے ہوتا ہے - جلب منفعت کے لیے نہیں - حاصل یہ کہ صرف کسی منفعت کے حصول کے لیے کسی ملازمت کی حاصل کسی شہرت عامہ کے مقصد سے اور کسی رئیس کو خوش کرنے

کے واسطے سچائی کے خلاف کہنے اور کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں یہ قطعاً کسی شریعت اور عقل کے رو سے جائز نہیں ہو سکتا — ہاں جس وقت جان، مال یا عزت و ناموس کو صدمہ پہنچ رہا ہو - اس وقت ایسا طرزِ عمل اختیار کیا جا سکتا ہے جو اس ضرر و نقصان سے محفوظ رکھ سکے۔

۲- تقیہ کی مشروعیت حقوق اللہ میں ثابت ہے - مگر حقوق الناس میں اس کی مشروعیت بہت حد تک غیر قابلِ تسلیم ہے - بلکہ کسی حد تک اس کے خلاف یقینی طور پر ثابت ہے - مطلب یہ ہے کہ اپنی جان بچانے کے لیے کسی دوسرے کی جان لینے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اسی طرح اپنے کو کسی مالی نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے دوسرے کو مالی نقصان میں مبتلا کر دینا — یا اپنی آبرو کے تحفظ کے لیے دوسرے کی آبروریزی کر دینا۔

حدیث میں ہے۔ "انما شرعت التقیۃ لیحقن الدماء فاذا بلغ الدم فلا تقیۃ" تقیہ صرف خونریزی سے تحفظ کے لیے قرار دیا گیا ہے — لہٰذا جب تقیہ خود خونریزی کا باعث ہو جائے تو پھر تقیہ نہیں ہے۔"

۳- تقیہ صرف اس وقت جائز ہو سکتا ہے جب کسی ایسے مقصد کا جس کی اہمیت نظرِ شارع میں ہماری جان سے بھی زیادہ معلوم ہو۔ تحفظ ہماری جان دینے پر موقوف نہ ہو جائے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو پھر تقیہ حرام ہو جائے گا۔ اسی بنا پر علماء نے ارشاد کیا ہے کہ تقیہ کا کوئی ایک حکم نہیں ہے۔ بلکہ تقیہ کبھی واجب ہوتا ہے کبھی مستحب کبھی مباح، کبھی مکروہ اور کبھی حرام۔

تشریح اس کی یہ ہے کہ مفاد دینی اور جان یا مال یا عزت یعنی اس نقصان کی نوعیت کے لحاظ سے جو پہنچنے والا ہے دونوں کی اہمیت کا اندازہ کیا جائے گا۔

۱۔ اگر مفاد دینی مقدم ہو اور اس کی حفاظت کا انحصار اس شخص میں ہو۔ اگر سوا اس کے کوئی دوسرا اس کام کو انجام ہی نہ دے سکتا ہو تو تقیہ حرام ہوگا اس کی مثال انبیاء و مرسلین ہیں جنہوں نے ہدایت خلائق کے لیے ہر طرح کے تکالیف اٹھانا برداشت کیے۔ انھیں تقیہ روا نہ تھا اس لیے کہ اگر وہ اظہار حقیقت سے خطروں کا لحاظ کرکے گریز کرتے تو پھر ان حقیقتوں کا دنیا تک پہنچانے والا کون ہوتا۔ ان کا تو مقصد حیات ہی خلق خدا کی ہدایت تھا۔ لہٰذا وہ اس بارے میں کسی قربانی سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام کا بھی موقف یہی تھا۔ اگر آپ ایسے آڑے وقت میں اسلام کے کام نہ آتے تو اور کون ہو سکتا تھا جو اس مقصد کو پورا کرے۔

۲۔ اگر مفاد دینی اہم اور مقدم ہو لیکن دوسرے بھی اس خدمت کو انجام دے سکتے ہوں اور انجام دے رہے ہوں اور اس شخص کی ذات سے ساتھ کوئی دوسری اہم خدمت جو اسی کی ذات سے وابستہ ہے متعلق نہ ہو تو اس کے لیے دین کی خاطر قربانی کو پسند کرنا مستحسن یا یوں کہیے کہ مستحب ہوگا۔ اور تقیہ اس وقت میں مرجوح ہوگا جسے "کراہت" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ اگر تقیہ کرکے اپنی جان کو بچا لے تو مورد مذمت و ملامت نہیں ہو سکتا۔ یہی نوعیت سمجھی جا سکتی ہے۔ اس اجازت کی جو حضرت سید الشہداء اپنے اصحاب کو اپنا ساتھ چھوڑ کر چلے

جانے کے متعلق دیے رہے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ پیچھے جاتے
تو گنہگار نہ سمجھے جاتے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے قیام
اور قربانی سے جو مرتبہ انہیں حاصل ہوا اُس کا حصول اس صورت میں
ان کے لیے ممکن نہ تھا۔

۴ - جان کے جانے سے کوئی خاص مذہبی فائدہ متوقع نہ ہو، لیکن
احترام مذہب دعوت دیتا ہو کہ سچائی کے ساتھ اپنے خیالات کو ظاہر
کر دے اور اصول پر قائم رہے اور اس کی ذات کے ساتھ اتنے
کوئی مذہبی مفادات وابستہ بھی نہ ہوں جو اس کے جان دینے سے
تلف ہوتے ہوں تو ایسے مقام پر تقیہ جائز و مباح ہو سکتا ہے یعنی
اختیار ہو گا کہ چاہے سچائی کے اصول کو سامنے رکھ کر قربانی کے لیے تیار
ہو جائے اور چاہے تو اپنی جان کا تحفظ کر کے تقیہ کرے۔ یہ تقیہ جائز
ہو گا۔ مگر اس کے ترک میں بھی گنہگار نہ ہو گا۔ وہ عمل جہاں میثم تمار رشید
ہجری اور دوسرے دیگر مردانِ با وفا نے فضائل امیر المومنین کے
اظہار اور اعلان میں جانیں دینا گوارا کر لیں۔ حالانکہ احادیث تقیہ ان کے
سامنے تھے اور وہ اگر چاہتے تو تقیہ کر کے اپنی جان کی حفاظت کر
لیتے۔ وہ بعض حالات میں اس کے قبل والی قسم میں اور بعض حالات میں اسی
قسم کے اندر داخل ہو سکتا ہے۔ اس کا فیصلہ اس وقت کے حالات
اور ان افراد کے خصوصیات کے صحیح تجزیہ پر موقوف ہے جس کے
متعلق ہمیں اب کوئی صحیح اصل کھینچنا اکثر دشوار معلوم ہو گا۔

۳ - جان دینے پر کوئی مذہبی فائدہ مترتب نہیں ہے صرف احترام
مذہب اور سچائی کا داعی خطرہ کی طرف قدم بڑھانے کی دعوت ہے

رہا ہے۔ مگر جان کی حفاظت کے ساتھ امکان ہے کہ انسان کچھ مذہبی خدمات انجام دے سکے گا۔ اب اگر اس موقع پر باوجود ناگواری طبع صرف آئندہ کی مذہبی زندگی کے تحفظ کی خاطر جان بچالی جائے تو یہ راجح و مستحسن اور شرعی اصطلاح میں مستحب سمجھا جائے گا۔

اب یہ مسلم شخصیتوں اور ان کے قوت عمل کے لحاظ سے بھی مختلف ہو سکتا ہے۔ جیسے ایک ہی وقت میں یاسر، ان کی زوجہ سمیہ اور ان کے فرزند عمار دست کفار میں گرفتار ہوتے ہیں۔ یاسر اور سمیہ اپنا عمر پوری کر چکے ہیں۔ آئندہ زندگی میں کسی مذہبی کارنامہ کے انجام دینے کا دولہ نہیں۔ ان سے کہا جاتا ہے تو وہ اپنے جذبات ایمانی کے خلاف ایک حرف کہنا گوارا نہیں کرتے۔ شہید کر ڈالے جاتے ہیں۔ عمار ابھی نوجوان ہیں مستقبل کی زندگی سامنے ہے۔ آئندہ مذہب کی راہ میں کارہائے نمایاں انجام دینے کا موقع ہے۔ یہ مشرکین کے منشاء کے مطابق کچھ الفاظ زبان پر جاری کرکے چھٹکارا حاصل کرتے ہیں۔ آیت ان کی تائید میں نازل ہوتی ہے الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان۔ پیغمبر ارشاد فرماتے ہیں کہ ان عادوا لک فعد "اگر ایسا اتفاق ہو تو پھر تم یہی عمل اختیار کرنا"۔ لیکن یاسر اور سمیہ کے لیے بھی کوئی لفظ مذمت کے لیے وارد نہیں ہے۔ اس سے ہم سمجھتے ہیں کہ یاسر اور سمیہ کے لیے تقیہ صرف جائز و مباح تھا اور عمار کے لیے راجح و مستحب تھا۔ وہ تیسری قسم کے حکم میں داخل تھے اور یہ چوتھی قسم میں مندرج تھے۔

۵۔ جان دینے پر کوئی اہم مذہبی مقصد مرتب نہیں ہے۔ اور حفاظت زندگی کے ساتھ کچھ اہم مقاصد دینیہ کی تکمیل ہے جس کا زندگی کی بقا پر انحصار ہے۔

ایسی صورت میں تقیہ واجب ہوگا - اور اس کا ترک حرام اور باعث مواخذہ اخروی ہوگا -

ائمہ اہل بیت علیہم السلام اپنی زندگی میں جس حد تک محتاط رہے ہیں اور جس حد تک انھوں نے حالاتِ وقت کے مطابق بسر کرکے اپنی زندگی کے تحفظ کی کوشش کی ہے جس کا ایک بیّن ثبوت یہ ہے کہ حکومت جور کو بھی اپنے ہی قوانین کے مطابق ان کے خلاف کبھی کوئی الزام نہیں مل سکا جس سے وہ ان کو مورد سزا بنانے کی سند بناتی - اس لیے جب بھی ان کو مقید کیا گیا صرف "اندیشۂ نقض امن" کہہ کر جو کسی نہ کسی الزام کا ثبوت نہیں ہوا کرتا - اور اگر جان لی ہے تو خفیہ حربہ زہر سے جس کی ذمہ داری کبھی حکومت اپنے سر لینے پر تیار نہیں ہوئی - اس سے ظاہر ہے کہ ان کا کوئی عمل ایسا نہ تھا جو حکومت کے قانون سے قابل مواخذہ قرار پا سکتا یہ زمانہ کے حالات کے مطابق زندگی اسی قسم تقیہ کے تحت میں داخل تھی - اور کوئی شبہ نہیں کہ اگر ائمہ معصومین علیہم السلام میں سے سب ہی منصب امامت پر آنے کے بعد ہی حکومت وقت کے خلاف علانیہ علم مخالفت بلند کرکے شہید ہو جاتے تو آج آئین و شرع اسلامی کی حقیقی تصویر جس حد تک ہم تک پہنچ سکی وہ قطعاً پہنچنا ممکن نہ ہوتی -

مذکورہ اقسام اور ان کے تحت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس سے وہ تفرقہ قطعاً دور ہو جاتا ہے جس کا حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے کارنامہ جہاد کربلا اور دوسرے ائمہ معصومین ؑ کی مستقل خاموشی کی سیرت کے درمیان گمان کیا جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تمام سیرتیں ایک متحد قانون و نظام کے تحت میں مندرج ہیں - جو شریعت اسلام کی حکیمانہ منفعت کا تقاضا ہے اور وہ اس سے کسی طرح بھی منحرف نہیں ہو سکتیں -

تدوینِ حدیث

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

"علمِ حدیث کی تدوین" ایک گرانقدر اور بسیط موضوع ہے جس کے لیے محدود صفحات کی تصنیف یا محدود وقت کی تقریر کسی طرح تمام شعبوں پر حاوی نہیں ہو سکتی مسلمان یعنی حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حلقہ بگوش اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے عقیدت مند یقیناً قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے انہوں نے باتفریق مسلک و مشرب ہمیشہ قرآن کے بعد حدیث کی خدمت ضروری سمجھی اور اس میں پوری سعی و اشتغال صرف کی ہے۔

آپس کے ذاتی نظریوں کے اختلاف سے قطع نظر کر کے جب مجموعی طور پر اسلامی خدمات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خدمت سنت اور حدیث کی تدوین کا فرض وہ ہے جس کو دونوں ہی فریق نے اپنے اپنے معیارِ نظر کے مطابق بڑی بلند آہنگی اور عرق ریزی سے انجام دیا ہے۔ اور اس میں وہ اپنا فرض اپنا ایک سمجھتے رہے ہیں اور اسی سلسلہ اس

موضوع کو اگر مشترکہ اسلامی حیثیت سے پیش کیا جائے تو یقیناً ایک بہت بڑی مبسوط کتاب کا طالب ہے جس کے لیے مسلم اکادمی کے متعدد جلسے بھی کافی نہیں ہو سکتے پھر بجا طور پر کہاں ہمت تھی کہ اس موضوع پر تقریر کا مسلم اکادمی کے جلسہ میں وعدہ کر لیتا۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ اس موضوع کا ایک شعبہ یعنی علم حدیث کی تدوین کے متعلق علمائے اہلسنت و جماعت نے جو اس دور میں کیا خدمتیں انجام دی ہیں میرے محترم کرم فرما عالیجناب مولانا حبیب اللہ صاحب افسر مدرس مدرسہ عالیہ لکھنؤ نے میری فرمائش پر نہایت بسط و شرح اور وضاحت و تفصیل کے ساتھ بیان فرمائے ہیں جس سے زیادہ نہ کچھ بیان کر سکتا ہوں اور نہ فرصت باقی ہے۔ اس لیے میرے متعلق جو امر رہ جاتا ہے وہ صرف دوسرے شعبہ کے متعلق کہ "تدوین حدیث" میں شیعہ فرقہ نے کیا خدمات انجام دی ہیں۔ اور تدوین حدیث کی تاریخ اس فرقہ کے روایات کے لحاظ سے کیا ہے اور کس کس دور میں اس میں کیا کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

واضح ہو کہ یہ موضوع کوئی اختلافی یا مناظرانہ نہیں ہے تا کہ میں بیان واقعات میں کسی فریق مقابل کے کتب کا پابند ہوں اور انہیں ماخذ بنانے پر مجبور بلکہ یہ ایک تاریخی اور واقعاتی تبصرہ ہے۔ جس میں مشترک اسلامی کتب کے علاوہ اگر کہیں ضرورت ہو تو شیعہ کتب بھی روایت میں داخل ہیں۔

حدیث کے معنی

حدیث اصطلاح میں وہ روایت جس میں قول معصوم فعل معصوم یا تقریر

معصوم کی نقل کی گئی ہو حدیث کہلاتی ہے۔ قول و فعل کے معنی ظاہر ہیں تقریر کے معنی یہ ہیں کسی دوسرے کے کسی قول یا فعل پر جو معصوم کے سامنے ہوا معصوم کا خاموش رہنا اور رضامندانہ سکوت کرنا۔

یہ بیشک حجت اور واجب العمل ہے۔

ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا۔ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

قرآن مجید کے بعد حدیث کے استناد و اعتبار کے قوی دلائل ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی قرآن مجید کے ساتھ تمسک عترت کا حکم حدیث کے استناد و اعتبار کا کامل ثبوت ہے۔

بےشک حدیث اگر متواتر اور قطعی طریقے سے مثل قرآن مجید کے پہنچے تو وہ بھی قطعی طور پر واجب العمل ہے اور اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے لیکن چونکہ احادیث مثل قرآن مجید کے تواتر کی حد تک پہنچ نہ سکے اور اکثر بطریق آحاد پہنچے جن میں اگر معنوی یا اجمالی حیثیت سے تواتر ہے بھی تو لفظی حیثیت سے نہیں ہے اور اکثر ایسے ہیں کہ جن میں اس قسم کا تواتر بھی نہیں ہے اس لیے کسی خاص حدیث پر عمل اس وجہ پر نہیں کیا جا سکتا جس وجہ پر قرآن مجید کا اور عمل اور کسی حدیث

کی مخالفت اس طرح کفر بھی جا سکتی ہے جس طرح قرآن مجید کی مخالفت۔

حدیث کے مضمون کا انکار اگر اس مضمون کو حدیث رسول اللہ تسلیم کئے ہوئے ہو تو یقیناً موجب کفر ہے لیکن اگر کسی معتبر سے معتبر حدیث کو قول آنحضرت تسلیم ہی نہ کیا گیا ہو تو وہ انکار کتنا ہی غلط اور مکروہ کیوں نہ ہو لیکن موجب کفر نہیں کہا جا سکتا۔ بخلاف قرآن مجید کے کہ اس کی کسی آیت کا انکار اس طرح سے کہنا بھی موجب کفر ہے کہ وہ قول خدا ہے اور میں تسلیم نہیں کرتا اور اس طرح سے بھی کہ وہ قول خدا نہیں ہے لہذا میں تسلیم نہیں کرتا۔

بے شک دلالت یعنی معنی الفاظ کے تعیین میں اختلاف انکار دونوں دونوں میں کھلا ہوا ہے اور یہی بڑے سے بڑے خلاف قرآن و حدیث خیالات کو کفر کی زد سے علیحدہ کر دینے کا ذمہ دار ہے۔

بہرحال سند کے اعتبار سے قرآن و حدیث کے بیچ تفرقہ نے ان میں باعتبار احکام عظیم تفرقہ پیدا کر دیا ہے ورنہ اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم کی روشنی میں دیکھا جائے تو قرآن و حدیث ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں اور ان میں سوائے تقدم و تاخر کے کوئی تفرقہ نظر نہیں آتا۔

مسلمانوں نے بھی اسی حفظ مراتب کے لحاظ کے ساتھ قرآن و حدیث کے متعلق خدمت انجام دی ہے۔

جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں جیسا کہ مولانا عنایت اللہ صاحب سلمہ نے تحریر فرمایا ہے خود قرآن بھی اس حالت میں یعنی مدون نہ تھا تو حدیث کا کیا ذکر۔

حضرت کی وفات کے بعد سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت کا احساس کیا گیا وہ قرآن مجید کی جمع و تالیف اور ترتیب و تدوین تھی جسکو ذمہ داران اسلام نے ہر مقدم سے مقدم کام پر مقدم کیا اور اس خدمت کو انجام دیا۔

قرآن کے بعد حدیث کا درجہ تھا۔ حدیث کی جمع و تالیف کے متعلق صحابہ کرام میں باہم اختلاف رائے ہو گیا۔ اس اختلاف اور اس کے منشاء کو جناب مولانا عنایت اللہ صاحب کے الفاظ میں تحریر کرتا ہوا آگے بڑھتا ہوں۔ آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ صحابہ مذہب میں بدعت سے اس قدر بچتے تھے کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں میں بدعت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ نماز کی جماعت میں جا رہے کو حضرت ابو ایوب انصاری نے فرمایا کہ حضور انورؐ کے زمانے میں آبی تقریبوں میں جانا نہیں ہوتا تھا۔ قرآن کی تدوین پر ایک گروہ صحابہ کو سخت اعتراض تھا۔ روایت حدیث پر سخت احتیاط کی روایت آئی۔ تدوین احادیث میں تو ایک یہی خرابی کا خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ قرآن جو اس وقت تک مروجہ طور پر مکتوب نہیں تھا اور کلام حضرت رسالت پناہی مخلوط نہ ہو جائیں۔ علاوہ اس کے حضور انورؐ سے اس کی ممانعت بھی مروی ہوئی تھی جیسا کہ مسند امام احمد بن حنبل میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ لوگ بیٹھے ہوئے لکھ رہے تھے کہ ناگاہ حضور انورؐ باہر تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ کیا لکھ رہے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا کہ جو کچھ حضورؐ سے سنتے ہیں اسکو لکھتے ہیں۔ حضورؐ نے اس پر سخت ناراضگی کا اظہار فرمایا اور تمام ذخیرہ مکتوب ضائع کر دیا گیا۔ حضرت ابو ہریرہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مشہور ہے کہ اکثر

حدیث پر سزا دی ہے۔ حضرت عمر کا قاعدہ تھا کہ جب کسی کو والی مقرر فرماتے تو منجملہ دوسرے نصائح کے یہ بھی اسکو نصیحت فرماتے کہ دیکھو جن لوگوں کے پاس جا رہے ہو وہ قرآن پڑھنے میں مصروف ہیں اور شب و روز اپنا وقت تلاوت قرآن میں صرف کرتے ہیں ان سے زیادہ حدیثیں بیان کر کے ان کے ذہنوں کو تشویش میں نہ ڈالنا۔ غرضکہ جب روایت حدیث کی یہ صورت ہو تو تدوین و کتابت حدیث کی کیا صورت ہو سکتی ہے!

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا تھا کہ احادیث کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے۔ صحابہ سے اس بارہ میں مشورہ کیا۔ تقریباً سب اصحاب حضرت رسالتمآب نے اس کو پسند کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ مہینہ بھر سوچتے رہے۔ اس کے بعد آپ نے سب کو جمع کر کے فرمایا میرا ارادہ تھا جو تم کو معلوم ہے مگر مجھ کو یہ خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کتاب اللہ کو بالکل ترک کر دو اور یہود و نصاریٰ کے مانند صرف احادیث پر اپنی توجہ مبذول کرو یعنی اس کا نتیجہ یہ ہو جائے کہ قرآن بھی توریت و انجیل کی طرح دلوں سے جاتا رہے اور تحریف کا شکار ہو جائے۔"

پھر تحریر فرماتے ہیں:-

"حضرت عمر ہی کے زمانہ میں جمع حدیث کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی اور تمام صحابہ اسکو جمع کر دینے کی رائے ظاہر کر چکے تھے مگر قرآن کے ساتھ بے توجہی کے خوف سے اس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجبوراً باز

رکھا تھا اور اس کے بعد ہم کو باوجود تلاش پھر کبھی صحابہ کا جمع کی جانب رجوع کرنا نظر نہیں پڑا۔ اگر کہیں احادیث کو بھی قرآن کی طرح خلفائے راشدین نے مدون کر دیا ہوتا تو یقین کیجیے کہ بہت کچھ کیا بلکہ قرآن کی طرح وہ بھی سنت کی صورت سے محفوظ ہو جاتے اور باہمی مسلمانوں میں کثیر فرقہ بندیوں کی ناگفتہ بہ تمام ہو جاتی آج احادیث میں جو جو شبہات اور شکوک اسناد اور الفاظ کے اختلافات کی وجہ سے پیش آتے ہیں وہ ان کی تدوین و جمع کے بعد پیش نہیں آسکتے تھے مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا اور وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی موافقت کر رہی تھی!" انتہی کلامہ

برعکس اس کے جیسا کہ مولانا نے تحریر فرمایا ہے تمام صحابہ جن میں حضرت علیؑ بھی تھے ان کو اس نظریہ سے اتفاق نہیں تھا۔

حضرت علیؑ کا مستقل کلام ہے کہ:۔

قیدوا العلم فی	علمی مطالب قلمبند کرو اور قید
الکتابۃ	تحریر میں لاؤ۔

چنانچہ جہاں تک نظر دوڑائی جاتی ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلی تصنیف حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ملتی ہے جو آپ نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد سے فرمائی تھی اس کا پتہ صحیح امام بخاری سے چلتا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب الفرائض باب اثم من تبرأ من موالیہ

حدثنا قتیبۃ	ابراہیم تیمی کی روایت ہے اپنے
ابن سعید قال	والد سے کہ حضرت علیؑ فرماتے

حدثنا جرير عن الاعمش
حدثنا ابراهيم التيمي عن ابيه
قال قال علي ما عندنا
كتاب نقرأه الا كتاب
الله غير هذه الصحيفة قال
فاخرجها فاذا فيها اشياء
من الجراحات واسنان الابل
قال وفيها المدينة
حرم ما بين عير
الى ثور فمن احدث
فيها حدثا او آوى
محدثا فعليه لعنة الله
والملائكة والناس
اجمعين لا يقبل منه
يوم القيامة صرف
ولا عدل وذمة
المسلمين واحدة يسعى بها
ادناهم فمن اخفر
مسلما فعليه لعنة الله

کہ ہمارے پاس قرآن کے سوا
کوئی کتاب نہیں ہے جسے ہم
پڑھتے ہوں سوائے اس صحیفہ کے
حضرت نے اس صحیفہ کو باہر نکالا
تو دیکھا گیا کہ اس میں کچھ احکام
مختلف اقسام قصاص اونٹوں
کے متعلق ہیں اور اس میں ہے
حدیث ہے کہ مدینہ حرم ہے مقام
عیر سے لیکر مقام ثور تک، جو
شخص وہاں بدعت ایجاد کرے
یا کسی بدعتی کو پناہ دے تو اس پر
خدا، ملائکہ اور تمام خلق کی لعنت
ہے۔ اس سے کوئی سفارش
کسی معاوضہ قبول نہ کیا جائیگا
اور مسلمانوں کی ذمہ داری سب
کی یکساں ہے جس کو معمولی سے
معمولی شخص ان میں کا پورا کریگا
اور جو شخص کسی مسلمان سے غداری
کرے اس پر خدا ملائکہ اللہ

والملئكة والناس اجمعين	تمام خلق کی لعنت ہو اور
لا يقبل منه يوم القيامة	قیامت اس سے کوئی معاوضہ
صرف ولا عدل	اور سفارش قبول نہ ہوگی۔

صحیح مسلم جلد اول کتاب الحج باب فضل المدینہ میں بھی پانچ طریقوں سے اس کا تذکرہ موجود ہے۔ دوسری صدی ہجری تک اس کتاب کا وجود اہل بیتؑ کے پاس ثابت ہے جس کا پتہ محمد ابن الحسن الصفار کی بصائر الدرجات والی روایت سے چلتا ہے جو عبدالملک سے منقول ہے۔ اس میں یہ ہے کہ:-

دعا ابو جعفر بكتاب	"امام محمد باقرؑ نے جناب امیرؑ کی
علی فطواه جعفر مثل	کتاب منگوائی امام جعفر صادقؑ
فخذ الرجل مطويا فاذا	اس کتاب کو لپیٹے ہوئے تھے
فيه ان النساء ليس لهن	اس میں یہ تھا کہ عورتوں کو اپنے
من عقار الرجل اذا توفی	شوہر کی غیر منقولہ جائداد سے کچھ
عنهن شيئ فقال ابو جعفر	نہیں ملیگا۔ امام محمد باقرؑ نے فرمایا
هذا والله خط علی بيده	کہ یہ خدا کی قسم جناب امیرؑ کے قلم کی
واملاء رسول الله الخ	تحریر ہے اور جناب رسالتمآبؐ
وسائل الشيعه	کی لکھوائی ہوئی حدیثیں ہیں"

حضرت ابو رافع جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باختصاص غلام تھے۔ نجاشی نے فہرست اسماء مصنفین شیعہ میں لکھا ہے کہ:-

لابی رافع مولیٰ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
کتاب السنن والاحکام والقضایا

ابو رافع کی تصنیف سے کتاب
سنن و احکام و قضایا
تھی۔

اس کے بعد انہوں نے اس کتاب کے ابواب کو ترتیب وار درج کیا ہے صلوٰۃ، صیام، حج، زکوٰۃ اور سب کے آخر میں قضایا۔ ابو رافع مکہ معظمہ میں ہجرت سے قبل اسلام لائے تھے اور جب آنحضرتؐ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر گئے تو یہ مکہ ہی میں رہ گئے تھے۔ جنگ بدر کے بعد آ کر حضرتؐ سے ملحق ہوئے اور سب سے پہلے جنگ احد میں شرکت کی۔ پھر ہر لڑائی میں حضرتؐ کے ہمراہ رکاب رہے۔

رسالتمآبؐ کی وفات کے بعد باوفا غلام نے رسول کی ڈیوڑھی چھوڑنا گوارا نہیں کیا اور برابر اہل بیتؑ کی صحبت میں رہا۔ جناب امیرؑ کے مخصوصین میں شمار ہوتے اور صفین کی تمام لڑائیوں میں آپ کے ہمراہ شرکت کی۔ کوفہ کے بیت المال کا خزانہ آپ کے متعلق تھا اور اسی زمانہ میں آپ کا انتقال ہو گیا۔

تاریخ کے لحاظ سے یہ سب سے پہلی کتاب تھی جس میں ابواب کی ترتیب کے ساتھ احادیث درج کیے گئے تھے۔ حضرت ابو عبد اللہ سلمان فارسی اور حضرت ابوذر غفاری بھی وہ بزرگ ہستیاں ہیں جنہوں نے حدیث کی تدوین میں حصہ لیا۔ ان دونوں بزرگوں کی تصنیف کا تذکرہ ابن شہر آشوب نے معالم العلماء میں اور شیخ الطائفہ ابو جعفر طوسی و شیخ ابو العباس نجاشی نے اپنی اپنی کتاب فہرست مصنفین میں کتاب سلمان اور کتاب ابوذر کے نام سے درج کیا ہے۔ اور یہ بھی تعلیم سلمانی

تصانیف ہیں جن کے قبل تصنیف کا پتہ نہیں چلتا ہے افسوس ہے کہ یہ کتابیں اسی طرح ناپید ہو گئی ہیں جس طرح وہ احادیث کا غیر مدون مجموعہ جو عبداللہ ابن عمرو ابن العاص نے جمع کیا تھا۔ اور جس کا تذکرہ مولانا عنایت اللہ صاحب اپنے مضمون میں فرما چکے ہیں۔

اس کے بعد دوسرا طبقہ تابعین کا ہے جن میں سے ابو رافع کے دونوں بیٹے علی ابن ابی رافع اور عبید اللہ ابن ابی رافع ہیں یہ دونوں بزرگ جناب امیرؑ کے کاتب یعنی منشی دفتر اور اول الذکر خازن بیت المال بھی تھے۔

علی بن ابی رافع نے ایک کتاب لکھی جس میں وضو، صلوٰۃ اور تمام ابواب میں ترتیب کے ساتھ حضرت امیرؑ کے اسناد سے احادیث کو جمع کیا یہ کتاب بھی سادات اہل بیتؑ کے پاس دوسری صدی تک موجود تھی اور وہ اس کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ موسیٰ بن عبداللہ ابن حسن کا بیان ہے کہ ایک شخص نے میرے والد سے تشہد کے بارے میں سوال کیا۔ انھوں نے کہا "لانا ذرا ابن ابی رافع کی کتاب" جب وہ کتاب لائی گئی تو انھوں نے وہ مقام نکال کر سائل کو لکھوا دیا۔

اصبغ ابن نباتہ مجاشعی: یہ بھی جناب امیرؑ کے مخصوصین میں سے تھے انھوں نے حضرت کا وہ طولانی عہد نامہ مالک اشتر کے نام جو نہج البلاغہ میں موجود ہے نقل کیا۔ اور اسے قلمبند کر لیا نیز حضرت کی طولانی وصیت جو امام حسنؑ کے نام تھی وہ بھی انھی کے ذریعہ سے ہم تک پہنچ سکی۔ سلیم ابن قیس ہلالی: ان کی بھی کتاب مشہور و معروف ہے اس میں انھوں نے حضرت

علی، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار اور بہت سے صحابہ سے روایات نقل کیے ہیں۔ اس کتاب کو علماء نے بڑی قدر کی نظر سے دیکھا ہے مشہور متکلم فقیہہ شیخ محمد ابن محمد نعمان معروف بہ شیخ مفید نے اپنی کتاب الغیبۃ میں سلیم ابن قیس کی کتاب کی ایک حدیث کو نقل کر کے لکھا ہے:۔

لیس بین جمیع الشیعۃ	تمام فرقۂ شیعہ میں ان لوگوں میں
ممن حمل العلم ورواہ عن	کہ جنہوں نے علوم آئمہ کا تحمل
الائمۃ خلاف فی ان کتاب	کیا ہے اس امر میں اختلاف نہیں
سلیم ابن قیس الھلالی اصل	کہ کتاب سلیم بن قیس ہلالی ایک
من کتب الاصول التی رواھا	معتبر کتاب ہے ان قدیم ترین
اھل العلم وحملۃ حدیث	کتابوں میں جن کو حاملان حدیث
اھل البیت واقدمھا	اہلبیتؑ نے روایت کیا ہے۔

ابن ندیم محمد ابن اسحاق نے "کتاب الفہرست" میں بھی اس کتاب کا تذکرہ کیا ہے۔

میثم ابن یحییٰ ابو صالح تمار، امیر المومنینؑ کے خواص اصحاب میں سے، ان کی بھی کتب حدیث میں بڑی بلند پایہ تھی جس سے شیخ ابو جعفر طوسی اور ابو عمرو کشی اور طبری مصنف بشارۃ المصطفیٰ نے اکثر احادیث نقل کیے ہیں۔

میثم تمار سنہ ۶۰ھ میں ابن زیاد کے حکم سے کوفہ میں قتل ہوئے۔

محمد ابن قیس بجلی نے بھی ایک کتاب امیر المومنینؑ سے مرویہ احادیث کی تحریر کی جو بقول شیخ ابو جعفر طوسیؒ امام محمد باقر علیہ السلام کے سامنے پیش ہوئی۔

اور آپ نے فرمایا۔

هذا قول علی ابن ابیطالب — یہ بے شک حضرت علی کے

علیہ السلام — اقوال ہیں۔

اس کتاب کی ابتدا یہ تھی کان یقول اذا صلی تعالیٰ فی اول الصلوٰۃ

یعنی ابن مرۃ اور عبید اللہ بن حر جعفی کی بھی کتابیں امیر المومنین سے روایات کی
کتب رجال میں مذکور ہیں اور ربیعہ ابن سمیع تابعین میں سے تھے۔ ان کی کتاب
زکوٰۃ الانعامؑ کے متعلق تھی۔ ان کا نجاشی نے طبقہ اولیٰ میں مصنفین کے تذکرہ
کیا ہے۔ حارث ابن اعور ہمدانی بھی مشہور صاحب جناب امیر میں جنہوں نے
ایک کتاب میں وہ سوالات جمع کیے ہیں جو کسی یہودی نے جناب امیرؑ سے
کیے تھے اور حضرت نے ان کا جواب دیا تھا۔

یہ لوگ تمام وہ ہیں جو طبقہ متقدمین تابعین میں محسوب ہیں جن میں نہیں کہا
جا سکتا ہے کہ کس کی تصنیف کا زمانہ مقدم ہے اور کس کا مؤخر۔

اس زمانہ میں یہ وہ کتابیں ہیں جن کے علاوہ کوئی دوسرے مصنفات علم حدیث
میں تمام عالم اسلامی کے اندر جستجو سے بھی دستیاب نہیں ہوتے

اس کے بعد کے طبقہ یعنی پہلی صدی کے اواخر میں تو تدوین حدیث کی ضرورت
کا احساس عام طور سے ہو گیا تھا چنانچہ خلیفہ مسلمین بنی امیہ عمر ابن عبد العزیزؒ نے
حدود سلطنت میں جو کہ دارالعلوم موجود تھے ان کو لکھا کہ سنن حضرت رسالت کو
کر ایک جگہ جمع کر دیں کہ تذکرہ مرتا جاتا ہے۔ اللہ صاحب نے فرمایا ہے وہ
لکھا ہے کہ بقول حافظ ابن حجر عسقلانی یہ تدوین حدیث کی اول کوشش تھی
جو عمر ابن عبد العزیزؒ کے عہد میں آئی۔

اس زمانہ میں اہل بیت میں سے امام محمد باقر علیہ السلام کا دریائے علم موجیں مار رہا تھا آپ کی علمی برکات یہاں وہ حقیقت ہیں کہ تمام عالم اسلامی نے متفق طور سے باقر العلم تسلیم کیا علامہ زرقانی تحریر کرتے ہیں۔ المعروف بالباقر لانہ بقر العلم ای شقہ وعرف اصلہ وخفیہ آپ کے اصحاب میں بڑے بڑے حافظین حدیث تھے۔ جیسے جابر بن یزید جعفی جن کے متعلق صحیح مسلم[۱] میں ہے کہ وہ پچاس ہزار حدیثوں کی روایت کرتے تھے جو سب امام محمد باقر علیہ السلام کے طریق سے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک منتہی ہوتی تھیں۔

اور ابان بن تغلب جنہوں نے سلسلہ زین العابدین، امام محمد باقر، امام جعفر صادق تین بزرگوار کے عصر کا ادراک کیا اور خاص امام جعفر صادق سے تیس ہزار حدیثوں کی روایت کی۔ صحیح مسلم اور سنن اربعہ میں ان کی روایت سے احتجاج کیا ہے اور شیخ الاسلام حافظ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان کی وثاقت واعتبار کی گواہی دی ان کے تشیع کے متعلق یہ کہہ کر معذرت کی ہے کہ ان التشیع فی التابعین وتابعیہم کثیر مع التدین والورع والصدق فلو رد حدیث ھولاء لذھب جملۃ من الآثار النبویۃ[۲]۔

ان کی ایک کتاب بھی حدیث میں تھی جو معتبر اصول حدیث سے تسلیم کی جاتی تھی۔ اسی طرح ابو حمزہ ثمالی ثابت ابن دینار، ان کی کتاب النوادر کتاب

---

[۱] صحیح مسلم مطبوعہ نولکشور۔ ج ۱ ص ۱۵

[۲] تشیع تابعین اور تابعین تابعین میں بہت کثرت سے پایا جاتا تھا۔ ایسے افراد میں جو امانت دیانت اور ورع رکھتے ہیں اگر ان کی حدیثوں کو رد کر دیا جائے تو بہت سے آثار رسالت کتب سے فنا ہو جائیں گے۔

الزہرہ رسالہ حقوق میں بہت سے احادیث کا ذخیرہ تھا۔ حافظ ترمذی کی کتاب صحیح میں ان سے روایت موجود ہے علماء رجال نے بھی انکا تذکرہ کیا ہے۔

زرارہ ابن اعین کے متعلق تو ثابت ہے کہ ان کا طریقہ ہی یہ تھا کہ جب وہ امام جعفر صادقؑ کے پاس آتے تھے قلم دوات اور کتاب اپنے ساتھ لاتے تھے اور جو کوئی مسئلہ پیش آتا وہ امام اسکے متعلق حکم رسالت مآبؐ بیان فرماتے اسکو وہ لکھ لیتے تھے۔ کبھی خود سوال کرتے تھے اور اس کا جواب حاصل کرتے تھے اور اس طرح بڑا ذخیرہ قلمبند صورت میں احادیث کا جمع کر لیا۔

زرارہ محمد ابن مسلم، برید عجلی بھی ایسے لوگ تھے جن کے متعلق امام جعفر صادقؑ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ:-

"لولا هولاء لانقطعت احادیث ابی"	اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو میرے والد بزرگوار کے ذریعہ احادیث ختم ہو گئی ہوتیں

برید عجلی کی بھی ایک کتاب حدیث میں تھی جسے ان سے روات محدثین نے نقل کیا۔ امام جعفر صادقؑ کے زمانہ میں اہل بیت کے فیوض علمیہ سے بہرہ مند ہونے والے بڑی کثرت سے ہو گئے تھے۔

شیخ ابو علی طبرسی نے اعلام الوریٰ میں لکھا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے امام جعفر ابن محمد صادقؑ سے بلا واسطہ نقل احادیث کیا چار ہزار آدمی تھے۔ حافظ ابن عقدہ جو فریقین کے کتب رجال میں بڑی مدح و ثناء کے ساتھ مذکور ہوئے ہیں نے صرف ایک مستقل کتاب لکھی کتاب الرجال الذین رووا عن الصادق اور شیخ طوسی نے اکثر کا ان میں سے اپنی کتاب رجال میں ذکر کیا ہے۔

وہ کتابیں جو اس وقت سے لے کر امام حسن عسکری کے عہد تک یعنی ایک صدی کے اندر علم حدیث میں تصنیف ہوئیں چھ ہزار چھ سو کتابیں تھیں جنکی شیخ حر عاملی نے خاتمہ وسائل الشیعہ کے فائدہ رابعہ میں تصریح کی ہے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ علم حدیث ہر زمانہ میں ایسے لوگوں کی مصیبت میں گرفتار رہا جو غلط واقعات بناتے اور بے اصل حدیثیں تراش کر کسی بڑی ہستی کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔

جب حضرت رسول اکرمؐ کو فرمانا پڑا "ستکثر بعدی القالۃ فمن کذب علی متعمدا فلیتبوا مقعدہ من النار"[1] تو دوسرے اماموں کا کیا تذکرہ؟

ائمہ اہل بیتؑ اطہار سے روایت کرنے والے یا تمدا محدثین کو بھی ان منقولین یعنی احادیث کی ساخت وساز کرنے والوں سے بڑی شکایت تھی اور ائمہ اس کے متعلق اپنے اصحاب کو متنبہ کر دیتے تھے۔

مشکل یہ تھی کہ شیعیت کے نام لیوا افراد میں بعض غالی اور اماموں کے متعلق غلط عقیدہ رکھنے والے اشخاص پیدا ہو جاتے تھے جن سے ائمہ اہل البیتؑ خود برائت کرتے تھے لیکن وہ شیعیت کے نام کو پردہ قرار دے کر غلط احادیث کی نشر واشاعت کرتے تھے۔

مغیرہ ابن سعید ایک شخص تھا جس کے متعلق امام جعفر صادقؑ نے فرمایا۔ المغیرۃ بن سعید دس فی کتب اصحاب ابی احادیث لم

---

[1] میرے بعد غلط روایت کرنے والوں کی کثرت ہوگی تو جو شخص میری طرف کوئی غلط حدیث منسوب کریگا اسے اپنی جگہ جہنم میں بنانا چاہیے۔

حدیث بما اتی فاتقوا اللہ ولا تقبلوا علینا ما خالف قول ربنا وسنۃ نبینا (ص)۔

اسی طرح ابو الخطاب ایک شخص تھا غلاۃ میں سے جس پر امام نے لعنت بھی فرمائی تھی اور اس نے طرح طرح کی غلط باتیں ایجاد کیں۔

اس صورت حال کے تدارک کی طرف خود ائمہ معصومین علیہم السلام اور ان کے اصحاب مخلصین پوری طرح سے متوجہ ہو گئے۔ ائمہ نے احادیث کے معیار بتانا شروع کیے اختلاف احادیث کی صورت میں مرجحات بتلائے اور صحیح و غیر صحیح میں تمیز کا طریقہ بتلایا۔ اصحاب نے یہ اہتمام شروع کیا کہ زیادہ تر امام سے خود جا کر احادیث سننے لگے جتنی مصنفہ قلمی کتابیں حدیث کی تھیں ان کو جہاں تک ممکن تھا امام کو دکھاتے اور ان سے تصدیق لیتے کہ اس میں سب روایتیں درست ہیں جیسے عبید اللہ ابن علی حلبی کی کتاب جو امام جعفر صادق کے سامنے پیش ہوئی۔ اور یونس ابن عبد الرحمن اور فضل ابن شاذان کی کتابیں جو امام حسن عسکری علیہ السلام کے سامنے پیش کی گئیں بالخصوص وہ کتابیں جو خوف معاندین سے راویوں نے زمین کے اندر چھپا دی تھیں بعد والے اصحاب نے امام کے سامنے پیش کر کے ان کی تصدیق لی اور آپ نے فرمایا حدثوا بھا فانھا حق " ان کی احادیث کی روایت کرو یہ سب درست ہیں "۔

اس کاوش کے بعد علماء محدثین نے ان تمام کتابوں میں سے جو تصنیف ہوئی تھیں چار سو کتابیں چار سو رواۃ کی منتخب کر لیں جن کو اپنے علم و عمل کا دار و مدار قرار دیا

۱؎ مغیرہ ابن سعید نے میرے والد (ع) کے اصحاب کی کتابوں میں کچھ حدیثیں خفیہ طور سے بڑھا دی ہیں جو میرے والد نے بیان نہیں کی تھیں پس خدا سے ڈرو اور ہماری نسبت قبول نہ کرو ایسی حدیثیں جو قول خدا اور سنت رسول (ص) کے خلاف ہوں۔

کتابیں "اصول اربعمائۃ" کے نام سے مشہور تھیں جو بعد کے لوگوں میں بڑے بڑے جوامع حدیث کی تصنیف کا سرمایہ قرار پائیں۔

ان کتابوں میں سے جن کا سلسلہ اول سے لے کر اس وقت تک تذکرہ ہے اور جو موجود ہیں صرف کتاب سلیم ابن قیس ہلالی اور بعض "اصول اربعمائۃ" کا وجود باقی ہے جن کو محدث میرزا حسین نوری مصنف مستدرک الوسائل نے بڑے قدیم نسخوں سے نقل کر کے حاصل کیا تھا اور اپنی کتاب مستدرک کا ماخذ بنایا۔ ان سے پھر آیۃ اللہ آقا سید حسن صدر کاظمینی مرحوم مقیم کاظمین اور آقا میرزا محمد طہرانی مقیم سامرہ نے ان کی نقل حاصل کی اور ان میں سے بعض کی ہم نے بھی نجف اشرف میں نقل حاصل کر لی۔

ائمہ کا دور گزر گیا، غیبت کا زمانہ آیا۔ اب جو دشواریاں زیادہ پیدا ہو گئی تھیں چھوٹی چھوٹی کتابیں جو سیکڑوں کی تعداد میں تھیں ان سب میں اگرچہ احادیث کا تمام ذخیرہ موجود تھا لیکن کثرت کتب کا لازمی نتیجہ انتشار ہے اور اس سے ضیاع و تلف کا اندیشہ یقینی ہے۔ اسی وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی کہ یہ تمام متفرق کتابیں ایک یا چند بڑی کتابوں میں مجتمع ہو جائیں۔ سب سے پہلے ثقۃ الاسلام ابوجعفر محمد ابن یعقوب کلینیؒ نے چوتھی صدی کے اوائل میں اس خدمت کو انجام دیا اور بیس برس کی مسلسل جانفشانی اور محنت میں کتاب کافی کی تصنیف کی۔ دیباچہ کتاب میں سبب تالیف تحریر فرماتے ہوئے صاف ظاہر کیا ہے کہ اس کتاب میں صحیح اخبار جمع کیے جائیں گے جو تمام علوم و معارف دینیہ کو شامل اور ہر حیثیت سے کافی ہوں۔ کتاب کافی کا نام بھی اسی لحاظ کی مناسبت سے "کافی" قرار پایا ہے اور چونکہ اس میں اصول و عقائد کے احادیث کا

ایک حصہ مستقل اور فروع یعنی مسائل شرعیہ کا حصہ مستقل تھا اس لیے پہلا حصہ "اصول کافی" اور دوسرا حصہ "فروع کافی" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام شیعی جوامع حدیث میں کافی کا درجہ سب سے مقدم مانا گیا ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کی ہر ہر حدیث صحیح السند اور قطعی الورود ہے۔ ہم حدیث کی کسی کتاب کو قرآن مجید کی طرح معصوم اور جرح و تعدیل کے میزان اعتبار سے بلند نہیں سمجھتے ہیں۔ کافی کا تقدم و شرف صرف اس اعتبار سے ہے کہ اس میں نقل روایات میں انتہائی ضبط و اتقان سے کام لیا گیا ہے۔ سندیں پوری نقل کی گئی ہیں۔ روایات کے ٹکڑے نہیں کر دیے گئے ہیں۔ روایات میں اپنے تفسیری ارشادات نہیں درج کیے ہیں جو اصل الفاظ حدیث کے ساتھ مشتبہ ہو جائیں۔ پوری سندیں نقل کر دینے کا منشاء ہی یہ ہے کہ مصنف نے اپنے اوپر سے ذمہ داری ہٹالی ہے اور ان رواۃ کے حالات و اعمالات کو جانچ لینے کا موقع دیا ہے۔

یہ خیال کہ یہ کتاب امام عصر حضرت امام ثانی عشر کے پاس پیش ہوئی اور حضرت نے فرمایا ھٰذا کاف لشیعتنا ایک ایسی فرضی حکایت ہے جس کا کوئی ثبوت کتب احادیث و رجال میں نہیں ہے چنانچہ محدث امین استرآبادی نے کتاب کافی کے استناد و اعتبار کو انتہا درجہ تک پہنچاتے ہوئے تحریر کیا ہے:۔

لیس عن ذہنی مستن	میرا مقصد اس سے یہ نہیں
ذلک تصحیح الخبر الشائع	ہے کہ میں اس روایت کی

من ان هذا الكتاب
عرض على الحجة عليه السلام
فقال ان هذا كاف لشيعتنا
فانه لا اصل له ولا اثر له
في مؤلفات اصحابنا
بل صرح بعدمه المحدث
الاسترابادي الذي
رام ان يجعل تمام احاديثه
قطعية لما عنده من
الطرائق التي
لا تنهض له تلك ومع
ذلك صرح
بانه لا اصل
له.

صحت ثابت کروں جو عام
طور سے مشہور ہے کہ یہ کتاب
حضرت حجت کی خدمت میں
پیش ہوئی اور حضرت نے
فرمایا کہ "یہ کافی ہے ہمارے
شیعوں کے لیے" کیونکہ یہ
روایت بالکل بے اصل ہے
اس کا نام و نشان بھی
ہمارے کتب امامیہ میں نہیں
ہے بلکہ محدث استرآبادی نے
بھی کہ جو کافی کی تمام احادیث کو
بعض غیر مستند قرائن کی بنا پر
قطعی ثابت کرتے ہیں کہ شامل
ہیں انھوں نے بھی اس روایت
کے متعلق لکھ دیا ہے کہ اس کی
کوئی اصل نہیں ہے۔

اس بنا پر ہم کافی کی حدیث بھی آنکھ بند کر کے قبول نہیں کر لیتے بلکہ استنباط و اجتہاد کے موقع پر کافی کی حدیث کی اسی طرح جانچ کرتے ہیں جس طرح دوسرے کتب حدیث کی۔

ان کا دیباچہ میں یہ لکھ دیا کہ میں اخبار صحیح جمع کروں گا اس کے معنی صرف مستفتی ہوتے ہیں کہ ان کی نظر میں جو روایات درج کیے ہیں وہ معتبر اور قابل اطمینان ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمارے لیے بھی ایسی ہی ثابت ہو سکتے ہوں۔ اس لیے کہ ہم سوائے معصوم کے کسی رائے کو اپنے لیے بالکل حجت اور ناقابل شک و شبہ نہیں سمجھتے۔ بے شک کافی کی حدیثوں میں ہم کو اضطراب سند و متن وغیرہ کی دشواریوں سے دوچار نہیں ہونا پڑتا اس لیے کہ اس میں نقل احادیث کے سلسلہ میں انتہائی ضبط سے کام لیا گیا ہے اور یہی خصوصیت وہ ہے جس نے اس کو دوسرے تمام جوامع حدیث میں ممتاز درجہ عطا کر دیا ہے۔

دوسرے بزرگ جنھوں نے اس خدمت کو انجام دیا شیخ صدوق محمد ابن علی ابن بابویہ قمی ہے جنھوں نے کتاب من لا یحضرہ الفقیہ تالیف کی اس میں انھوں نے دیباچہ میں ضرور تحریر کیا ہے کہ میں اس میں وہی روایات درج کروں گا جن کے مطابق میں فتویٰ دیتا ہوں اور اپنے اور خدا کے درمیان ان کو حجت سمجھتا ہوں لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے وہ پورے طور سے اس پر قائم نہیں رہے ہیں۔ انھوں نے ایسی روایتیں بھی درج کر دی ہیں جن کی باتیں خود رد کرنا پڑی ہے۔ انھوں نے پوری سندیں بھی نقل نہیں کیں بلکہ صرف آخری راوی کا نام لکھ دیتے ہیں جس نے امام سے روایت کی ہے۔ پھر ختم کتاب کے بعد انھوں نے ایک فہرست اپنے مشائخ کی لکھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ کس راوی کی طرف ان کا طریق کیا ہے اس لیے انسان کو کتاب

مسن لا یحضرہ الفقیہ کے ساتھ اس فہرست مشیخہ من لا یحضر پر نظر رکھنا ضروری
ہے اور ہر روایت کی جانچ کے موقع پر اس پر نظر ڈالنا لازمی۔

یہ ایک بڑی سر مغزی کا کام ہے جس سے دشواری پیدا ہو گئی ہے نیز
اس میں روایات کے بیان کے سلسلہ میں کہیں کہیں تفسیری شرح ایسی آ گئی
ہے جس کے متعلق دھوکا ہو جاتا ہے کہ یہ امام کا کلام تو نہیں ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر یہ کتاب استنادی اعتبار اور حسن ترتیب تالیف میں
ممتاز ہونے کے باوجود کافی کی ہم پلہ تسلیم نہیں کی گئی۔

پانچویں صدی ہجری میں شیخ الطائفہ محمد ابن الحسن الطوسی نے کتاب تہذیب
اور کتاب استبصار تصنیف کی۔ تہذیب کی ترتیب اور اس کا طرز تدوین واقعی
بہت اچھا ہے مگر سند اتنی ضبط کے ساتھ اس میں نہیں ہے جس طرح کافی
میں ہے اس میں کہیں تو کافی کی طرح پوری سند نقل کی ہے اور کہیں
من لا یحضرہ الفقیہ کی تعقیب کی گئی ہے اور مشیخہ کی فہرست بھی جو آخر میں دی
گئی ہے مکمل نہیں ہے اس لیے اکثر انسان کو تعیین سند میں خود وضع
اور قرائن و ظنون سے کام لینا پڑتا ہے۔

علماء کا خیال ہے کہ اس کے لیے کافی اور تہذیب دونوں چیزیں ایسی
ہیں کہ ایک کی ضرورت دوسرے سے پوری نہیں ہوتی۔ کافی میں حدیثیں
فقہ اور غیر فقہ دونوں شعبوں کے متعلق ہیں لہٰذا وہ تہذیب سے
زیادہ جامع ہے اور تہذیب میں فقہ کی حدیثیں کافی سے زیادہ ہیں
اس لیے یہ زیادہ جامع ہے۔

استبصار درحقیقت صرف کتاب جامع احادیث ہی نہیں بلکہ جس میں
متعارض حدیثیں درج کرکے ان میں جمع ، ترجیح ، تاویل کے فرائض
انجام دیے گئے ہیں جو خالص ایک فقیہ اور مجتہد کا فرض ہے ۔
یہی چاروں کتابیں وہ ہیں جو کتب اربعہ کے نام سے یاد کی جاتی ہیں
کافی کی حدیثوں کی تعداد سولہ ہزار ننانوے (۱۶۰۹۹) اور من لایحضر کی
حدیثیں نو ہزار چوالیس (۹۰۴۴) اور تہذیب تین سو ترانوے ۳۹۳ ابواب پر مشتمل ہے
جس میں تیرہ ہزار پانچسو نوے (۱۳۵۹۰) حدیثیں اور استبصار میں نو سو بیس ۹۲
ابواب جن میں پانچ ہزار پانچسو گیارہ (۵۵۱۱) حدیثیں ہیں۔
اسے حسن اتفاق کہو یہ عجیب بات ہے کہ ان تمام مصنفین جوامع
کا نام محمد اور کنیت ابوجعفر تھی۔
مصنف کافی ابوجعفر محمد ابن یعقوب کلینی، مصنف من لایحضر ابوجعفر محمد
ابن علی ابن بابویہ قمی۔ مصنف تہذیب و استبصار ابوجعفر محمد ابن الحسن
الطوسی تھے۔ اسی وجہ سے علماء اجازات جب ان کتابوں کا تذکرہ کرتے
ہیں تو فرماتے ہیں الکتب الاربعۃ لابی جعفرین المحمدین الثلثۃ
المتقدمین اور اس حسن اتفاق میں اضافہ یہ ہے کہ متاخرین میں سے
بھی دو حضرات جنہوں نے مشہور جوامع حدیث کی تصنیف کی ان کا بھی
نام محمد تھا جن کا تذکرہ ابھی آئے گا۔
شیخ صدوق کے علاوہ من لایحضر کے ۲۹۹ اور تصانیف خاص علم
حدیث میں تھے جن میں سے ثواب الاعمال، عقاب الاعمال، مدینۃ العلم

وغیرہ وغیرہ مشہور کتابیں ہیں۔ یہ متاخرین علماء کا مستند ہیں یا جن کی کی ان میں سے وسعت و جامعیت کے اعتبار سے من لا یحضرہ کے درجہ تک نہ تھی۔

جس قدر رسالت مآبؐ و ائمہ کا دور قریب تھا۔ تحقیق کے ذریعے زیادہ اور وثوق و اطمینان کے اسباب فراہم تھے۔ سابق زمانہ کے لوگوں کے لیے اکثر حدیثیں ایسے قرائن کے ساتھ مقرون ہوتے تھے جن کی وجہ سے اگرچہ سادی خبر کے ضعیف ہوں لیکن انھیں اصل خبر کے متعلق وثوق و اطمینان ہوتا تھا اور اس اعتبار سے وہ اسکو صحیح کہتے تھے۔ اکثر اخبار ان کے لیے قطعی یا موثوق بالصدور تھے جس میں ان کو راویوں کی طرف نظر ڈالنے کی ضرورت ہی نہ پڑتی تھی۔ بہت پہلے کے قدماء کا کیا ذکر سید مرتضیٰ علم الہدیٰ تک جو چوتھی صدی کے اواخر میں تھے اخبار احاد پر عمل کی اجازت نہیں دیتے اور فرماتے ہیں کہ متواتر حدیثیں اتنی موجود ہیں جو تمام مسائل شرعیہ میں کافی ہوسکتی ہیں اور ان کے بعد احاد پر عمل کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

شیخ الطائفہ محمد ابن حسن طوسی جو ان کے شاگرد تھے متواتر ہونے کے تو قائل نہیں مگر اتنا ضرور فرماتے ہیں کہ یہ حدیثیں جو مشہور و مستند کتابوں میں موجود ہیں ان کے متعلق قرائن کے ذریعہ سے ہمیں صحت کا علم قطعی ہے ان حضرات کی دیکھا دیکھی ابن ادریس حلی تک جو ساتویں صدی ہجری میں تھے کہتے گئے کہ متواتر ہی پر عمل ہونا چاہیے احاد کی ضرورت نہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ زمانہ کے امتداد کے ساتھ جتنا جتنا عہد معصوم کو بعد ہوتا جاتا دشواریاں زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہیں اس لیے جو چیزیں قدماء کے لیے قطعی

تھیں وہ متاخرین کے لیے مظنون اور ہمارے لیے مظنون تھیں وہاں سے لیے موہوم بن گئیں

صدیوں کے حائل ہو جانے سے خارجی قرائن معلومات غائب ہو گئے اور وہ وثوق بالصدور یا اطمینان جو قرائن کی بنا پر سابق کے لوگوں کو حاصل تھا۔ اب تو ہم ہی اور سند اور اس کے رواۃ کا استناد و اعتبار جس کا نتیجہ تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں صحیح، حسن، موثق، ضعیف کی اصطلاح قرار دی گئی اور رواۃ کی جرح و تعدیل کی بنیاد پڑی۔ اکثر علماء کی تحریر کے مطابق اس اصطلاح کی بنیاد علامۂ حلی کی ڈالی ہوئی ہے۔ محدث استر آبادی نے فوائد مدنیہ میں اسے مشکوک صورت سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں علامۂ حلی یا کوئی ان کا ہم عصر۔

ہمارے شیخ حدیث خاتمۃ المحدثین مولانا سید حسن صدر نے تحریر فرمایا ہے کہ اس تقسیم کے موجد سید جمال الدین احمد بن طاؤس ہیں جنہوں نے ۶۷۳ھ میں وفات پائی۔

اب روایات کی جرح کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ شیخ حسن ابن زین الدین شہید ثانی مصنف معالم نے کتاب منتقی الجمان فی الاحادیث الصحاح والحسان تحریر کی۔ افسوس ہے کہ یہ کتاب عام طور سے دستیاب نہیں ہوتی اور ابھی تک ہماری نظر سے نہیں گزری۔ اب متاخرین کا دور آ گیا تھا۔ گیارھویں صدی میں محمد ابن مرتضیٰ مشہور بہ ملا محسن فیض کاشانی نے جو اس اصطلاح کے طرز پر کافی، فقیہ، تہذیب، استبصار چاروں کتابوں کے احادیث کا مجموعہ وافی کے نام سے تحریر کیا جس میں مشکل احادیث کا بیان اپنی حل بھی اپنے مخصوص مسلک اور

مذاق کے مطابق تحریر کیا ہے۔ موصوف کا مسلک اصول عقائد میں تصوف و عرفان کی طرف مائل اور فقہ میں اخباریت کی طرف راجح تھا۔

محمد مذہب شیعہ ملا محمد باقر مجلسیؒ نے انتہائی کد و کاوش اور وسعت نظر و تتبع کے ساتھ کتاب "بحار الانوار" ۲۶ جلدوں میں جمع کی جس میں کتب اربعہ کے علاوہ سینکڑوں کتابوں سے ہر شعبہ کے متعلق احادیث کو جمع کیا اس میں شبہ نہیں کہ وسعت و جامعیت کے اعتبار سے بڑا کام کیا اور ایک تجسس شخص کو تمام روایات کسی بحث کے ایک ہی مقام پر دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن یہ ماننا ناگزیر ہے کہ موصوف نے نقل احادیث میں احتیاط سے کام نہیں لیا ہے اور اسی لیے بحار میں رطب و یابس سب کچھ نظر آتا ہے۔ اور اس کی بحار سے یہی "چیز" کی تجسس کے لیے قدماء اصحاب نے اصول اربعمائۃ کا انتخاب اور محمدین قدماء نے کتب اربعہ کی تدوین کی تھی تاکہ غیر مستند روایات کا ذخیرہ ہمارے احادیث میں مخلوط نہ ہونے پائے اس جامعیت کتاب کی فکر نے اس مقصد کو نظر انداز کر کے نقد و بحث کی گنجائش پیدا کر دی۔

اس زمانہ میں شیخ محمد ابن الحسن الحر العاملی نے صرف فقہ کے متعلق احادیث کو علاوہ کتب اربعہ کے ۷۰ سے زیادہ اصول اور کتب سے تلاش کر کے انتہائی جستجو کے ساتھ کتاب "وسائل الشیعہ" تصنیف کی جو بے شک بہترین جامع احادیث کتاب ہے۔ اس کتاب نے ایک فقیہ متجسس احادیث کو کتب اربعہ اور ان تمام کتابوں سے جو اس سلسلہ میں قابل توجہ تھیں مستغنی کر دیا اور ہر حدیث پر کہ سند اپنی صحیح کر دی گئی ہے اور مکمل حوالہ منقول عنہ کا درج ہے لیکن "شبہ عیب نمانت خدا کی" اس میں ایک ایسی بات ہو گئی جس سے اختیار اصل ماخذ وں

کے دیکھنے کی پھر بھی آئی ہی وہ یہ ہے کہ مصنف نے احادیث کو مناسب
ابواب میں درج کرنے کے لیے تقطیع اختیار کر دی یعنی اگر کوئی حدیث ایسی ہے
جس میں ابتدائی حصہ کتاب النکاح سے متعلق ہے۔ وسطی کتاب الطلاق
سے آخری مثلاً کتاب الظہار سے تو وہ اس روایت میں تین ٹکڑے کر دیتے
ہیں پہلا ٹکڑا پہلی کتاب میں، دوسرا دوسری کتاب میں اور تیسرا تیسری
کتاب میں۔ اس میں ظاہر میں کوئی نقصان تو نہیں معلوم ہوتا لیکن حقیقتاً
جیسے حدیث کے معنی کھلتا اور اس سے کوئی نتیجہ نکلتا ہوتا ہے وہ اس کی
خرابی کو محسوس کرتا ہے۔ اس کا ایک اثر تو سند کے اوپر پڑا کہیں روایت
میں انتشار پیدا ہو جاتا ہے۔

مثلاً اس روایت کو لیجئے جس میں امام کا نام دو جگہ سے حدیث
منقول ہے بلکہ متن کا لفظ ہو۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ حدیث طوالت میں اس طرح
میں امام کا نام موجود تھا لیکن درمیان میں پھر ضمیریں مذکور تھیں تقطیع ہوئی تو
پہلا ٹکڑا جہاں گیا وہاں تو نام موجود ہے لیکن بعد کے ٹکڑے جہاں
جہاں گئے وہاں انتشار پیدا ہو گیا۔

اس کے علاوہ یہ کہ اکثر مطالب اجزائے حدیث کے آپس میں
دست و گریبان ہوتے ہیں۔ وہ ٹکڑے جو مصنف وسائل نے باہم
غیر متعلق خیال کیے ہیں ضروری نہیں کہ غیر متعلق ہی ہوں وہ عالم تھے
سہی لیکن معصوم نہیں تھے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اکثر معنی میں خرابی
پڑتی ہے اور خلط مبحث ہو جاتا ہے۔

بہت بڑی خدمت ہوگی اگر کوئی شخص وسائل کی حدیثوں کا اصل

کتب منقول عنہا سے مقابلہ کر کے مواضع تقطیع کو معین کر دیتا اور متفرق
حدیثوں کے ٹکڑوں کا پتہ لگا کر یکجا کر دیتا تو پھر یہ کتاب وسائل ایک ایسا
ذخیرۂ حدیث تھا جس کی موجودگی میں کسی دوسری کتاب حدیث کی ضرورت
نہیں ہے۔ وسائل میں تمام ابواب فقہ کے متعلق ایسا ذخیرہ جمع کر دیا ہے
کہ بھی جستجو کے بعد بھی اس سے زیادہ دستیاب نہیں ہوتا اگرچہ اس چودھویں
صدی کے اوائل میں مشہور محدث میرزا حسین نوری نے مستدرک الوسائل
کے نام سے تین ضخیم جلدوں میں ایک مجموعہ احادیث تصنیف فرمایا جو ان کا
سب سے بڑا کارنامہ سمجھا جا سکتا ہے لیکن فائدہ کے اعتبار سے اسے
کوئی خاص اہمیت دیے جانے کا استحقاق نہیں حاصل ہوا اس لیے کہ ایک تو
جن کتابوں سے فاضل نوری نے اس کتاب کی تدوین کی وہ استناد و اعتبار
میں کسی طرح صاحب وسائل کی منقول عنہا کتابوں کے مقابل نہیں ہیں ان
میں سے اکثر کتابوں کے متعلق علماء کی طرف سے قدح موجود ہے اور ان کے
رواۃ بھی مجروح ہو چکے ہیں اور محدث نوری کو ان کے استناد پر بحث کے
سلسلہ میں صفحے کے صفحے سیاہ کرنا پڑے ہیں۔ بعد کو چاہے ان کی تعدیل ثابت
بھی ہو لیکن یقیناً اس اختلاف و بحث سے ان کتب کی متفق علیہ حیثیت
باقی نہیں رہتی اور یہ ان کی ایک حد تک کمزوری کی دلیل ضرور ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ اس مستدرک میں جو کچھ ہوا ہے وہ صرف اتنا کہ
کسی خاص مسئلہ کے متعلق صاحب وسائل نے دو حدیثیں مثلاً نقل کی تھیں صاحب
مستدرک نے دو اور ملحق کر دیں لیکن نفس مسائل اور فروع فقہیہ کے متعلق وہ کچھ
اضافہ کر سکے ہوں یعنی کچھ ایسے احادیث نقل کر سکے ہوں جن کے مندرجہ

مضامین و احکام وسائل کی مندرجہ احادیث کے احکام سے کچھ زائد ہوں ایسا نہیں ہے۔

اس لیے مستدرک اپنے مصنف کے تتبع اور وسعت اطلاع کی دلیل ہو سکتی ہے اور اس کے مصنف کی جانکاہی و محنت کی داد دی جا سکتی ہے لیکن کسی مجتہد کو استنباط کے وقت وسائل کے دیکھنے کے بعد مستدرک کو نکال کر مطالعہ کرنے کی ضرورت پڑے؟ ایسا نہیں ہے۔

یہ جوامع حدیث وہ ہیں جن کو خاص شہرت حاصل ہوئی ان کے علاوہ بھی اس آخری چند صدی کے دور میں بعض کتابیں تالیف ہوئی ہیں۔ جن کا پتہ جناب سید حسن صدر دام ظلہ' کی کتاب "الشیعہ و فنون الاسلام" میں موجود ہے ان میں سب سے زیادہ مشہور کتاب عوالم ہے جو علامہ مجلسیؒ کے ہمعصر لا عبد اللہ ابن نور اللہ بحرانی کی تالیف تھی۔ اس کا صرف وہ حصہ جو واقعات کربلا سے تعلق رکھتا ہے "مقتل عوالم" کے نام سے شائع ہوا ہے لیکن حقیقت میں یہ کتاب ۱۰۰ جلدوں پر مشتمل تھی جن کا مجھے تو پتہ نہیں معلوم کہ کہاں ہیں۔ شیخ قاسم ابن محمد بن جواد معروف بابن وندی و فقیہ کاظمی جو صاحب وسائل کے ہمعصر تھے انھوں نے شرح الاستبصار فی احادیث الائمۃ الاطہار تصنیف کی جو متعدد مجلدات پر مشتمل تھی اور اسی طرح شیخ عبد اللطیف ابن علی بن احمد بن ابی جامع حارثی عاملی کی کتاب جامع الاخبار فی ایضاح الاستبصار متعدد جلدوں میں اور شیخ محمد رضا ابن شیخ عبد اللطیف تبریزی کی کتاب "شفائی حدیث آل المصطفےٰ" اور سید عبد اللہ ابن سید محمد رضا شبر بلخی کی کتاب جامع الاحکام جو ۲۵ جلدوں میں ہے اور علامہ مجلسیؒ کی بحار کے

لیکن جس سے زیادہ مبسوط تصنیف تحریر نہیں ہوئی ہے کتاب کافی کی شرحیں بہت سے علماء نے لکھیں جن میں سے ملا صالح مازندرانی اور میرزا خلیل قزوینی کی دونوں شرحیں اور علامہ مجلسیؒ کی مرآۃ العقول خاص شہرت کی مالک ہیں۔ صدر المتالہین شیرازی نے بھی ایک شرح کافی کی لکھی تھی مگر وہ ان کے خاص فلسفیانہ مذاق پر تھی جس کو علم حدیث کی بارگاہ میں کوئی قبولیت حاصل نہ ہوسکی۔ من لا یحضرہ الفقیہ کی شرح ملا محمد تقی مجلسی نے لکھی جسے کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ تہذیب کی شرح سید نعمت اللہ جزائری نے لکھی جو مبسوط اور کثیر الفوائد ہے۔

موجودہ زمانہ میں آیۃ اللہ سید حسن صدر دام ظلہ جن سے پہلو کا اس فن کا غواص اب کوئی موجود نہیں ہے انھوں نے وسائل کی شرح اس انداز پر لکھنا شروع کی جس کی نظیر اس کے قبل نایاب ہے۔ وہ حدیث کو ذکر کر کے اسناد، طرق، علل، معنی کے عنوان قائم کر کے ہر روایت کے رجال روایت نقد معنی تمام جہات کی تنقید کن شرح لکھتے اور کتب ہی کے ساتھ مختلف تحقیق صحیح کرتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا سلسلہ ابھی ثلث طہارت تک جب موصوف کے قوائے عمل جواب دے چکے ہیں اتنی بیس کی عمر میں اتنی بڑی خدمت کہاں انجام پاسکتی ہے

نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۰ جلدیں صرف کتاب الطہارۃ کی شرح میں پایۂ تکمیل کو پہنچیں اس کے بعد احتمالی ضعف پیری اور امراض و عوارض سے تصنیف کا سلسلہ ہی منقطع ہو گیا اور اتمام ممکن نہ ہوا بہر حال صدر صاحب نے سنگ بنیاد قائم کر دیا ہے

اور کوئی خدا کا بندہ خدا کی توفیق شامل حال ہو تو اس کی تکمیل کر دے،
کوئی تعجب نہیں ہے۔

یہ وہ خدمات تھے جو براہ راست علم حدیث کے سلسلہ میں کیے گئے
متعلقات حدیث میں علم درایت و رجال ہے۔ درایت میں سب سے پہلی تصنیف
ابو عبداللہ حاکم نیشاپوری کی ہے جنہوں نے "معرفۃ علوم الحدیث" کے نام
سے ۵ حصوں میں کتاب تصنیف کی۔ ان کے بعد علمائے شیعہ میں سے سید
جمال الدین ابو الفضائل احمد ابن طاؤس ہیں جنہوں نے بقول آقا سید حسن صدر
صحیح، حسن، موثق، ضعیف کی اصطلاح قائم کی۔

علامہ حلی کے شاگرد سید علی ابن عبد الحمید حسنی نے شرح اصول درایۃ الحدیث
تصنیف کی۔ اور شہید ثانی نے کتاب البدایۃ، شیخ حسین بن عبد الصمد حارثی والد
شیخ بہائی نے وصول الاخیار الی اصول الاخبار اور شیخ بہاء الدین عاملی نے
وجیزہ تحریر کیا۔ آخر الذکر کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ متعدد علماء نے اس کی
شرح تصنیف کی۔ ہمارے ہندوستان ہی میں تاج العلماء سید علی محمد صاحب قبلہ
طاب ثراہ نے اس کی تین شرحیں لکھیں، ایک مختصر دوسری متوسط، پہلی
عزیزہ فی شرح الوجیزہ تیسری بڑی مبسوط "سلسلۃ الذہب"۔ مولانا محمد حسین
صاحب الہ آبادی اعلی اللہ مقامہ نے صفائح الابریز فی شرح الوجیز بھی
شرح لکھی۔ اور خاتمۃ المحدثین آقا سید حسن صدر دام ظلہ نے کتاب نہایۃ الدرایہ
تحریر فرمائی جو مبسوط اور نہایت کثیر الفوائد ہے۔

علم رجال میں سب سے پہلے مصنف ابو عبداللہ ابن محمد بن خالد برقی ہیں۔

یہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے اصحاب میں سے دوسری صدی ہجری میں تھے
ان کی کتاب رجال کا تذکرہ ابن ندیم نے فہرست میں کیا ہے یہ نہایت خوشی کی
بات ہے کہ ان کی کتاب رجال اس وقت تک موجود ہے۔ ابو جعفر یقطینی جو امام
محمد تقی علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے انھوں نے رجال میں کتاب لکھی اور
اس کا بھی ذکر فہرست نجاشی اور فہرست ابن ندیم میں موجود ہے۔ ابو محمد عبداللہ
بن جبلہ بن حیان بن ابجر کنانی نے کتاب رجال تصنیف کی۔

چوتھی صدی ہجری میں شیخ ابوالحسن محمد بن احمد بن داؤد قمی نے کتاب
الممدوحین والمذمومین من الرواۃ لکھی اور شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی
نے کتاب معرفۃ الرجال اور کتاب الرجال المختارین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ و
آلہ وسلم اور شیخ ابوبکر جعابی نے کتاب الشیعہ من اصحاب الحدیث وطبقاتہم یہ معروف
مشہور تصانیف تھے لیکن ان تمام کتابوں میں جو اس کے بعد سے اب تک تصنیف
ہوئیں جن کتابوں نے بقاء دوام کی سند حاصل کی وہ رجال ابو عمرو کشی اور فہرست
مصنفین شیعہ النجاشی اور شیخ طوسی کی کتاب رجال اور کتاب فہرست اور علامہ حلی
کی کتاب خلاصۃ الرجال اور ان سب کا مجموعہ اور منہج المقال مشہور بہ رجال کبیر
مولانا محمد استرآبادی جس کے دیکھنے کا بار ہر انسان نے صاف محسوس کیا اور اصل کتاب
انسان پر شاق گذرے کر علامہ ابو علی حائری نے کتاب منتہی المقال تصنیف کی جس میں اگر
تعصب نہ ہوتا کہ محققین کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تو بہترین کتاب تھی بہرحال
اس میں شبہ نہیں کہ منتہی المقال کے بعد پھر اس پایہ کی کوئی کتاب بسیط طویل
موجودہ دور تک تصنیف نہیں ہوئی۔

بے شک اب بالکل قریبی دور میں ہمارے شیخ الحدیث آقا شیخ عبداللہ مامقانی نجفی طاب ثراہ نے ایک مبسوط ترین کتاب رجال پر تصنیف فرمائی ہے جس میں ہر راوی کے متعلق بالکل کتب رجالیہ کے اقوال پر نقل اقوال کرتے۔ ہر ایک کے دلائل ذکر کرتے اور پھر محاکمہ کرتے ہیں۔ اسکی تصنیف میرے سامنے ہی شروع ہوئی اور میرے ہی سامنے ختم ہوئی اور میرے ہی سامنے چھپنا شروع ہوئی اور اب وہ مکمل تین جلدوں میں طبع ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ کتاب علم رجال کی تمام دوسری کتابوں سے مستغنی کر دینے والی ہے۔

علم حدیث کے متعلق دو کام ابھی کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ تمام جوامع حدیث میں سے جن میں میرے خیال میں وافی و وسائل بالکل کافی ہیں ہر حیثیت سے جو قابل احتجاج و استناد احادیث ہیں ان کا انتخاب کرکے مجمع کر دیا جائے جس کے روایات بالکل مستند اور معتبر اور معمول بہ حیثیت رکھتے ہوں۔ دوسرے ما لا یحتج بہ من الاخبار کے لیے تمام سے ایسے روایات جن سے تمسک کرنا درست نہیں ہے بیان وجہ ضعف و عدم استناد کے ساتھ تحریر کر دیے جائیں۔

اگر یہ دونوں کام ہو جائیں تو بہت ایسی غلطیاں جو بے محل روایات کے پیش کرنے سے پیدا ہوتی ہیں ان کا سدباب

ہو جائے گا۔

تیسرا کام اور ہے جو تدوین حدیث سے خاص متعلق کام نہیں ہے لیکن اس حیثیت سے تعلق رکھتا ہے اور وہ فقہ الحدیث کی تصنیف ہے جس میں مشکلات معانی احادیث کا صحیح حل مکمل صورت سے تحریر کیا گیا ہو۔ اس کام کے لیے بڑی توفیق الٰہی کی ضرورت ہے اور جس کے یہ توفیق شامل حال ہوگی اس کے ہاتھ سے انجام پائیں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیثِ حوض

(سوال جناب سید باور حسین صاحب جونیئر اسسٹنٹ کیمسٹ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ)

مجھے جناب سے حدیث حوض کے متعلق دریافت کرنا ہے جس کے لیے صحیح مسلم اور صحیح بخاری کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ جس کے شاید لفظی معنی یہ ہیں:—

"میں حوضِ کوثر پر جب جاؤں گا تو میرے اصحاب بھی میرے پاس آ کر کھڑے ہو جائیں گے مگر خدا اُن کے اور میرے بیچ میں ایک پردہ حائل کر دے گا۔ میں تین بار کہوں گا، خداوندا یہ تو میرے اصحاب ہیں، یہ تو میرے اصحاب ہیں، یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ مگر جواب ملے گا کہ نہیں اے رسول! تم نہیں جانتے کہ تمہارے بعد انھوں نے دین میں کیا کیا تفرقہ اندازی کی۔"

جناب عالی! اس حدیث کے صحیح الفاظ عربی کے اور اس کے معنی مع حوالجات تحریر فرمائیں۔ اس لیے کہ لوگ اکثر بات چھیڑ دیتے ہیں۔ تو یہ ایک بیّن ثبوت ہو جائے گا۔

الجواب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیث حوض صحیح بخاری اور صحیح مسلم اور بغیرہ دیگر صحاح وسنن وجوامع اہل سنت میں بطریق کثیرہ موجود ہے۔ اور ایسا پتہ چلتا ہے کہ حضرت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ مضمون کسی ایک ہی موقع پر ارشاد نہیں فرمایا، بلکہ یہ انتباہ روز قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے اتنا اہم تھا کہ حضرت نے متعدد مواقع پر متعدد انداز اور الفاظ میں اس مطلب کو بیان فرمایا ہے جس کے لیے سلسلہ وار صحاح ستہ اور بعض دیگر مستند جوامع حدیث کے اقتباسات بلا کسی مزید تبصرہ کے پیش کیے جاتے ہیں۔

وعلی اللہ التوکل وبہ الاعتصام

صحاح ستہ اور چند معتبر کتابوں کے نام اور وہ مقامات جہاں حدیث حوض درج ہے

صحیح بخاری میں جہاں تک اس وقت میرے پیش نظر ہے اور ممکن ہے کہ تلاش کے بعد اس سے زیادہ موارد ملیں، حدیث حوض اور اس کے معادل احادیث جو بعد میں درج ہوں گے پانچ بابوں میں درج ہیں۔

(۱) کتاب الفتن (۲) باب فی الحوض (۳) کتاب بدء الخلق باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا (۴) باب

کیف الحشر (۵) کتاب التفسیر سورۃ المائدۃ باب و کنت علیہم شہیدا ما دمت فیہم۔

اور ان ابواب میں جو احادیث متعدد طرق سے درج ہوئے ہیں ان کی تعداد گیارہ ہے۔

صحیح مسلم میں یہ احادیث کتاب الفضائل باب اثبات حوض نبینا و صفاته میں ہیں اور احادیث کی تعداد آٹھ ہے۔

سنن ابن ماجہ میں کتاب المناسک میں باب الخطبہ یوم النحر

جامع ترمذی میں ابواب صفۃ القیامۃ کے ذیل میں باب ماجاء فی شان الحشر اور ابواب التفسیر میں سورۃ الانبیاء

موطا امام مالک میں باب جامع الوضوء۔

اور مسند امام احمد بن حنبل میں:۔

(۱) مسند عبداللہ بن مسعود (۲) مسند ابی ہریرہ اور (۳) مسند ابن عباس میں نو طرق سے یہ حدیث مذکور ہے۔

ان میں سے ہر قسم کی ایک ایک حدیث کے الفاظ مع ترجمہ مکمل حوالوں کے ساتھ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:۔

(۱)

صحیح بخاری طبع مصر ج ۹ ص ۵ کتاب الفتن میں ہے:۔

حدثنا موسیٰ بن اسمٰعیل	موسیٰ بن اسماعیل کی روایت
عن ابی وائل قال قال	ہے بسند متصل ابو وائل کی زبانی
عبد اللہ قال النبی ﷺ انا	عبداللہ بن مسعود سے کہ پیغمبرِ خدا
فرطکم علی الحوض۔ لیرفعن الی رجال	نے فرمایا میں حوض پر تمہارا پیش رو
منکم حتی اذا ھویت لاناولھم	ہوں گا۔ میرے پاس تم میں سے

اختلجوا دونی فاقول رب
اصحابی فیقول لا تدری
ما احدثوا بعدک

کچھ لوگ لائے جائیں گے یہاں
تک کہ جب میں جھکوں گا کہ انہیں
اپنی طرف سے لوں تو وہ میرے
پاس سے ہٹ جائیں گے، تو میں
کہوں گا کہ اے میرے پروردگار یہ تو
میرے اصحاب ہیں۔ ارشاد ہوگا کہ آپ کو
نہیں معلوم انہوں نے آپ کے بعد کیا گل کھلایا؟

تقریباً انہی الفاظ میں یہ جلد ۸ صفحہ ۱۲۱ باب فی الحوض میں ہے
اور صفحہ ۱۲۰ میں تقریباً یہی حدیث انس کی زبانی ہے کہ رسولؐ
نے فرمایا:-

لیردن علی ناس
من اصحابی الحوض حتی
عرفتھم اختلجوا دونی
فاقول اصیحابی فیقول
لا تدری ما احدثوا
بعدک۔

میرے پاس کچھ لوگ میرے
اصحاب میں سے حوض کوثر پر وارد
ہوں گے یہاں تک کہ میں انہیں
پہچان لوں گا تو وہ میرے پاس سے
دور ہو جائیں گے تو میں کہوں گا
کہ اے میرے اصحاب! تو ارشاد
قدرت ہوگا کہ آپ کو نہیں خبر
انہوں نے آپ کے بعد کیا گل
کھلایا؟

صحیح مسلم طبع مصر ج ۲ صفحہ ۲۱۲۔ کتاب الفضائل باب اثبات
حوض نبینا و صفاتہ میں بھی انس والی حدیث ہے ان الفاظ
میں کہ:-

ليردن على الحوض
رجال ممن صاحبني حتى
اذا رايتهم ورفعوا الي
اختلجوا دوني فلا قولن
اي رب اصيحابي اصيحابي
فليقالن لي انك لا
تدري ما احدثوا بعدك

میرے پاس حوض کوثر پر کچھ
لوگ ان میں سے جو میری
صحبت میں رہے ہیں آئیں گے
یہاں تک کہ جب میں انھیں دیکھوں
گا اور وہ میرے سامنے آئیں گے
تو ایک دم مجھ سے دور ہو جائیں
گے تو میں کہوں گا، اے میرے
پروردگار یہ میرے پیارے اصحاب
ہیں، میرے پیارے اصحاب ہیں
تو مجھ سے کہا جائے گا کہ آپ کو
نہیں خبر کہ انھوں نے آپ کے
بعد کیا گل کھلائے؟

(۲)

صحیح بخاری ج ۱ صـ [illegible] کتاب الفتن کی دوسری حدیث زیادہ مفصل ہے:—

حدثنا يحيى بن بكير
حدثنا يعقوب بن
عبد الرحمن عن ابي حازم
قال سمعت سهل بن
سعد يقول سمعت
النبي يقول انا فرطكم

سہل بن سعد کا بیان ہے
کہ میں نے پیغمبر خدا کو فرماتے
ہوئے سنا کہ میں حوض پر تمھارا
پیش رَو ہوں گا، جو وہاں وارد
ہوگا وہ اس پانی سے سیراب
ہوگا، اور جو وہاں سے سیراب

على الحوض، من ورده
فشرب منه ومن شرب
منه لم يظمأ بعده
ابدا ليردن على اقوام
اعرفهم ويعرفوني ثم
يحال بيني وبينهم
قال ابو حازم فسمعني
النعمان بن ابي عياش
وانا احدثهم هذا
فقال هكذا سمعت
سهلا فقلت نعم قال
وانا اشهد على ابي
سعيد الخدري لسمعته
يزيد فيه قال انهم
مني فيقال انك لا
تدري ما بدلوا بعدك
فاقول سحقا سحقا لمن
بدل بعدي

ہو گیا وہ پھر کبھی پیاسا نہیں ہوگا
ہاں کچھ جماعتیں میرے پاس وارد
ہوں گی جنہیں پہچانتا ہوں اور
وہ مجھے پہچانتے ہیں پھر میرے
اور ان کے درمیان پردہ حائل ہو
جایا جائے گا - نعمان بن ابی
عیاش کا بیان ہے کہ انھوں
نے ابو سعید خدری کی زبانی اس
کے بعینہ اس حدیث کو سنا اور
وہ اس کے بعد ان الفاظ کا اضافہ
کرتے تھے - میں کہوں گا کہ یہ
تو مجھ سے تعلق رکھتے ہیں -
کہا جائے گا کہ آپ کو نہیں خبر
کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا
تبدیلی کی - تو میں کہوں گا ، کہ
دوری ہو ، دوری ہو اس کے
لیے جس نے میرے بعد تبدیلی
کی -

یہی حدیث بخاری کے جلد ۵ صفحہ ۱۴۹ - ۱۵۰ میں باب فی الحوض
کے متن میں بھی درج کی ہے - اور وہاں اتنا اضافہ ہے کہ جناب
ابن عباس نے حدیث کے آخری لفظ جو رسولؐ کی زبانی ہے

"سحقاً سحقاً لمن غیّر بعدی" اس کی تشریح فرمائی ہے کہ :-

سحقاً بعداً ایقال	سحقاً کے معنی ہیں دوری ہو
سحیق بعید واسحقہ	کہا جاتا ہے سحیق یعنی دور اور
ابعدہ -	اسحقہ یعنی دور کیا اس کو -

ظاہر ہے کہ لعنت کے معنی بھی رحمتِ خدا سے دوری کے ہیں - اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ رسولؐ جن کا کام روزِ قیامت خلق کی شفاعت ہے اس بد نصیب جماعت پر جس کا تذکرہ فرمایا ہے اسی موقع شفاعت پر دو دو بار لعنت فرما رہے ہیں -

یہی حدیث صحیح مسلم مطبوعہ مصر ج ۲ صفحہ ۲۰۰ کتاب الفضائل میں سہل بن سعد اور نیز ابو سعید خدری کی زبانی اسی صورت سے مذکور ہے -

(۳)

صحیح بخاری طبع مصر جلد ۸ صفحہ ۱۵۰ باب فی الحوض میں ہے

عن ابی هریرۃ انہ	ابو ہریرہ کی زبانی ہے جو
کان یحدث ان رسول	بیان کیا کرتے تھے کہ رسولؐ
اللہ قال یرد علی یوم	خدا نے فرمایا - میرے پاس
القیامۃ رھط من اصحابی	قیامت کے دن ایک گروہ
فیحلئون عن الحوض فاقول	میرے اصحاب میں سے آئے گا
یا رب اصحابی فیقول انک	تو وہ حوض کوثر سے روک دیے
لا علم لک بما احدثوا	جائیں گے تو میں کہوں گا اے

لیرد انہ لئھم ارتدوا علی ادبارھم القھقری	میرے پروردگار یہ میرے اصحاب ہیں تو ارشاد ہوگا کہ آپ کو علم نہیں انھوں نے آپ کے بعد کیا گل کھلائے۔ وہ تو اپنے پچھلے راستے کی طرف پلٹ گئے تھے۔

سعید بن مسیب اسی حدیث کو بلا تعین اسم عن اصحاب النبی کہہ کر بیان کیا کرتے تھے جس کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے صحابہ سے انھوں نے یہ حدیث سنی تھی۔ صرف ایک لفظ میں اختلاف ہے جس سے مطلب تقریباً ایک ہی رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ وہ حوض کوثر سے روک دیئے جائیں گے۔ اس کے بدلے زہری کہتے تھے۔ نیجلون عن الحوض" وہ حوض سے نکال دیئے جائیں گے جس طرح ہماری زبان میں جلا وطن کیا جانا مستعمل ہے اور عقیل کہتے تھے نیجلئون جس کے معنی ہیں روک دیئے جائیں گے۔

(۴)

صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۰۰ کتاب الفضائل باب اثبات حوض نبینا وصفاتہ میں جناب اسماء بنت ابی بکر کی روایت ہے کہ پیغمبر خدا ؐ نے فرمایا:۔

انی علی الحوض حتی انظر من یرد علی منکم و	میں حوض پر ہوں گا کہ دیکھوں کون لوگ تم میں سے میرے

سیؤخذ اناس دونی فاقول یارب منی ومن امتی فیقال اما شعرت ما عملوا بعدک واللہ ما برحوا بعدک یرجعون علی اعقابھم ۔

پاس وارد ہوتے ہیں اور کچھ ایسے آدمی ہوں گے جنہیں میرے پاس الگ کیا جائے گا تو میں کہوں گا، اے میرے پروردگار یہ مجھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یا (یہ فرمایا کہ) میری امت میں سے ہیں تو ارشاد ہوگا کیا آپ کو خبر نہیں کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا؟ بخدا آپ کے بعد برابر یہ لوگ ایسے رہے کہ اپنے پرانے راستوں پر واپس جاتے رہے۔

ابن ابی ملیکہ جو اس حدیث کے سلسلۂ رواۃ میں ہیں کہتے تھے کہ:-

اللھم انا نعوذ بک ان نرجع علی اعقابنا او نفتن عن دیننا۔

خداوندا ہم تجھ سے پناہ مانگتے ہیں کہ پچھلے پیروں پلٹ جائیں یا اپنے دین سے برگشتہ ہو جائیں

جناب ام المومنین عائشہ کی زبانی بھی تقریباً بالکل اسی مضمون کی حدیث ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ اس حدیث میں ہے انظر من یرد علی اور یہاں "انتظر من یرد علی" میں انتظار کرتا ہوں گا ان کا جو میرے پاس وارد ہوں گے — وہاں ہے سیؤخذ اناس دونی یہاں ہے فواللہ لیقتطعن من دونی رجال" بخدا کچھ لوگ مجھ سے کٹ کر الگ ہو جائیں

گے یعنی۔ وہاں ہے اما شعرت ما عملوا بعدک واللہ ما برحوا بعدک یرجعون علی اعقابہم ۔ یہاں ہے انک لا تدری ما عملوا بعدک انہم ازالوا یرجعون علی اعقابہم معنی دونوں کے ایک ہیں۔

(۵)

صحیح مسلم مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۲۵۰ باب سابق الذکر میں عبداللہ بن رافع کی زبانی جناب ام المومنین ام سلمہ رضوان اللہ علیہا کی حدیث مسطور ہے کہ میں لوگوں سے حوض کے بارے میں سنا کرتی تھی اور خود پیغمبر خدا سے میں نے اس بارے میں کچھ نہ سنا تھا ایک دن کنیز میرے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی تو میں نے پیغمبر خدا کو سنا کہ آپ نے ایہا الناس کہہ کے خطبہ شروع کیا۔ میں نے کنیز سے کہا ذرا میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ اس نے کہا رسول نے مردوں کو بلایا ہے عورتوں کو نہیں بلایا ہے۔ میں نے کہا ایہا الناس میں الناس تو آپ کے خطاب میں تو میں بھی داخل ہوں میں نے سنا کہ اس کے بعد رسول نے فرمایا۔

انی لکم فرط علی الحوض فایای لا یاتین احدکم فیذب منی کما یذب البعیر الضال فاقول فیم ھذا فیقال انک لا تدری ما احدثوا بعدک فاقول سحقا	میں حوض کوثر پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔ تو دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم میں کا کوئی ایک میرے پاس آنا چاہے اور وہ میرے پاس سے ہنکا دیا جائے جیسے گمراہ اونٹ ہنکایا جاتا ہے تو میں کہوں گا یہ کس بنا پر؟ تو کہا

جائے گا، آپ کو خبر نہیں کہ
انھوں نے آپ کے بعد کیا گل
کھلائے اس پر میں کہوں گا [illegible] ہو

یہی حدیث اس کے بعد کئی طرق سے مذکور ہے۔

(۶)

صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۲ باب مذکور عبداللہ بن مسعود کی
روایت:—

قال رسول اللّٰہ انا
فرطکم علی الحوض ولا
نازعن اقواما ثم لا
غلبن علیہم فاقول
یا رب اصحابی اصحابی
فیقال انک لا تدری
ما احدثوا بعدک

رسولؐ نے فرمایا میں حوض کوثر
پر تمہارا پیش رو ہوں گا اور کچھ
لوگوں کے سلسلے میں کوشش کروں گا
مگر آخر میں بے بس ہو جاؤں گا
تو کہوں گا اے میرے پروردگار
میرے اصحاب میرے اصحاب
ہیں تو کہا جائے گا آپ کو خبر
نہیں کہ انھوں نے آپ کے
بعد کیا گل کھلایا؟

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے اپنے مسند کے اندر
مسند عبداللہ بن مسعود میں متعدد طرق سے چار جگہ درج کیا ہے
مسند مطبوعہ مصر ج ۵ صفحہ ۴۳۱، ۳۱۰، ۳۴۶ و ۳۳۲۔

(۷)

(مسند احمد بن حنبل ج ۱۵ صفحہ ۱۱۸-۱۱۹- بذیل مسند
ابی ہریرہ)

محمد بن زیاد کی روایت ہے کہ میں نے ابوہریرہ کو سنا وہ بیان کرتے تھے کہ پیغمبر خدا ؐ نے فرمایا:۔

والذی نفس محمد بیده لاذودن رجالا منکم عن حوضی کما تذاد الغریبة من الابل عن الحوض

قسم اس کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے کہ میں کچھ لوگوں کو تم میں سے اپنے حوض سے ہنکا دوں گا جس طرح کوئی اجنبی اونٹ چشمے سے ہنکایا جاتا ہے۔

(۸)

(مسند احمد ج ۵ صفحہ ۱۵۲ مسند ابی ہریرہ)

شعبہ کا بیان ہے کہ میں نے علاء بن عبدالرحمٰن سے سنا وہ اپنے والد کی زبانی ابوہریرہ سے نقل کرتے تھے:۔

عن النبی ص انه اتی المقبرة فسلم علی اهل المقبرة فقال سلام علیکم دار قوم مومنین وانا ان شاء الله بکم لاحقون ثم قال وددت انا قد راینا اخواننا قال فقالوا یا رسول الله السنا باخوانك قال بل انتم اصحابی واخوانی الذین لم یاتوا بعد

پیغمبر خدا ؐ مقبرہ تشریف لے گئے اور اہل قبرستان کو سلام کرتے ہوئے فرمایا سلام ہو تم پر اے با ایمان ساکنین مکان کے، اور ہم انشاء اللہ تم سے ملنے والے ہیں۔ پھر فرمایا: کتنا دل چاہتا ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کو دیکھتے۔ لوگوں نے کہا یا رسول اللہ کیا ہم آپ کے بھائی نہیں ہیں؟ فرمایا (نہیں) بلکہ تم میرے اصحاب ہو اور میرے بھائی تو وہ ہیں جو ابھی

وانا فرطهم على الحوض
فقالوا يا رسول الله كيف
تعرف من لم يأت من
امتك بعد قال ارأيت
لو ان رجلا كان له خيل
غر محجلة بين ظهري
خيل بهم دهم الم
يكن يعرفها قالوا بلى
قال فانهم يأتون
يوم القيامة غرا محجلين
من اثر الوضوء وانا
فرطهم على الحوض ثم
قال الا ليذادن
رجال منكم عن حوضي
كما يذاد البعير الضال
اناديهم الا هلم فيقال
انهم بدلوا بعدك
فاقول سحقا سحقا۔

دنیا میں نہیں آئے ہیں، اور میں
حوض کوثر پر ان کا پیش رو ہوں گا
لوگوں نے کہا یا رسول اللہ آپ کیونکر
پہچانیں گے انھیں جو آپ کی امت
میں سے ابھی آئے نہیں ہیں آپ
نے فرمایا، اگر کسی شخص کے پاس
گھوڑے تمام ایسے ہوں جن کی پیشانی
اور پیروں پر سفیدی ہے، اور وہ
سیاہ گھوڑوں کے درمیان
ہوں تو کیا وہ اپنے
گھوڑوں کو نہ پہچانے
گا نہیں؟ سب نے کہا کیوں نہیں
فرمایا۔ اسی طرح میری امت کے
افراد بروز قیامت آئیں گے کہ وضو
کی وجہ سے ان کی پیشانی اور پیروں
سے انوار نمایاں ہوگا اور میں حوض پر
ان کا انتظار کرتا رہوں گا۔ پھر
فرمایا کہ تم میں سے کچھ لوگ میرے
حوض سے ہنکا دیے جائیں گے
جس طرح راستہ بھولا ہوا اونٹ
ہنکایا جاتا ہے میں پکار کر کہوں
گا۔ ارے ادھر آؤ۔ تو کہا جائے گا

کہ انھوں نے تو آپ کے بعد تبدیلی
کردی تھی تو میں کہوں گا دفان ہوں
دفان ہوں۔

یہی حدیث بعینہٖ موطا امام مالک (مطبوعہ فخر المطابع دہلی ۱۹۵۲ء)
ص۹-۱۰۔ باب جامع الوضوء میں درج ہے۔ صرف اس میں الاھلم
الاھلم الاھلم ہے۔ یعنی تین دفعہ "ادھر آؤ" فرمایا۔ اب
پھر جب جواب ملے گا کہ انھوں نے آپ کے بعد تبدیلی کردی
تھی تو تین دفعہ ہے فسحقا فسحقا فسحقا" تو پھر دفان ہوں۔ تو
پھر دفان ہوں۔ تو پھر دفان ہوں۔"

(۹)

سنن ابن ماجہ مطبوعہ مصر ۱۳۷۳ھ صفحہ ۱۰۱۶ ج ۲ کتاب
المناسک باب ۷۶۔ الخطبۃ یوم النحر۔

عن عبد اللّٰہ بن مسعود قال قال رسول اللّٰہ ﷺ و هو على ناقة المخضرمة بعرفات فقال اتدرون اى يوم هذا واى شهر هذا واى بلد هذا - قالوا هذا بلد حرام وشهر حرام و يوم حرام قال ان

عبد اللہ بن مسعود کی روایت ہے کہ پیغمبر خدا نے اس موقع پر کہ جب آپ اپنے ناقہ پر عرفات میں تھے، ارشاد فرمایا۔ جانتے ہو کہ یہ کون دن ہے اور کون مہینہ ہے اور کون شہر ہے؟ سب نے کہا یہ شہر بھی حرام (محترم) ہے اور مہینہ بھی حرام ہے اور دن بھی حرام ہے

وانّ اموالكم ودماءكم
عليكم حرام كحرمة
شهركم هذا في
بلدكم هذا الى يومكم
هذا الا واني فرطكم
على الحوض واكاثر بكم
الامم فلا تسوّدوا
وجهي الا واني مستنقذ
اناسا ومستنقذ مني
اناس فاقول يارب
اصيحابي فيقول انك
لاتدري ما احدثوا
بعدك ۔

حضرت نے فرمایا معلوم ہونا
چاہیے کہ تمھارے مال اور جان
بھی ویسے ہی حرام (محترم) ہیں
جیسے اس مہینے اور اس شہر اور
اس دن کی حرمت سے آگاہ
ہونا چاہیے کہ میں حوض پر تمھارا
پیش رَو ہوں گا اور تمھاری کثرت
کے ذریعے امتوں کا مقابلہ
کروں گا تو میرے منہ میں کالک
نہ لگانا۔ آگاہ ہونا چاہیے کہ میں
کچھ آدمیوں کو چھڑاؤں گا اور کچھ
آدمی مجھ سے چھڑا لیے جائیں گے
تو میں کہوں گا اے میرے پروردگار
یہ تو میرے پیارے اصحاب ہیں
تو ارشاد ہوگا۔ آپ کو نہیں معلوم
کہ انھوں نے آپ کے بعد کیا
گل کھلایا۔ سند اس حدیث کی
صحیح ہے۔

معاون احادیث

گذشتہ احادیث تو وہ ہیں جن میں خصوصیت کے ساتھ حوض کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے احادیث ہیں جن میں حوض کا نام نہیں ہے۔ مگر نتیجہ ان کا احادیث حوض سے بالکل متحد ہے۔ یہ حسب ذیل احادیث ہیں:-

(۱)

صحیح بخاری مطبوعہ مصر جلد ۲ صفحہ ۱۲۹۔ کتاب بدء الخلق باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا۔

عن ابن عباس رضی	جناب ابن عباس کی روایت
اللہ عنہما عن النبی ص	ہے۔ حضرت پیغمبر خدا ص
قال انکم محشورون	نے فرمایا۔ تم لوگ محشور ہو گے
حفاۃ عراۃ ثم قرأ	ننگے سر برہنہ، پریشان حال۔
کما بدأنا اول خلق	پھر یہ آیت پڑھی کہ جس طرح
نعیدہ وعدا علینا	پہلے ہم نے پیدا کیا تھا اسی
انا کنا فاعلین واول	طرح دوبارہ لائیں گے۔ یہ وعدہ
من یکسی یوم القیامۃ	ہمارے ذمہ ہے جسے ہم پورا
ابراھیم وان اناسا	کریں گے اور سب سے پہلے
من اصحابی یؤخذ	جس کو لباس ملے گا وہ ابراہیم
بھم ذات الشمال فاقول	ہوں گے اور کچھ لوگوں کو جسے

اصحابی اصحابی فیقول انهم لم یزالوا مرتدین علی اعقابهم منذ فارقتهم فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیهم شهیدا ما دمت فیهم الی قوله الحکیم

اصحاب میں سے بائیں طرف لے جایا جائے گا تو میں کہوں گا یہ میرے اصحاب ہیں، میرے اصحاب ہیں تو ارشاد ہوگا کہ یہ ہمیشہ اپنے پچھلے پیروں کی طرف پلٹنے والے رہے جب سے آپ ان سے جدا ہوئے تو میں کہوں گا جیسا کہ عبد صالح (عیسیٰؑ) نے کہا تھا کہ میں ان پر گواہ تھا جب تک کہ میں ان میں تھا۔ آخر آیت۔

تقریباً یہی حدیث ج ۲ صفحہ ۶۶ کتاب التفسیر میں سورۃ مائدہ کے ذیل میں باب وکنت علیهم شهیدا ما دمت فیهم الآیۃ میں مذکور ہے۔ بس اس میں اصیحابی ہے جس کے معنی ہوتے میرے پیارے اصحاب اور اس کے بعد قدرت کی طرف سے جواب میں اس فقرہ کا اضافہ ہے کہ:-

انک لا تدری ما احدثوا بعدک فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیهم شهیدا ما دمت فیهم فلما توفیتنی فیقال ان هؤلاء

آپ کو نہیں خبر کہ انہوں نے آپ کے بعد کیا گل کھلائے؟ اس پر میں وہ کہوں گا جو عبد صالح نے کہا تھا کہ میں ان پر گواہ تھا جب تک کہ میں ان میں تھا، تو جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو

لم يزالوا مرتدين على
اعقابهم منذ فارقتهم

خود ہی ان کا نگران تھا، تو کہا
جائے گا کہ یہ لوگ جب سے
آپ ان سے جدا ہوئے برابر
اپنے پچھلے پیروں پر پلٹتے ہوئے
رہے

یہ روایت ج ۸ صفحہ ۱۳۶ باب کیف الحشر میں اس
طرح ہے کہ:-

عن ابن عباس قال
قام فينا النبي يخطب
فقال انكم محشورون
حفاة عراة كما بدأنا
اول خلق نعيده الآية
وان اول الخلائق يكسى
يوم القيامة ابراهيم
وانه سيجاء برجال
من امتي فيؤخذ
بهم ذات الشمال فاقول
يارب اصيحابي فيقول
انك لاتدري ما
احدثوا بعدك فاقول
كما قال العبد الصالح
وكنت عليهم شهيدا

جناب ابن عباس بیان کرتے
ہیں کہ رسولؐ ہم میں خطبہ ارشاد
فرمانے کے لیے کھڑے ہوئے
اور اس موقع پر یہ فرمایا کہ تم
لوگ محشور ہوگے ننگے پیر برہنہ
"جس طرح ہم نے پیدا کیا تھا
پہلے اسی طرح دوبارہ لائیں گے"
تا آخر آیت۔ اور سب سے پہلے
روز قیامت جس کو لباس ملے
گا وہ ابراہیمؑ ہوں گے اور کچھ
لوگوں کو میری امت میں سے
لایا جائے گا تو انھیں بائیں طرف
پہنچا دیا جائے گا اس پر میں
کہوں گا پروردگارا یہ میرے
پیارے اصحاب ہیں تو ارشاد

ما دمت فيهم الى قوله الحكيم فيقال انهم لم يزالوا مرتدين على اعقابهم	ہوں گا کہ آپ کو نہیں خبر انھوں نے آپ کے بعد کیا گل کھلائے تو میں کہوں گا جیسا بندۂ صالح عیسیٰ نے کہا تھا کہ میں ان پر گواہ تھا۔ جب تک کہ میں ان میں تھا تا آخر آیت۔ تو کہا جائے گا کہ یہ لوگ برابر اپنے پچھلے پیروں پر پلٹتے ہوئے رہے

جلد ۲ صفحہ ۱۷۶ - باب قول اللہ تعالیٰ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلاً میں بھی یہ روایت اس طرح ہے جس طرح پہلے درج ہوئی۔

اس حدیث کو مسند امام احمد بن حنبل مطبوعہ دار المعارف مصر ج ۳ صفحہ ۳۵۰ پر مسند ابن عباس میں درج کیا ہے اور اس میں یہ ہے کہ پیغمبر خدا موعظہ کے لیے کھڑے ہوئے اور یہ فرمایا۔

پھر جلد ۴ صفحہ ۶۷ پر اور صفحہ ۷۷ پر دو طریق سے ہے اور صفحہ ۴۹ پر بطور اختصار ہے کہ:-

عن ابن عباس قال سمعت رسول الله ﷺ يقول انا فرطكم على الحوض فمن ورد افلح ويؤتى باقوام فيؤخذ	ابن عباس کہتے ہیں کہ میں نے پیغمبر خدا کو فرماتے سنا کہ میں حوض پر تمہارا پیش رو ہوں گا۔ جو وہاں وارد ہوگا وہ فلاح پائے گا اور کچھ لوگ

بهم ذات الشمال فاقول ای رب فیقال ما زالوا بعدك يرتدون على اعقابهم۔

لے جائیں گے تو انہیں بائیں طرف سے جایا جائے گا تو میں کہوں گا اے میرے پروردگار یہ کیا ہے تو کہا جائے گا۔ یہ لوگ برابر پچھلے پیروں پلٹتے رہے۔

یہی حدیث بلفظ تفصیل جامع ترمذی مطبوعہ کانپور ج ۲ صفحہ ۶۶ پر ابواب صفۃ القیامۃ میں باب ماجاء فی شان الحشر میں ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس بارے میں ابو ہریرہ سے روایت ہے۔ اور یہ حدیث حسن ہے۔ دوسری جگہ صفحہ ۱۵۱ پر باب التفسیر میں اسے درج کیا ہے۔ اس طرح کہ پیغمبر جب وعظ کے لیے کھڑے ہوئے اور یہ ارشاد فرمایا۔ آخر میں اس کے متعدد طرق کا حوالہ دیا ہے اور کہا ہے "ھٰذا حدیث حسن صحیح" "یہ حسن و صحیح حدیث ہے"

(۴)

صحیح بخاری جلد ۸ صفحہ ۱۵۰ - ۱۵۱ - باب فی الحوض میں ابو ہریرہ کی روایت ہے :-

عن النبی قال بينا انا قائم اذا زمرة حتى اذا عرفتهم خرج رجل من بينى وبينهم فقال

پیغمبر خدا نے فرمایا میں کھڑا ہوں گا اور اس دوران میں ایک گروہ میرے سامنے آئے گا یہاں تک کہ جب میں انہیں

هلم فقلت اين قال
الى النار والله قلت
ما شأنهم قال انهم
ارتدوا بعدك على
ادبارهم القهقرى
ثم اذا زمرة حتى
اذا عرفتهم خرج رجل
من بيني وبينهم فقال
هلم قلت اين قال
الى النار والله قلت
ما شأنهم قال انهم
ارتدوا بعدك على
ادبارهم القهقرى
فلا اراه يخلص منهم
الا مثل همل النعم۔

پہچانوں گا تو ایک شخص میرے
اور ان کے بیچ میں آجائے گا
اور کہے گا آؤ چلو! میں کہوں گا
کہاں؟ وہ کہے گا خدا کی قسم
آگ کی طرف۔ میں نے کہا
کیوں؟ ان کا کیا واقعہ ہے؟
وہ کہے گا کہ یہ آپ کے بعد
پچھلے پیروں پلٹ گئے۔ پھر
دوسرا گروہ سامنے آئے گا،
اسے بھی میں پہچانوں گا اور اسی
طرح ایک شخص میرے اور
ان کے درمیان نکلے گا اور
کہے گا آؤ چلو! میں کہوں گا
کدھر؟ وہ کہے گا بخدا آتش
جہنم کی طرف۔ میں کہوں گا
ان کا کیا قصور ہے؟ تو وہ وہی
کہے گا کہ یہ آپ کے بعد پچھلے پیروں
پلٹ گئے تھے۔ تو ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ ان میں سے نجات
نہیں پائیں گے مگر شاذ و نادر جیسے
کچھ چوپائے گلے میں سے الگ رہ
گئے ہوں۔

مسلمان ذرا خود سے اس حدیث کو دیکھیں اور پھر فیصلہ کریں کہ نجات یافتہ اکثریت ہے یا اقلیت اور اب اگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام ایسا بتائیں کہ ارتد الناس بعد رسول اللہ الا ثلثۃ یا خمسۃ یا سبعۃ تو یہ صحیح بخاری کی اس حدیث کے بالکل مطابق ہے یا اس کے خلاف ؟

ارتداد کی نوعیت

بس آخر میں صحیحین کی ایک حدیث سن لیجئے جس میں بعد رسول ؐ صحابہ میں ارتداد کا جو نقشا ہے اس کا اظہار ہو جاتا ہے اور اس سے سمجھنے والے کو سب کچھ سمجھ میں آ سکتا ہے۔ ملاحظہ ہو صحیح بخاری ج ۸ صفحہ ۱۵۱۔ باب فی الحوض عقبہ کی روایت ہے کہ :

ان النبی ؐ خرج یوما فصلی علی اهل احد صلوته علی المیت ثم انصرف علی المنبر فقال انی فرط لکم وانا شهید علیکم وانی واللہ لا نظر الی حوضی الآن وانی اعطیت مفاتیح خزائن الارض	پیغمبر خدا ؐ ایک دن مکان سے برآمد ہوئے اور شہداء احد کے لیے نماز جنازہ کی طرح نماز کی صورت میں دعائے خیر کی۔ پھر اپنے منبر کی طرف تشریف لائے اور بالائے منبر ارشاد فرمایا کہ میں تمہارا پیش رو ہوں اور میں تم پر گواہ ہوں اور بخدا میری

او مفاتیح الارض وانی واللہ ما اخاف علیکم ان تشرکوا بعدی ولکن اخاف علیکم ان تنافسوا فیہا

اس وقت آنکھوں میں پھر رہا ہے وہ منظر جب میں حوض پر ہوں گا اور مجھے ملی ہیں تمام خزائن زمین کی کنجیاں یا یوں فرمایا کہ تمام زمین کی کنجیاں اور بخدا مجھے تمہارے متعلق یہ اندیشہ نہیں کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ تم دنیا طلبی میں آپس کی کشاکش میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

یہی حدیث صحیح مسلم ج ۲ صفحہ ۲۵۰ کتاب الفضائل باب اثبات حوض نبینا و صفاتہ میں ہے اور وہ حدیث بعینہ درج کرنے کے بعد ایک دوسری حدیث اسی مضمون کی کچھ الفاظ کی کمی اور بعض فقرات کے اضافہ کے ساتھ درج کی ہے۔ اس میں ہے کہ :-

صلی رسول اللہ علی قتلی احد ثم صعد المنبر کالمودع للاحیاء والاموات فقال انی فرطکم علی الحوض وان عرضہ کما بین ایلۃ الی الجحفۃ انی

پیغمبرؐ نے شہدائے احد پر نماز پڑھی۔ پھر منبر پر تشریف لے گئے جیسے کہ آپ زندوں اور مردوں سب کو رخصت کر رہے ہوں۔ فرمایا میں حوض پر تمہارا پیشرو ہوں اور اس کی چوڑائی ایسی ہے جیسے ایلہ

لست اخشی علیکم ان تشرکوا بعدی ولکنی اخشی علیکم الدنیا ان تنافسوا فیھا و تقتتلوا فتھلکوا کما ھلک من کان قبلکم قال عقبۃ فکانت اخر ما رأیت رسول اللہ علی المنبر

ہے سے کہ مجھ تک ۔ مجھے تمہارے متعلق یہ اندیشہ نہیں ہے کہ تم میرے بعد مشرک ہو جاؤ گے مگر یہ اندیشہ ہے تمہارے متعلق کہ تم دنیا میں پڑ کر ایک دوسرے سے کشاکش میں گرفتار ہو گے اور آپس میں لڑو گے اور ہلاک ہو گے جیسا کہ ہلاک ہوئے وہ جو تمہارے پہلے تھے ۔ عقبہ (راوی حدیث) کا بیان ہے کہ یہ آخری موقع تھا جب میں نے رسول ؐ کو منبر پر دیکھا یعنی اس کے بعد حضرت ؐ کی وفات ہو گئی ۔

یہ حب دنیا کس صورت میں ظاہر ہونے والا تھا؟ اسے بھی ملاحظہ فرمائیے ۔

صحیح بخاری ج ۹ کتاب الاحکام باب ما یکرہ من الحرص علی الامارۃ ۔

عن ابی ھریرۃ عن النبی قال انکم ستحرصون علی الامارۃ وستکون ندامۃ یوم القیامۃ

ابو ہریرہ کا بیان ہے کہ پیغمبر ؐ نے فرمایا کہ تم بہت جلد میرے بعد حکومت کی لالچ میں مبتلا ہو جاؤ گے

فنعم المرضعة وبئست الفاطمة۔

اور یہ قیامت کے دن پشیمانی کا باعث ہوگا تو آغاز کتنا اچھا اور انجام کتنا برا ہے۔

بس اب ان صحیحین کی حدیثوں کے بعد کچھ کہنا نہیں ہے۔ یہ طلبائے حقیقت کو حقیقت تک پہنچانے کے لیے کافی ہیں۔ واللہ یہدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

شیعیت کا تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید الانبیاء والمرسلین وآلہ الطیبین الطاہرین۔

چونکہ شیعی دعوت، شیعی مذہب اور فرقۂ شیعہ کے متعلق بہت غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں اور بہت سے افراد نیک نیتی کے باوجود ناواقفیت کی بناء پر تاریکی میں مبتلا ہیں اس لئے یہ رسالہ حقیقت امر کو بے نقاب کرنے کے لئے لکھا جا رہا ہے۔ تاکہ نیک دل اشخاص سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں اور مخالفت ہی کرنا چاہیں تو سمجھ کر مخالفت کریں۔

لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحییٰ من حیّ عن بینۃ

شیعی دعوت کیا ہے؟

شیعی دعوت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ وہ وہی اسلام ہے جس کیلئے انبیاء کی دعوت رہی۔ کتب سماوی کی دعوت رہی جو پیغمبر اسلام کی حقیقی دعوت تھی اور قرآن کی حقیقی دعوت تھی۔

یہی وہ دعوت تھی جس کی خاطر انبیاء و مرسلین نے زحمتیں اٹھائیں۔ حضرت خاتم المرسلین نے جس کی وجہ سے اذیتیں سہیں اور قربانیاں پیش کیں۔

اس دعوت کے ماننے والے چونکہ رسول کے اہل بیت کے ساتھ رہے اور چونکہ شیعہ کے معنی عربی میں متبعین اور پیروؤں کی جماعت کے ہیں اس لئے جو اس دعوت کی اصل حقیقت پر برقرار ہے وہ شیعۂ آل رسول یا شیعۂ علی کہلاتا ہے۔

اسلام کے معنی

اسلام کے معنی لغت میں دو ہیں۔ ایک سر نہادن بطاعت یعنی اللہ کے سامنے اطاعت کے لئے سر جھکا دینا" اور دوسرے سپردن" یعنی اپنے کو اللہ کے سپرد کر دینا۔

ان دونوں کا نتیجہ یہی ہے کہ اللہ کی مرضی کے مقابلہ میں انسان کا حق خود ارادی خواہ شخصی ہو یا جمہوری کوئی چیز نہیں ہے۔ حاکم مطلق صرف اللہ ہے اور جسے وہ اپنا نائب بنائے صرف اس کی اطاعت انسان کے لئے فرض ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا حق حکومت نہیں رکھتا اور جو حکومت اس کے مقابلہ میں قائم ہو وہ حکومت ناجائز ہے۔

یہی اسلام ہے اور اسی کا نام شیعیت ہے۔

حکومتِ الٰہیہ کی بنیاد

اور

انبیاء و مرسلین کا مشن

کائنات عالم میں ہر شے خالق فطرت کی مرضی کے مطابق چل رہی ہے یہ فطری اسلام ہے جس سے عالم کا کوئی ذرہ خارج نہیں ہے۔

انسان بھی کائنات عالم کا ایک جزو ہونے کے اعتبار سے اپنے نظام تخلیق اور نشو و نما میں کم سنی سے لے کر جوانی اور بڑھاپے کی منزلوں سے گذرتا ہوا موت کے ہنگام تک مثل دنیا کی تمام چیزوں کے ایک فطری تحریک کی پابندی کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اور اس میں مومن اور کافر کا فرق نہیں ہے۔ مگر

انسان میں اس کے شایانِ شان اقتدار کو نمایاں کرنے کے لئے ایک ارادہ و اختیار کا جوہر ودیعت کیا گیا ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اس اختیار کی بدولت کبھی کبھی احکام خداوندی سے سرتابی کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ یہاں اللہ کی مرضی اس کے سامنے تعلیمات کی شکل میں آتی ہے۔ اور اگر وہ ان تعلیمات کو قبول کرتا اور ان پر عمل پیرا ہوتا ہے تو مومن اور خلیفہ کا درجہ پاتا اور اگر ان احکام سے انکار کرتا اور ان کی تعمیل میں غفلت برتتا ہے تو کافر اور گنہگار ٹھہرتا ہے۔ انبیاء و مرسلین آئے تھے انسانوں کو انہی تعلیمات کے پہنچانے کے لئے اور مقصد یہ تھا کہ انسان خود اختیاری طور پر بھی اسی کی حکومت کو تسلیم کرے جس کی قہری طور پر وہ اپنے نظام فطرت میں اطاعت کر رہا ہے۔ یعنی اس کی اختیاری کارگزاری اس کے فطری نظام زندگی کے مطابق ہو جائے۔ اس کے نظام حیات میں یہ دو عملی نہ ہو کہ فطری طور پر تو وہ اللہ کا محکوم ہے۔ اور ارادی طور پر وہ اپنے امکان بھر کسی دوسرے کا محکوم ہو یا خود ہی بگڑ کر حاکم بن بیٹھے۔ اسی کا نام وہ اسلام ہے جسے انبیاء لے کر آئے۔ ان کا نصب العین تھا انسانوں کو حکومت الٰہیہ کا احساس پیدا کرانا ارادی طور پر اس کے وفادار رعایا ہونے کا اقرار لینا اور اس کے عملی تقاضوں کا پورا کرانا۔

اس کے مقابلہ میں حاکم بننے والے وہی تھے جو خدائی کے دعویدار ہوئے جیسے فرعون، نمرود اور شداد اور اللہ کے سامنے دوسروں کی اطاعت کرنے والے ان سلاطین کی رعایا وہ عوام تھے جو انہیں خدا مان رہے تھے۔

یہ زعم خدائی کبھی الفاظ کے قالب میں آ گیا اور کبھی زبان سے تو خدائی کا دعویٰ نہیں کیا گیا۔ مگر اس کے احکام کے مقابلہ میں مطلق العنانی اور سرکشی کے عملی مظاہرات اسی زعم کی غمازی کرتے رہے اور باطل جبروت

کی اندھا دھند نقالی تھیں، اپنے پس منظر میں زعم خدائی ہی کا پتہ دیتی رہیں
انبیاء و مرسلین کی تمام جنگ ایسے ہی خدایان باطل اور ان کے
پرستاروں سے رہی۔ ہمیشہ لڑائی اسی کی تھی کہ انبیاء چاہتے تھے کہ دنیا
حکومت الٰہیہ کے سامنے سر جھکا دے اور خدا طاقتوں کے علم بردار اس
حکومت کے ماننے سے انکار کرتے تھے۔

شاہی، شہنشاہی اور جمہوریت جتنی قسم کی حکومتیں سیاسی دنیا میں مروج
ہیں، ان سب کی بنیاد انسانوں پر خود انسانوں کی حکومت کا تخیل ہے
یہ حکومت ایک فرد کی ہو یا بہت سے افراد کی ملا کر بہر حال اس
خداوندی حق اقتدار کے خلاف ہے جس کے قائم کرنے کا اسلام علمبردار ہے
اس بارے میں اگر افراد انسانی کا اجماع اور فیصلے کوئی وزن رکھتا
ہو تو یاد رکھنا چاہیے کہ ہر نبی اور رسول کے مقابلہ میں اس وقت کے خدا
انسانوں کا ہمیشہ ایسا زبردست اجماع رہا جس سے بڑھ کر مشکل ہی سے
کوئی اجماع بنایا جا سکتا ہے۔ اگر انسانوں کی اکثریت کا کسی امر پر متفق ہو جانا
حقانیت کی دلیل ہوتا تو انبیاء کی نبوتیں اور مرسلین کی رسالتیں سب
بے حقیقت ہو جاتیں۔ انبیاء کا تو کام ہی یہ تھا کہ وہ خدا اجماعوں کو اپنی
ہدایت سے شکست دیں، اکثریت کے طلسم کو توڑ دیں اور اس
حقیقت سے روشناس بنائیں جو جمہور کی نگاہ سے اوجھل ہے۔
حاکم حقیقی خود ساختہ مصنوعی حاکموں کا تصادم ہی تھا جو خلقت آدم کے
بعد سے برابر اسلام اور کفر کی صورت میں نمودار رہا۔
یہ اسلام اور کفر کی جنگ حقیقت میں آزادی اور غلامی کی جنگ
تھی۔ غلامی ناجائز دباؤ کی ہو چاہے وہ نفسانی خواہشیں کیوں نہ ہوں
کہ اس میں بھی انسان کا ضمیر محسوس کرتا ہے کہ میں غلط کر رہا ہوں گو

جو اُس پر کسی کی قوت سے اپنے کو مجبور سمجھتا ہے۔ یہ قسم کسی کا آزادی کے ماتحت نہیں بلکہ گرفتاری کے نتیجہ میں ہوتا ہے۔ پھر کسی کے آگے طاقت کی غلامی، اکثریت کے دباؤ کی غلامی، پیروڈنگ کے ڈنڈے، فوج و لشکر کے دباؤ سے اور قید و بند کی دہشت سے کسی عقیدہ و اعتقاد کی غلامی۔ اسلام ظاہر میں اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا تھا۔ مگر اس اللہ کی بندگی کے پس پشت اس قسم کے ہر دباؤ سے آزادی تھی جو انسانی ضمیر کو راہ راست کے خلاف چلنے پر مجبور کرے۔ خواہ وہ ایک فرد کی حکومت ہو یا جماعت کی یا اپنے نفسانی خواہشات کی۔ اسلام ان سب سے آزادی کا پیغام ہے۔ وہ ضمیر کی حریت کا نام ہے جس میں قانون صرف عدل و اعتدال، نیکی اور فلاح عام کے اسباب کی ذمہ داری ہے یہاں کوئی تخت و تاج اور حشم و خدم کا مالک بھاری بھرکم تن و توش رکھنے والا شخص نظر نہیں ہوتا۔ جو ضمیر کو مجبور کرکے اس ضمیر سے تقاضے کے خلاف اپنی اطاعت کرائے۔ بلکہ احساسات کے حدود سے باہر ایک ان دیکھی طاقت ہے جو انسان کو ہر اچھائی کی تحریک کرتی اور ہر برائی سے روکتی ہے جس کا ایک ترجمان خود ہر ایک کا عقل و ضمیر ہے اور جس کے احکام ہمیشہ اس ضمیر کی آواز کے مطابق ہوتے ہیں یہ حاکم اللہ ہوتا ہے۔ اسلام کا قانون وہ ہے جسے قرآن نے جامع الفاظ میں اس طرح بتایا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَاۤئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۤءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ "اللہ کا فرمان عدل ہے اور احسان اور جس جس سے رشتہ ہو اس کے تقاضوں کا پورا کرنا اور مخالفت ہے ہر بے اعتدالی بدی

اور سیاہ کاری سے۔

انبیاء و مرسلین صرف اسی حکومت عدل کے احکام کی ترجمانی کرتے تھے انہوں نے کبھی خود اپنے کو حاکم نہیں کہا اور اسی لئے انبیاء کیلئے یہ ضروری ہوا کہ وہ جذبات سے بری اور ہوا و ہوس کی قید سے آزاد ہوں اسلیے ہی انسان کو معصوم کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ شخص خود نفسانیت میں گرفتار ہو تو وہ خلائق کو اس آزادی سے سعادت نہیں بنا سکتا جو اسلام کا حقیقی نصب العین ہے۔ پھر ممکن ہے کہ وہ خود حاکم ہونیکا خواب دیکھنے لگے اور اس طرح دنیا کو اللہ کے بجائے خود اپنے سامنے سر جھکانے کی دعوت دے۔ قرآن نے صاف الفاظ میں اس خطرہ کا اظہار کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اللہ کے فرستادہ نبی اور رسول اس سے بری ہوتے ہیں کہ وہ خلائق کو اللہ سے ہٹا کر خود اپنا غلام بنانے کی کوشش کریں۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (آل عمران)

چنانچہ جب حاکم غیر معصوم یعنی ہوا و ہوس میں گرفتار ہوگا تو اس سے یہ خطرہ ہمیشہ لگا رہیگا اور ایسے حاکم کو تسلیم کرنا الٰہی حکومت کے تقاضوں کے خلاف ہوگا۔

خداوندی آمریت کیلئے خدا اور رسولؐ کے اعلانات

انسان کی انسان پر جس طرح کی بھی حکومت ہو، خواہ آمریت، خواہ جمہوریت سب غلط ہے۔ انسان پر آمریت حاصل ہے تو صرف اللہ کو

اس کا اس کتاب محکم میں جو پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نازل کی گئی بار بار اعلان ہوا۔ یہ قرآن کی آیات اتنی واضح اور صاف ہیں کہ ان میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں ہے۔

ارشاد ہوا۔ لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ "خلق کرنا بھی اللہ کا کام ہے اور آمریت بھی اس سے مخصوص ہے" اس کے مقابلہ میں انسان کی کسی طرح کی خود مختاری اور خود رائی نہ انفرادی اور نہ شوریٰ درست ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة	کسی ایماندار مرد یا عورت کو یہ حق
اذا قضی اللہ ورسولہ امرا ان	نہیں کہ جب اللہ اور رسول کسی
یکون لھم الخیرة من امرھم	بات کا فیصلہ کر دیں تو پھر انہیں اپنے
ومن یعص اللہ ورسولہ فقد	معاملہ میں کچھ بھی اختیار حاصل ہو۔ اور
ضل ضلالا مبینا (احزاب)	جو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی
	کریگا وہ کھلی ہوئی گمراہی میں مبتلا ہوگا۔

یہاں تک کہ رسولؐ کی بھی اطاعت کا حکم ہوا تو یہ کہہ دیا گیا۔ کہ

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ	جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے
(آل عمران)	حقیقتاً اللہ کی اطاعت کی۔

یعنی رسولؐ کی بھی حکومت اللہ کے مقابلہ میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کی جانب سے بحیثیت نائب ہے۔ یہ صرف اس لئے کہ مسلمانوں کے ذہن میں اللہ کے سوا کسی دوسرے حاکم کے وجود کا تصور نہ ہو۔ اب رسولؐ کے بعد بھی جن اولی الامر کی اطاعت ہوگی وہ وہی ہونگے جنہیں اللہ اپنی طرف سے نیابت عطا کرے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ	اللہ ہی خلق کرتا ہے جو چاہتا ہے

لہٰذا منتخب کرنا بھی اسی کا کام ہے

اسی نیابت کے لحاظ سے جو اللہ کی طرف سے حاصل تھی پیغمبر خدا

کی آمریت کا اعلان ان الفاظ میں کیا گیا کہ

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ — "رسولؐ کو مومنین پر خود ان کے نفوس سے زیادہ اختیار ہے"

اور اسی کا اقرار رسولؐ نے ہزاروں کے مجمع میں روز غدیر خم خود

مسلمانوں سے کرایا۔ ان الفاظ میں کہ:۔

اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ اَنْفُسِکُمْ — "کیا مجھے تم سب پر تمہارے نفوس سے زیادہ حق نہیں ہے؟"

سب نے کہا بلٰی یعنی کیوں نہیں۔ حضورؐ آپ کو زیادہ حق ہے

یہ اقرار خود ان تمام مسلمانوں کی جانب سے خدا و رسولؐ کی آمریت

کے مقابلہ میں اپنے جمہوری و خود ارادی تصرفات کی نفی اور اس

حق کے سلب ہونے کا اعتراف تھا۔

مسلمانوں کے بالاعلان اس اعتراف و اقرار کی بنا پر ہی پیغمبر خدا

نے اپنے بعد کے لئے اعلان فرمایا:۔

مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ — جس کا میں مولا ہوں اس کا علی بھی مولا ہے۔

اس اعلان کے پس منظر کو دیکھنے کے بعد صاف نظر آ جاتا ہے کہ

علیؑ کی اس ولایت کو تسلیم کرنا، اللہ اور اس کے رسولؐ کی آمریت مطلقہ

کو تسلیم کرنے کا جو حقیقت اسلام ہے لازمی تقاضا ہے۔

اب اسی کا نام "شیعیت" ہو گیا۔ تو وہ کیا اسلام سے الگ کوئی

چیز ہے؟ یا حقیقت، یہ ہے کہ اسلام شیعی دعوت ہے۔ اور

یعنی دعوت عین اسلام ہے۔

اسلام میں دو فرقوں کی بنیاد

نبوت و رسالت کے عنوان سے الٰہی حکومت اور انسانی اقتدار کی جنگ کا آخری مورچہ تھا۔ جسے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ نے فتح کرکے لا الٰہ الا اللہ کی آواز اتنی قوت کے ساتھ عالم انسانیت تک پہنچادی کہ اب الٰہی اقتدار کے مقابلہ میں مادی اقتدار کے پرستاروں کو کھل کر سامنے کھڑے رہنے کی تاب نہ رہی اس لئے انہوں نے کلمہ پڑھ کر قبول اسلام کا اعلان کر دیا اور غدیر میں بھی پیغمبرؐ کے سوال کا جواب اقرار کی صورت میں دے دیا۔ مگر ان کی ذہنیت پورے طور سے بدلی نہ تھی اس لئے اب انہوں نے خود اسلام کے اندر "جمہوریت" کے نام سے ایک مکتب خیال کی بنا قائم کرلی جس کا نصب العین تھا الٰہی اقتدار کے بجائے انسانوں کے لئے حق خود ارادی قائم کرنا اور مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ مادی دلفریبی کی وجہ سے اس کا گرویدہ ہو گیا۔ جبکہ اسلامی تعلیمات کی حقیقی روح کے محافظین الٰہی اختیارات کے مقابلہ میں انسانی اقتدار کی کلیۃً نفی کے علم بردار رہے

یہ اختلاف تھا جو اب تک سنی اور شیعہ فرقوں کے نام سے قائم ہے

ہمارا جرم

ہمارا بنیادی جرم فقط یہ ہے کہ ہم ثبات قدمی کے ساتھ الٰہی حکومت

کے وفادار رہے اور اسی کو حق تسلیم کرتے رہے۔ اسی کا نام تولّا ہے اور ان حکومتوں کو جو خدا و رسولؐ کے مسلسل اعلانات اور قرآن و حدیث کے بلند بانگ تصریحات کے خلاف انسانی اختیارات کے نام پر اگر قائم ہوئیں ناجائز سمجھتے رہے۔ اسی کا نام تبرّا ہے جس کو ہمارے مخالف طرح طرح کے بدنما اسلوب میں پیش کرتے رہے ہیں اور اسے ہمارے کفر کی دلیل قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ کفر ہے تو وہی کفر جس کی دعوت ہمیں اسلام نے دی ہے (ومن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لہا)

ہماری اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس کفر پر قائم رہنے کی توفیق عطا کرے اور اس عروۃ الوثقیٰ (مضبوط رسی) سے تمسک رکھے جو کبھی شکستہ ہونے والا نہیں ہے۔

ہمارا دوسرا جرم

رسول اللہؐ کے دور میں جنہوں نے اسلام قبول کیا اور پیغمبر خداؐ کے جمال جہاں آرا کی زیارت کی ان سب کے لئے ایک اصطلاحی لفظ صحابی کا قرار پا گیا ہے۔

یہ صحابیت ہمارے نزدیک بھی ایک شرف ہے اور بہت بڑا شرف۔ مگر اس شرف کے کچھ عملی تقاضے بھی ہیں۔ جن میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ منہ دیکھے کی محبت کوئی چیز نہیں۔ اصل وفاداری اور دل و دماغ کے لحاظ سے رسولؐ کے مشن کے ساتھ وابستگی کا ثبوت یہ ہے کہ رسولؐ کے دنیا سے اٹھنے کے بعد بھی ان کے ارشادات اور اعلانات کے ساتھ وفاداری قائم رکھی جائے۔

ہمارا قصور یہی ہے کہ ہم نے صرف ابتدائی صحابیت یا اسلامی خدمات کو بھی (اگر وہ کچھ ہوں) قابل اعتبار نہیں سمجھا۔ بلکہ ہم ان صحابہ کو قابل احترام سمجھتے ہیں اور ان کے سامنے سرِ عقیدت جھکاتے ہیں۔ جو پیغمبر خدا ص کے بعد بھی برابر ان کے وفادار رہے ہوں اور اس اسلامی نظام سے غداری کے مرتکب نہ ہوئے ہوں۔ جسے الٰہی حکومت کی شکل میں پیغمبر خدا ص نے قائم کیا تھا۔

ہم نے اصول کو سامنے رکھا ہے اور اصول کے مقابلہ میں شخصیتوں کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔ نہ حق کے مقابلہ میں کثرت تعداد کا کوئی وزن سمجھتے ہیں۔ اس کو ہمارے مخالف بغض صحابہ کے نام سے ہمارا جرم قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر صحابیت ہی کے معیار پر دیکھا جائے تب بھی تو اہل بیت رسول شرف صحبت میں سب سے مقدم ہونگے جن کی محبت کو قرآن و حدیث کے رو سے ہم جزو ایمان سمجھتے ہیں پھر خود ان کی محبت محبت صحابہ کیوں نہ قرار پائے۔ اور جنہوں نے ان سے مخالفت کی، انہیں ایذائیں پہنچائیں اور طرح طرح کے مظالم کئے وہ بغض صحابہ کے مجرم کیوں نہ قرار پائیں۔

تعلیماتِ اسلامیہ کے دو مکتب

اور

ہمارا ایک اور بڑا جرم

معاملہ اگر فقط سلطنت و حکومت کا ہوتا تو اسے ایک زمانۂ خاص کی چیز سمجھ کر کم از کم اب نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ بعض 'اتحاد پسند' افراد یہ کہکر اب "گذشت و گذشت" کی دعوت دیتے ہیں کہ اب نہ وہ دنیا

میں ابوبکرؓ ہیں اور نہ علیؓ سامنے موجود ہیں سب یہ جھگڑا کیوں۔ کہ ان میں سے کس کی خلافت درست تھی؟ مگر بات تو فقط اتنی ہی ہے چونکہ اسلام میں دین و دنیا الگ نہیں اور یہاں صحیح سیاست مذہب سے جدا کوئی چیز نہیں اس لئے پیغمبر اسلامؐ نے منجانب اللہ جس طرح اپنے بعد کے لئے ایک نظام حکومت کے قیام کا اعلان کر دیا تھا اسی طرح تعلیمات اسلامی کتاب اور سنت کے صحیح علم کا مرکز بھی بتا دیا تھا کہ وہ یہی افراد ہیں۔

اس اعلان کے مختلف انداز تھے۔ کبھی ارشاد ہوا:-

اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں جب تک ان دونوں سے تمسک رکھو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے"

کبھی فرمایا:-

مَثَلُ اَھْلِ بَیْتِیْ کَمَثَلِ سَفِیْنَۃِ نُوْحٍ مَنْ رَکِبَھَا نَجَا وَمَنْ تَخَلَّفَ عَنْھَا غَرِقَ وَھَوٰی

"میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے۔ جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو اس سے الگ ہوا وہ غرق ہوا"

کبھی فرمایا:-

اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْیَاْتِ الْبَابَ

"میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔ جو علم کا طلبگار ہے

لئے دروازے پر آنا چاہیئے۔"

پیغمبرؐ کے بعد جب مسلمانوں کی اکثریت نے نظامِ حکومتِ اسلامی کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنا سیاسی مرکز الگ بنایا تو اب سیاسی مصالح اس کے متقاضی ہوئے کہ ان شخصیتوں کو جو ایک "محاذِ مخالف" کی حیثیت رکھتی ہیں ہر حیثیت سے مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل کیا جائے اور ان کی اہمیت کو ختم کر دیا جائے۔ اس لئے انہوں نے "تعلیماتِ دینی" کے لئے بھی الگ سے مرکز تلاش کئے۔ مگر رسولؐ نے بعثت سے اب تک جب کہ ان علوم کا مخزن و دار مخصوص افراد کو بنا دیا تھا تو انہیں یہ مرکز ملتے کہاں۔ لہٰذا جمع قرآن کے لئے زید بن ثابت وغیرہ ایسے کم سن صحابیوں کی خدمات حاصل کیں۔ تفسیر قرآن میں انبیائے سلف کے واقعات کے لئے نو مسلم علمائے یہود جیسے کعب الاحبار اور عبداللہ بن سلام کے زبانی روایات سے اپنے معلومات کے دامن کو وسیع کیا۔ احادیث رسولؐ کے لئے ابوہریرہ وغیرہ ایسے بیباک اور جمہور شناس کے حکایات و روایات کا سہارا لیا اور یہاں تک کہ فقہ اسلامی کی تدوین کا کام دوسری صدی تک نہ ہو سکا۔ اور بالآخر سو ڈیڑھ سو برس کے بعد پیدا ہونے والے امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل پر انحصار کیا گیا۔ جن میں سے سوا امام مالک کے سب رسولؐ کے محل ولادت اور محل اقامت یعنی مکہ اور مدینہ دونوں سے دور سرزمین عراق پر متولد ہوئے وہیں رہے اور وہیں مختلف الخیال علماء سے تحصیل علم کر کے اپنی اپنی رائے سے انہوں نے اختلافی مسائل میں کسی ایک شق کو اختیار کر لیا۔ مگر رسول اللہ کی معصوم ہستی کے بعد جنہوں نے ذہنی خودمختاری کو قائم رکھ کر رسولؐ کے ارشادات کو من و عن تسلیم نہ کیا۔ انہوں نے اب اختلافات سے گھبرا کر مذہب کے بارے میں ان چار ائمہ مجتہدین کی تقلید کو نہ صرف ان

کے دور کے لیے بلکہ قیامت تک کے واسطے واجب العمل قرار دیدیا ضروری سمجھا۔

ہمارا جرم اور بہت بڑا جرم یہ ہے کہ ہم نے رسول اللہ کے بعد جس طرح حکومت کا اقتدار صرف انہی کو سمجھا جن کے لیے خدا اور رسول کا اعلان ہو چکا تھا۔ اسی طرح دینی تعلیمات کے باب میں بھی صرف انہی کی رہنمائی قبول کی جہاں تک ان کے ارشادات کو سمجھنے اور ان سے نتائج نکالنے کا تعلق ہے۔ اس کا ضروری علوم سے واقفیت کے ساتھ ہر دور میں ہر شخص کو حق حاصل ہے اور اس معنی میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے لیکن جہاں تک اصل تعلیمات کے ماخذ کا سوال ہے ہم صرف ان ہی ارشادات کو دینی تعلیمات کا سرچشمہ سمجھتے ہیں جو قرآن، حدیث رسول اور آل اہلبیت معصومین سے پہنچے ہوں جنہیں پیغمبر نے اپنے علوم کا وارث قرار دیا اور بنایا تھا۔

ایک بہت بڑا فرق

علم اور عقل کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور ذوق تحقیق بالآخر حق تک رسائی کا ذریعہ بنتا ہے۔ حقیقت تفکر و تدبر سے متنفر نہیں بلکہ اس کی طلبگار ہے۔ اسی لیے قرآن کریم نے عقل کی آنکھوں پر پردے نہیں ڈالے بلکہ آنکھیں کھولنے کی دعوت دی۔ اس نے ہمیشہ اہل عقل سے غور و فکر نہ کرنے کا شکوہ کیا اور فکر و تدبر کا مطالبہ کیا۔ مگر جبر و تشدد سے قائم شدہ اقتدار ہمیشہ عوام سے قوت احساس کے سلب کرنے کے درپے رہا کرتا ہے اور غور و فکر کو خطرہ کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ جبری اقتدار کی بنیاد اسی پر ہوتی ہے کہ ایسا ہو گیا ہے۔ لہٰذا سب کو یہی ماننا چاہیے اور

جب بھی عوام یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اصل میں ہونا کیا چاہیئے۔ تو ہر ایسے غلبہ و اقتدار والا نظام اپنے لئے خطرہ محسوس کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد برسر اقتدار آنے والی حکومت نے مذہب سے عقل کو بے دخل کیا اور یہ اصول قرار دیا کہ بجائے خود حسن و قبح کوئی چیز نہیں ہے۔ حکم حاکم وہ ہے جو حسن اور قبح کا معیار ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ دیکھو کیا ہے اور بس جو ہوا اسی کو گوارا کر لیا جائے

اس کے برخلاف رسول اسلامؐ اور انہی کی طرح ان کے بعد اہل بیت رسولؑ کی یہ تعلیم رہی کہ اصول مذہب عقلی ہیں اور حسن و قبح بھی عقلی ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز میں پہلے اپنی عقل پر زور دے کر یہ سمجھ کہ ہونا کیا چاہیئے اور جب یقینی طور پر یہ سمجھ میں آ جائے تو یقین کر لو کہ حقیقت میں ایسا ہی ہے بھی۔

اس سے ہمارے اور ہمارے اغیار کے فکر کے زاویے بدل گئے ہم حسن و قبح کو عقلی سمجھتے ہیں۔ اس لئے جو ہونا چاہیئے اسی کو مانتے ہیں۔ اور اس کے خلاف جو ہو اسے غلط جانتے ہیں۔

بے شک تعبدی احکام جن میں ہماری ناقص عقل دسترس نہیں رکھتی ان کو خود عقل ہی کے کہنے سے خالق کے مقرر کردہ معلم کے ارشادات سے معلوم کریں گے۔ مگر جہاں جہاں عقل بطور خود رہنمائی کرتی ہے وہاں پھر عقل کے فیصلہ کو ہم قطعی حجت و دلیل سمجھتے ہیں

لیجیے تو وہ اصول کہ "جو دیکھو کیا ہے اور جو ہو اسے حق سمجھو" اگر بنیادی طور پر کار فرما ہو جائے تو حق تعالیٰ کے وجود ہی کو ماننا بے بنیاد ہو جائے۔ کیونکہ وہاں تو ابھی اس کے دیکھنے کا بھی امکان نہیں۔ پھر اسے حق کیونکر سمجھیں۔ اس پر یقین کی بنیاد فقط یہی ہے کہ کائنات عالم کے حدوث و

بنا کے لئے مفروضہ" ایک خالق و پروردگار کو ہونا چاہئے ورنہ اس نے مفروضہ ہے۔

پھر جب دین کا پہلا سنگِ بنیاد صرف عقل کی رہنمائی سے قائم ہوتا ہے تو اس کے بعد کبھی بھی عقل کو دین سے بے دخل کیونکر کیا جا سکتا ہے۔

اس کے دُور رس نتائج

اندازِ فکر کے اس اختلاف نے ہمارے اور ہمارے غیروں کے درمیان اب مبداء سے لے کر معاد تک ایک بہت بڑی خلیج حائل کر دی اور اس کے بعد "امامت و خلافت" ہی میں نہیں بلکہ توحید، رسالت اور معاد تک میں شیعی اور سنی نقطۂ نظر الگ الگ ہو گیا۔ ان میں سے ہر جگہ درحقیقت پیغمبرِ اسلامؐ کے بتلائے ہوئے اسلام کا صحیح عقیدہ وہی ہے جسے "شیعیت" کہتے ہیں اور اس کے خلاف جو عقیدہ ہے وہ اس سے مختلف مکتبِ خیال کی پیداوار ہے جس نے مذہب کو غیر عقلی بنا کر ہی اپنے مصالح کے لحاظ سے ضروری سمجھا۔

ہمارے امتیازی عقائد

یا

اسلام کے حقیقی اصول

توحید:-

(۱) اللہ ایک ہے۔ محض ایک۔ ہر طرح سے ایک۔ یہ نہیں کہ اس میں ایک ذات ہے اور کئی صفات اور یہ (مستقل قدیم) ہیں سب مل کر تو کا مجموعہ ایک خدا ہے۔ یہ سنیوں کا عقیدہ ہے جو نصاریٰ کی تثلیث

سے تین گنا بڑھا ہوا ہے۔

قرآن نے نصاریٰ کو متنبہ کیا ہے کہ لا تقولوا ثلثۃ انما ھو اللہ واحد۔ اسی طرح ہمارا امام مسلمانوں سے یہی تقاضا ہے کہ لا تقولوا ثلثۃ انما ھو الہ واحد

اللہ کی ذات ہی ہر طرح کے کمال پر حاوی ہے۔ اس کے لئے ذات سے ماسوا صفات کی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) وہ جسم اور جسمانیات سے بری ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کان آنکھ وغیرہ نہیں ہے۔ نہ وہ کسی مکان اور مستقر میں محدود ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ وہ عرش پر بیٹھا ہوا ہو اور عرش اس کا جسمانی مکان ہو۔

قرآن میں جو الرحمٰن علی العرش استویٰ ہے اس کے معنی غلبہ واقتدار کے ہیں جو خالق کے شایان شان ہے نہ کہ تمکن واستقرار کے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔

ہمارے خلاف محمد بن عبدالوہاب کے پیرو (وہابی) جماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ عرش پر متمکن ہے۔ عرش پر سے اترتا اور آسمانوں کی سیر کرتا ہے اور آسمان اول پر آکر صدا دیتا ہے کہ کون مجھ سے مغفرت کا طالب ہے کہ میں اسے بخش دوں! کون مجھ سے دعا مانگنا چاہتا ہے۔ جس کی دعا میں قبول کروں — یہ باتیں شان الوہیت کے خلاف ہیں۔ جن کا حقیقتِ اسلام سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔

۳- جبکہ وہ جسمانیت سے بری، مکان وسمت وجہت کی پابندیوں سے بالا ہے تو اسی بنا پر ہم جانتے ہیں کہ آنکھوں سے اسے دیکھنے کا تصور بھی غلط ہے نہ اس دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ کیونکہ جو شے آنکھوں سے دیکھی جائے وہ سمت وجہت اور مکان میں محدود بن جائے گی اور یہ بات

شانِ الٰہی کے بالکل منافی ہے اور جبکہ اس کی الوہیت میں حال و مستقبل اور دنیا و آخرت کا کوئی فرق نہیں تو لقاء و رویت میں دنیا اور آخرت کا فرق قرار دینے کے کیا معنی ہیں۔ اس لئے قرآن مجید کا اعلان ہے

لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ

ہمارا عقل کے اسی فیصلہ اور قرآن کے اسی اعلان پر ایمان ہے اس کے برخلاف دوسرے مسلمان قیامت میں اس کے دیدار کی امید لگائے ہوئے ہیں جو تعلیم اسلام اور قرآن کے خلاف ہے۔

(۲) عدل۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ کا ہر فعل (کام) جو کچھ ہے وہ درست و مناسب اور خیر ہو اور اس کے ہر کام میں کوئی مقصد صحیح مضمر ہوتا ہے کوئی کام عبث نہیں ہوتا۔ نہ ظلم اور شر کا اس میں گزر ہو سکتا ہے۔ یہی وہ عقیدۂ عدل ہے جو توحید کے بعد ہمارے اصول دین کا ایک جز ہے دوسرے مسلمان یہ کہتے ہیں کہ اللہ قادر مطلق ہے۔ لہٰذا وہ جو چاہے کرے اور اس سے ظلم روا اور ہر بات اس کے لئے روا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ جبر کا وہ اصول ہے جسے قہر و غلبہ کے جواز کے لئے سلاطین بااقتدار نے اپنے اعمال کے محاسبہ کی گرفت سے نکلنے کے مقصد سے وضع کیا ہے اور اسی کو سہارا کر سیاست کے زیر سایہ رائج شدہ اسلام کے اصول عقائد میں اللہ پر منطبق کر دیا ہے جو اللہ کی شانِ جلال و کمال کے خلاف ہے۔ اور اسی لئے قرآن نے بار بار اس کے خلاف اعلان کیا ہے۔ کبھی مثبت طور پر اس طرح کہ

تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ

"تمہارے پروردگار کی بات سچائی اور عدالت میں بھرپور ہے اس کی بات کبھی بدلتی نہیں" — اور کبھی منفی صورت سے ان الفاظ

ہیں کہ اِنَّ اللّٰہَ لَیْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ "اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا"
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ "اللہ کے یہاں ذرہ برابر بھی ظلم نہیں ہے" ہمارا عقیدہ یہی ہے اور یہی حقیقی اسلام کی تعلیم ہے۔

۵۔ ہمارے نزدیک انسان فاعل مختار ہے اور وہ خود اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اسی سے اس کو جزا و سزا کا استحقاق ہے۔

اس کے خلاف دوسروں کا عقیدہ یہ ہے کہ انسانی افعال کا اصل فاعل پروردگار ہے اور انسان اس کے افعال کا آلۂ کار ہے۔ اس صورت میں اس کو جزا و سزا کا دیا جانا خالق کی طرف سے ظلم قرار پاتا ہے جو اصول عدل کے خلاف ہے۔

قرآن کا ارشاد ہے۔ وَمَا ظَلَمَھُمُ اللّٰہُ وَلٰکِنْ اَنْفُسَھُمْ کَانُوْا یَظْلِمُوْنَ "اللہ نے ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔ وہ خود اپنے نفوس پر ظلم کرتے تھے" — اس طرح صاف فعل ظلم کی اللہ سے نفی کی گئی ہے اور اسے بندوں کا فعل قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کی حقیقی تعلیم یہی ہے۔

نبوت۔

۶۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خالق نے خلائق کی ہدایت کیلئے اپنی طرف سے رہبر مقرر کئے۔ ان رہبروں کو انبیاء و مرسلین کہتے ہیں۔ یہ انبیاء و مرسلین انسانی اخلاق و کردار اور طرز و صفات میں وہ معیاری درجہ رکھتے تھے کہ خلق خدا کے لئے نمونہ بن سکیں۔ اس لئے ان کے افعال میں عمداً اور سہواً کسی طرح بھی کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔ انبیاء ہر طرح کے گناہوں سے ہر عمر میں معصوم ہوتے ہیں۔ ان سب میں افضل و برتر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے جو آخری نبی اور آخری رسول ہیں۔ اور اس لئے آپ کی سیرت مبارک بھی اتنی بلند تھی کہ وہ عام خلق خدا ہی کے لئے نہیں بلکہ

انبیاء و مرسلین کے لئے بھی معیاری نمونہ تھی۔ اور اسی لئے مثل قرآن مجید کے آپ کی سیرتِ طیبہ اور سنتِ مبارکہ بھی قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے قانونِ اسلام کا ایک اہم ماخذ ہے۔

ہمارے خلاف دوسرے مسلمان نفسِ انبیاء کی عصمت کا اقرار کر لیتے ہیں مگر کبھی تو ان کی زندگی کے مختلف حالات کے لحاظ سے تفریق کرتے ہیں کہ رسالت کے بعد وہ معصوم تھے مگر رسالت سے پہلے گناہ کا وقوع ہو سکتا ہے۔ کبھی اقوال و اعمال کی رسالت اور بشریت کی حیثیتوں میں فرق کرتے ہیں کہ بحیثیت رسول جو اقوال و افعال ہوں وہ غلطی سے بری ہوتے ہیں اور بحیثیت بشر جو ہوں ان میں غلطی کا امکان ہے۔

اسی کا ایک شاخسانہ وہ ہے جو اس زمانہ میں بڑی شدت اختیار کر گیا ہے کہ کتابِ خدا یعنی قرآن صرف قانونِ اسلام کا سرچشمہ ہو سکتا ہے اور سنتِ رسولؐ وقتی چیز تھی۔ وہ کوئی ناقابلِ تبدیلی شے نہیں ہے۔ جس کی پیروی ہمیشہ کے لئے ضروری ہو۔

یہ سب تصورات ہمارے نزدیک شانِ رسالت کے خلاف ہیں پیغمبر کی بشریت کا بلند معیار ہی تو خالق کی طرف سے رسالت کے لئے ان کے مبعوث ہونے کی اصل وجہ ہوتا تھا جیسے قرآن نے ان الفاظ میں ظاہر کیا ہے کہ "اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ" اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ اپنی رسالت کہاں قرار دے۔ پھر ان کے کردار میں بشریت کے پہلو کو نیچا اور رسالت کے جنبہ کو اونچا قرار دینا کہاں درست ہو سکتا ہے؟ سنتِ رسولؐ اور سیرتِ مقدسہ کی پیروی کی دعوت بھی خود قرآن میں ہی صاف صاف موجود ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ (آل عمران)

ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ بھی تمہیں دوست رکھیگا۔

اگر صرف قرآن کافی ہوتا تو پیغمبر کی پیروی پر رضائے الٰہی کا انحصار نہ کیا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ رسول کے اقوال و اعمال کے مقابلہ میں حسبنا کتاب اللہ کا نعرہ لگانا خود کتاب اللہ کی مخالفت کرنا ہے

امامت:۔

۷۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح نبوت و رسالت کا تقرر خالق کی جانب سے ہوتا ہے اسی طرح رسول کے بعد حکومت الٰہیہ کے امام کا تقرر بھی منجانب اللہ ہوتا ہے۔ اس میں انسانوں کے اجماع و شوریٰ وغیرہ کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اور یہ سلسلہ یکے بعد دیگرے خالق کا مقرر کردہ تاقیامت قائم ہے۔ دوسرے مسلمانوں نے رسول کے بعد اس اختیار کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اس کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے۔

قیامت:۔

۸۔ قیامت کے بارے میں ہمارا عقیدہ یہ ہے جو قرآن و حدیث پر مبنی ہے کہ جزا و سزا کے لئے اسی جسم اور اسی روح میں دوبارہ تعلق قائم کرکے ہر شخص کو نشاۃ ثانیہ عطا کیا جائے گا۔ اور حساب و کتاب کے بعد اچھوں کو بہشت میں اور بروں کو دوزخ میں بھیجا جائے گا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ روح خود ایک جوہر ہے۔ جو اس جسم سے مفارقت کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔

دوسرے مسلمانوں کی اکثریت جسم سے الگ روح کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی اور معاد کے معنی یہ قرار دیتی ہے کہ جزا و سزا کے لئے جسم میں پھر روح پیدا کی جائیگی۔

اس صورت میں عالمِ برزخ جو تمام مسلمانوں کے نزدیک ایک مسلّمہ حقیقت ہے کوئی شے نہیں رہتا۔

ہم اس کو اسلامی تعلیم کے خلاف سمجھتے ہیں۔

فقہی اختلافات

یہ وہ اختلافات تھے جو اصول عقائد سے متعلق ہیں۔ اس کے بعد مسائل و احکام شرعیہ میں بے شمار اختلافات ہو گئے ہیں۔ جن میں ہمارا مسلک ہمیشہ تعلیم اہل بیتؑ کے مطابق ہوتا ہے اور دوسرے مسلمان یہ اقرار کرتے ہیں کہ اہل بیتؑ رسولؐ کی تعلیم یہ ہے مگر خود عملی طور پر ابو حنیفہ وغیرہ کی پیروی کرتے ہیں۔ جیسے وضو میں ہمارا مسلک پیروں کا مسح جو قرآن مجید کی تعلیم کے عین مطابق ہے اور دوسروں کا مسلک پیروں کا دھونا جو قرآن کے خلاف ہے۔

نماز میں ہمارا طریقہ ہاتھ کھول کر جو اہل بیت رسولؐ ہی نہیں بلکہ اہل سنت کے بھی چاروں اماموں میں سے امام دار الہجرہ مالک بن انس کے فتوے کے مطابق ہے جو یقیناً سنت رسولؐ سے مدینہ منورہ میں قیام کی بنا پر زیادہ واقف ہو سکتے تھے اور سنیوں کا طریقہ ہاتھ باندھنا ہے جو رسولؐ کی وفات کے ڈیڑھ سو صدی بعد کوفہ میں پیدا ہونے والے عالموں کے فتوے کے مطابق ہے۔

ایسے ہی دیگر زندگی کے شعبوں کو سمجھنا چاہیے جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔

حکومتوں کا پروپیگنڈا

اور

ہمارے خلاف اتہامات

چونکہ ہم نے خدا و رسول کی وفاداری کے پیش نظر ان حکومتوں کو تسلیم نہ کیا جو مسلمانوں پر تخت و تاج کی مالک بن گئی تھیں۔ اس لئے ہمیشہ حکومت کی مشینری ہمارے خلاف متحرک رہی۔ ہمارے خلاف طرح طرح کے پروپیگنڈے کئے گئے۔ جنہوں نے مستقل اتہامات کی شکل اختیار کر لی اور حکومت کے کاسہ لیس اور اکثریتی خیال کے علماء نے انہیں اپنی کتابوں میں درج کر دیا۔

یہ اتہامات وہ ہیں جنہیں حقیقت پسند افراد کو ہم سے متنفر بنانے کیلئے ہمیشہ پیش کیا جاتا رہا ہے۔ پھر اس میں عوام کی اکثریت نے جو ہمارے خلاف تھی ہر دور میں اپنی افواہوں سے اضافہ کیا۔ جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور ہمارے خلاف نئے نئے اتہامات کی پیداوار ہوتی رہتی ہے۔

ان میں سے کچھ اتہامات اور ان کے مقابل میں جو اصل حقیقت ہے اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(۱) یہ عقیدہ کہ خدا تعالیٰ (معاذ اللہ) پشیمان ہو سکتا ہے۔" یہ ہماری جانب وہ نسبت ہے جسے اپنی کتابوں میں درج کرنے سے سواد اعظم کے بڑے بڑے مقدس و متورع علماء بھی نہیں جھجکتے۔ حالانکہ ہم اللہ، اس کے ملائکہ، تمام مرسلین اور بندگانِ صالحین کو گواہ کر کے یہ اعلان کرتے ہیں کہ یہ ہم پر محض تہمت اور افتراء ہے۔

یہ بالکل ویسا الزام ہے جیسا نسخ کے عقیدہ کی بنا پر تمام مسلمانوں کے
خلاف یہود و نصاریٰ الزام لگاتے ہیں کہ اللہ شریعتوں میں تبدیلی کرتا ہے
تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسے پچھتاوا ہوتا ہے اور اس لئے ایک قانون کو منسوخ
کر کے وہ دوسرا قانون نافذ کرتا ہے۔ تمام مسلمان اس کے جواب میں یہی
کہتے ہیں کہ نہیں۔ تبدیلی پچھتاوے کی بنا پر نہیں بلکہ حالات و مصالح کی تبدیلی
کی بنا پر ہوتی ہے۔ بس اسی طرح ہم تغیرات الٰہیہ میں بدا کے قائل ہیں
جس کے معنی یہی ہیں کہ مصالح و حالات کی تبدیلی سے مقدرات میں تبدیلی
کی جاتی ہے۔ اس کی نظیریں تمام مسلمانوں کے متفق علیہ مسلمات میں موجود ہیں
اور مغفرتِ ذنوب، قبولیتِ دعا، شفاعت، صدقہ و خیرات سے ردِ بلا وغیرہ
کیا ہے؟ یہ سب احکام میں تبدیلیاں ہی تو ہیں۔ بس اسی کو بدا کہتے ہیں۔ جس
کا قرآن مجید کی اس آیت میں بیان ہے کہ يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهُ
اُمُّ الْكِتَابِ "اللہ جو بات چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو بات چاہتا ہے قائم
رکھتا ہے۔ اور علم کا اصل خزانہ اس کے پاس ہے" اور یہ عقیدہ تو قرآن میں یہود
کا بتایا گیا ہے کہ ازل میں اللہ کو جو فیصلے کرنا تھے وہ اس نے کر دیئے۔ اب وہ
نہیں کر سکتا۔ اور اسکی قرآن نے بڑی شدت کے ساتھ رد کی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے
وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ
يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ "اور یہودیوں کو سنو۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے
ہوئے ہیں وہ اب کچھ نہیں کر سکتا۔ خود انہیں کے ہاتھ بندھے ہوئے ہونگے اور یہ
اپنے اس قول سے ملعون قرار پائیں گے۔ اللہ کے ہاتھ تو ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں"
اسکے بعد یہ پروپیگنڈے کی طاقت نہیں تو اور کیا ہے کہ یہود کے خیال کے مطابق اس کو
جانا تو اسلامی عقیدہ قرار پا جائے اور وہ عقیدہ جو قرآنی تعلیم کے مطابق ہے اسے
عیب کا لباس پہنا دیا جائے کہ شیعہ (معاذ اللہ) اللہ کی پشیمانی کے قائل ہیں۔

۲۔ یہی بعد کی طرف نسبت دی یہ کہا جاتی ہے کہ شیعہ حضرت علیؑ کو رسول اللہؐ پر فضیلت دیتے ہیں ان کا دعویٰ ہے خلافت بھی ان کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے کہ جبرئیل امین رسالت کی وحی حضرت علیؑ کی طرف لائے تھے مگر دھوکے سے حضرت محمد مصطفیٰؐ تک پہنچا دی نعوذ باللہ من ھذہ الخرافات۔ شیعہ امامیہ اثنا عشریہ آج دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں ہر جگہ ان کے علماء ہیں ان کی کتابیں ہیں اور ان کے مدارس۔ کہیں بھی دریافت کر لیا جائے تو کہیں اس کی کوئی اصلیت نہ ملے گی۔ بیشک شیعہ بعد خاتم الانبیاء حضرت علی ابن ابی طالب کو تمام کائنات سے افضل مانتے ہیں جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور بات شیعوں کی طرف منسوب کرنا بہتان عظیم ہے۔

۳۔ ایک بہت بڑا بہتان تمام فرقہ شیعہ پر یہ ہے کہ ان کا قرآن پر ایمان نہیں ہے کیونکہ لئے کہ یہ تحریف قرآن کے قائل ہیں۔ اس امر کی پوری تفصیل سے ہم نے اپنے رسالہ تحریف قرآن پر نظر نیز مقدمہ تفسیر قرآن میں چھاپ کیا ہے۔ یہاں اس قدر عرض ہے کہ اگر کچھ روایات کے وجود کی بنا پر کسی فرقہ کی جانب کوئی عقیدہ منسوب کرنا درست ہے تو ہم اپنی دیانت کے ساتھ یہ لکھنے کے لئے تیار ہیں کہ ہم شیعوں سے پہلے سنی تحریف قرآن کے قائل ہیں۔ بلکہ کثرت سے ان کے یہاں روایتیں اس طرح کی موجود ہیں اور اگر صرف روایات سے کسی فرقہ کے عقیدہ کو ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ خود اس فرقہ کے علماء ان روایات کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں تو حقیقت یہ ہے کہ محققین علمائے شیعہ قرآن کے الفاظ میں کسی زیادتی یا کمی ہو جانے کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ آج سے ایک ہزار سال پہلے چوتھی صدی کے عالم جناب شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی نے اپنے رسالہ اعتقادات میں لکھ دیا ہے کہ ہمارا اعتقاد یہ ہے کہ قرآن یہی ہے جو ان دفتین میں موجود ہے اس میں کوئی زیادتی یا کمی ہرگز نہیں ہوئی ہے۔ بے شک اس کی ترتیب شان نزول کے مطابق نہیں ہوئی ہے۔ اسے سب ہی مسلمان تسلیم کرتے

پر مجبور ہیں اور اکثر تسلیم کرتے ہیں۔

۴۔ بعض جسارت پسند ہماری طرف یہ عقیدہ بھی منسوب کر دیتے ہیں کہ شیعہ تناسخ کے قائل ہیں۔ حالانکہ واقعۃً بالقصد اس قول تناسخ اور اس کا اعتقاد رکھنے والوں کو ہم اسی طرح کافر جانتے ہیں جیسا کہ تمام مسلمان۔ ان بہانے سے یہاں رجعت کے بارے میں احادیث وارد ہیں۔ مگر رجعت کو تناسخ قرار دینا بالکل ویسا ہے۔ جیسے کوئی حشر و نشر کو جو تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے تناسخ سے متحد جانے۔ تناسخ کیا ہے؟ ایک شخص کا مرنے کے بعد پھر دوبارہ کسی اور کے پیٹ سے پیدا ہونا۔ یہ عقیدۂ اسلامی کے خلاف ہے۔ مگر رجعت مثل قیامت کے اسی شخص کا اپنے اسی جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیا جانا ہے۔ اسے تناسخ سے کیا واسطہ!

قرآن مجید میں اسے حشر ہی کے لفظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ویوم نحشر من کل امۃ فوجا ممن یکذب بآیاتنا فھم یوزعون "ہم ہر امت میں کے گروہ افراد انہوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی ان کو محشور کرینگے" پھر جس طرح قیامت کا حشر کلی تناسخ سے مختلف چیز ہے۔ اسی طرح اس حشر جزئی کو جس کا ذکر اس آیت میں مذکور ہے تناسخ میں داخل کرنا صحیح نہیں ہو سکتا۔

۵۔ بڑی مشہور تہمت ہماری جانب سب و شتم صحابہ اور عام طور سے ان کی نسبت گالم گلوچ کی نسبت سے عائد کی شیعوں کا معیار تہذیب و شائستگی ہم اور دوسروں سے جدا ہے ہم بھی بکثرت ایسے افراد میں جنکی زبان بچپنے سے لیکر آخر عمر تک کسی ایک دفعہ بھی فحش کے الفاظ سے آشنا نہیں ہوئی مگر ضرورت اور موقع کے لحاظ سے کسی کے اعمال پر تنقید نظر مذہب تاریخی کا نام اور حرف نہیں اور سب سے بڑی ضرورت اس گمراہی کا رفع کرنا ہے جو کچھ اشخاص کے ساتھ حسن ظن کی صورت میں صراط مستقیم سے علیحدگی کا باعث ہو رہی ہو۔ اسی ضرورت سے قابل مذمت اشخاص کی مذمت قرآن مجید تک میں موجود ہے جس سے بڑھ کر اخلاق بلند کا معیاری نمونہ کوئی تصور میں نہیں لایا جا سکتا۔ اسی طرح لعنت کو گالی قرار دینا بھی غلط ہے جبکہ قرآن میں متعدد جگہ لعنت موجود ہے ہم قرآن مجید کی ہر چیز کو اسی طرح جس طرح اصل اور اعمال بطور استحقاق مذمت سمجھتے ہیں اسی طرح

مخالفین تعزیہ داری اس کو مستحق لعنت سمجھتے ہیں۔ رہ گیا تعزیہ کا لفظ۔ اس کے اصل معنی
کسی صدمہ ذہنی اور عمل بے تعلقی میں ہوا کرتے ہیں ان کی بابت قرآن سے صریح بابت
کوئی ثبوت کر دیا جائے جس کی ابتدا تیمور سے ہوئی ہے

۶۔ ہماری طرف بر تعزیہ پرست ... ہے کہ شیعوں کے یہاں [illegible] معجزہ کا
واجب ہے۔ یہ بھی سراسر الزام ہے ہم تعزیہ کو عظیم جانتے ہیں اور ... یہ
کہ لعنت الٰہی کا مستحق سمجھے ... بخاری کی اس حدیث [illegible]
ابراہیم نے (معاذ اللہ) ... ہم ... حالات اور ... ہیں
... [illegible] ... کے علاوہ ... کے ... کی ... مناسب
موقع کی شرط ہے ... وقت ... کے ... حساب ... اسی
طرح ... مسلمان ... اصلاحی ... تو ... لغو
(معاذ اللہ) ہو سکتا ہے کہ جب ... فعل قرآنی ... ہوگا ... جب
حکم الٰہی قرآن ... عمل پیدا ... حفاظت نفس کے لیے ... حق کو
... نسیم قرآن ... [illegible]
قلبہ مطمئن بالایمان ... الا ان تتقوا منہم
تقٰۃ تمام مفسرین متفق ہیں کہ ... [illegible]
... [illegible]
کے ساتھ ... [illegible]
... تقیہ کا حکم نہیں ... حرام ہو جاتا ہے۔ کربلا میں حضرت امام
حسین علیہ السلام کی قربانی ... [illegible]
تک قائم رکھی ہے۔

۷۔ ... (معاذ اللہ) تعزیہ پرست ... ہیں ... پوچھتے ہیں
کہ حقیقت امر یہ ہے کہ کوئی شیعہ تعزیہ کو مستحق پرستش نہیں سمجھتا۔ وہ صرف مرتبہ
امام حسین کی شبیہ ہے ... [illegible] ... اور اس نسبت کی بنا پر اس کا
احترام کیا جاتا ہے۔ اگر یہ احترام اصل پرستش ہو جائے ... مسجد اور کعبہ اور قرآن
سب ہی کا احترام پرستش قرار پائے گا اور شرک میں داخل ہوگا۔

۸۔ ایک الزام اور بہتان ہمارے خلاف یہ ہے کہ شیعہ عید نوروز اور عید غدیر پر زنا و لواطہ
ہر حرام کو حلال قرار دے لیتے ہیں معاذ اللہ وکلا والی اللہ المشتکیٰ۔ حقیقت یہ ہے کہ
ہمارے یہاں عید نوروز اور عید غدیر مثل عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے نمازیں اور دعائیں
وارد ہیں جو ذکر الٰہی پر مشتمل ہیں اور ان متبرک دنوں میں ہمارے ہاں خیر و خیرات کا اہتمام
دوسرے تمام دنوں سے زیادہ کیا جاتا ہے اس کے خلاف جو بھی کہا جائے وہ افترا و بہتان کے
سوا کچھ نہیں ہے۔

۹۔ کہا جاتا ہے کہ شیعوں کے یہاں حضرت امام حسینؑ کی عزاداری کو [illegible] سمجھا جاتا ہے
اور نماز و روزہ کسی چیز کی ضرورت میں نہیں جاتی ۔۔۔ یہ بھی غلط اور افترا محض ہے ہم
نماز و روزہ کے وجوب کو ضروریات دین سے جانتے ہیں اور اس کے منکر کو کافر کہتے ہیں اور
محبت اہل بیتؑ کا حقیقی تقاضا احکام الٰہی کی اطاعت ہی کو سمجھتے ہیں

اس کے علاوہ اور بہت سی بے بنیاد الزامات ہیں جو صرف نفرت پیدا کرنے کے لئے ہم پر
عائد کر دی گئی ہیں مثلاً شیعہ جنت کو جو پانی وغیرہ دیتے ہیں وہ متبرک کر دیتے ہیں یا تازہ
تازہ تہمت جو پاکستان اور بالخصوص کراچی کے کچھ حلقوں میں پھیلی ہے کہ ہر سال شیعہ کسی
سنی کو حلال کرتے ہیں اور زنجیر کی چادر پر جو سرخ دھبے ہوتے ہیں وہ سنی کے خون کے
چھینٹے ہوتے ہیں۔ یہ ایسی مجر لچر اور بے بنیاد باتیں ہیں جن کی رد کسی علمی رسالے کے
شایان شان نہیں ہے۔

اللہ مسلمانوں کو توفیق عطا کرے کہ وہ حق پرست حق کے معیار سے غور کریں
اور ایسی بیہودہ کتابوں پر اعتماد نہ کریں جنہیں اہل باطل صرف حق سے منحرف بنانے
کے لئے تصنیف کیا کرتے ہیں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

"مذہب شیعہ"
ایک نظر میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام
علٰی رسولہ محمد وآلہ الطاہرین

شیعیت کیا ہے؟

دین اسلام کو اس کے تمام نظری اور عملی تقاضوں کے ساتھ اختیار کرنا۔ اسلام کے معنی ایک "سر نہادن بطاعت" کے ہیں اور دوسرے "سپردن" ۔ یہ دونوں باتیں کس کے لیے؟ اللہ کے لیے اس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کو اس کے پورے تقاضوں کے ساتھ تسلیم کرنا جس کے لیے حاکم اور اس کے مرتب کردہ نظام کی معرفت ضروری ہے۔ یہ "اصول دین" ہیں اور پھر اس نظام کے قواعد و ضوابط کو معلوم کر کے ان پر عمل ہے۔ یہ "پابندی شریعت" ہے جس کے خاص ارکان کو "فروع دین" کہتے ہیں۔

یہ عقائد وہ ہیں جو عمل کا احساس پیدا کرتے ہیں اور اعمال وہ ہیں جو عقائد پر جلا کرتے ہیں۔

جامع لفظ سے تعبیر کرنا چاہیں تو برابر کے دو جزو ہیں :-

"حق شناسی" "فرض شناسی" - اسی کو وسعت دی جائے تو عقائد و اعمال کی پوری دنیا آجائے اور انہی کے ماننے اور برتنے کا نام ہوگا "حقیقی اسلام" اور "شیعیت" جس کی تفصیل مجمل طور پر یہ ہے :-

اصولِ دین:

(۱) توحید (۲) عدل (۳) نبوت (۴) امامت (۵) معاد - اب ان میں سے ہر ایک کی کسی حد تک تشریح پر نظر ڈالیے :-

توحید

یہ ایک جامع عنوان ہے جس کے تحت میں حسب ذیل تحقیق مطلوب ہے -

(۱) حدوث عالم یعنی دنیا اور اس کی ہر چیز نابود تھی۔ ہوا، پانی، آگ، زمین، چاند اور سورج اور ستارے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ہمیشہ موجود ہو اور وہ چھوٹے چھوٹے ذرے بھی جن سے اس تمام دنیا میں مختلف شکلیں نمودار ہوئی ہیں وہ بھی قدیم یعنی ہمیشہ سے موجود نہیں ہو سکتے اس لیے کہ ان میں حرکت موجود ہے اور حرکت کا ہونا خود زوال اور تغیر کی نشانی ہے۔

(۲) خالق کا وجود۔ جب یہ تمام کائنات ہمیشہ سے وجود نہیں رکھتی تو ضرور اس کا کوئی وجود میں لانے والا ہے، اسی کو خالق کہتے ہیں۔

(۳) خالق کل جو ہے وہ سرچشمۂ ہستی ہے۔ اس لیے ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر وہ بھی اسی دنیا کا جزو ہوا اور اس کے واسطے بھی کسی پیدا کرنے والے کی ضرورت ہو۔

(۴) خالق نے اس دنیا کو ارادہ واختیار کے ساتھ پیدا کیا ہے اس لیے کہ اس کی پیدا کی ہوئی مخلوق میں حکمتیں اور مصلحتیں مضمر ہیں اور ایک خاص انتظام نظر آتا ہے جو کسی بے شعور اور بے حس قوت کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

(۵) کمال ذات مستغنی از صفات یعنی خدا کو سراسر ہستی ماننے ہی کا نتیجہ ہے کہ اس کی ذات ہر حیثیت سے کامل ہو کیونکہ نقائص اور خرابیاں سب نیستی کے پہلو سے پیدا ہوتی ہیں اور خدا کی ذات میں نیستی کا گزر نہیں۔ تمام صفات ثبوتیہ و سلبیہ کا خلاصہ اتنا ہی ہے نہ یہ کہ اس میں علاوہ ذات کے کچھ صفتیں ہوں اور خدا ذات اور صفات کے مجموعہ کا نام ہو جس طرح عیسائی اسے ایک ہوتے ہوئے تین مانتے ہیں یہ تصور توحید خالق کے خلاف ہے اور تعلیم اہل بیتؑ کے لحاظ سے درست نہیں ہے۔

(۶) کمال ذات کے تقاضے جنہیں صفات ثبوتیہ کہا جاتا ہے۔

۱۔ قدیم یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ کوئی اس کی ذات سے جدا گانہ وصف نہیں ہے بلکہ اس کے سراسر ہستی ہونے ہی کا تقاضا ہے کہ وہ "واجب الوجود" ہو یعنی اس کی ذات کے لیے "نیستی" ممکن ہی نہ ہو اور جو واجب الوجود ہو وہ ضرور ہی "قدیم" کے لفظ سے یاد کیا جائے گا کیونکہ "حادث" تو وہ ہوتا ہے جو "نیستی" کے بعد "ہست" ہوا ہو اور یہ وہ ہو گا جس کی ذات "ہستی" سے الگ ہو مگر جہاں ہستی ذات سے جدا ہو ہی نہ، اس میں نیستی کا شائبہ کہاں ممکن ہے لہذا اسے یہی ماننا پڑے گا کہ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

۲۔ قادر یعنی ہر چیز پر قابو رکھتا ہے اور کسی امر میں بے بس نہیں کیونکہ عاجزی نقص ہے اور قدرت کمال اور یہ بات معلوم ہو چکی کہ اس کی

ذات کامل ہی کامل ہے ناقص نہیں ہے۔

بیشک محال یعنی غیر ممکن چیزوں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ ان سے خدا کی قدرت کا تعلق ہو لیکن اس سے خدا کی ذات میں کوئی نقص لازم نہیں آتا۔

۳. عالم یعنی وہ ہر شے کا جاننے والا ہے اس لیے کہ جہالت نقص ہے اور خدا کی ذات ہر نقص سے بری ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز اور چھوٹی سے چھوٹی بات ہر ایک خداوند عالم کے علم میں ہے۔ یہی مطلب ہے اس کا کہ وہ حاضر و ناظر ہے۔ اس کے علم میں کبھی تغیر نہیں ہوتا اور یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی امر کو پہلے نہ جانتا ہو پھر اس سے واقف ہو اور اس لیے اس کے افعال میں ندامت اور پشیمانی کا گزر نہیں ہے

۴۔ چونکہ قدرت اور علم کا مالک ہے اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وہ زندہ ہے۔

۵۔ اس کے صفات ثبوتیہ میں مدرک بھی ہے۔ اس کے معنی صحیح طور پر یہی ہیں کہ وہ تمام چیزوں کا جو احساس سے متعلق ہیں جاننے والا ہے جس طرح مسموعات یعنی آوازوں کے جاننے کی بنا پر سمیع اور مبصرات یعنی دیکھنے کی چیزوں کے جاننے سے بصیر ہے۔ یہ عالم ہونے کے مفہوم کے شعبے ہیں۔ الگ الگ صفتیں نہیں ہیں۔ نہ یہ سمجھنا صحیح ہے کہ خدا کے جسمانی طور پر آنکھ اور کان ہیں جن سے وہ دیکھتا اور سنتا ہے ایسا ہرگز نہیں ہے۔

۶۔ قدرت کو علم مصالح کے مطابق صرف کرنے کی بنا پر وہ مُرید ہے یعنی ارادہ کے ساتھ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور کام آپ چاہتی جو نہیں چاہتا نہیں کرتا۔

۲۔ اس کے متکلم ہونے کے یہ معنی نہیں کہ وہ زبان و دہن سے کلام کرتا ہو بلکہ اپنی قدرت سے اپنے علم کے مطابق جب چاہتا ہے اپنی طرف نسبت کے ساتھ کلام پیدا کرتا ہے۔

۳۔ نقائص سے ہمیشہ بری ہونا۔ اس کے تحت میں جو کچھ باتیں آئیں انھیں صفات سلبیہ سمجھنا چاہیے۔ ان میں چند باتیں جو خصوصیت کے ساتھ سمجھنے کی ہیں حسب ذیل ہیں :۔

۱۔ خدا کا کوئی شریک نہیں۔ یہ اصل توحید ہے۔ اس کا ثبوت اسی سے ظاہر ہے کہ خدا کامل وجود ہے۔ اگر اس کے ساتھ دوسرے کی شرکت ہو تو وہ کامل نہ رہے گا، ناقص ہو جائے گا۔

اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ دو کی طاقت کا مجموعہ ایک سے زیادہ نہیں ہے تو دوسرا بیکار محض ہے اور اگر زیادہ ہے تو ہر ایک ناقص اور محدود ہے اور خدائی کے قابل نہیں ہے۔

۲۔ خدا مرکب نہیں ہے یعنی اس کے اجزا نہیں بنائے جاسکتے کیونکہ اس صورت میں وہ ان اجزا کا محتاج ہوگا اور اجزا اس سے مقدم ہوں گے لہٰذا وہ سب کا پیدا کرنے والا نہیں قرار پا سکے گا۔

۳۔ خدا جسم نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر جسم کا مرکب ہونا ضروری ہے اور یہ معلوم ہو چکا کہ خدا مرکب نہیں ہے۔

۴۔ خدا کسی مکان اور سمت میں نہیں ہے کیونکہ اس صورت میں وہ محدود ہو جائیگا اور محتاج قرار پائے گا اور اسکی ذات پابندی و احتیاج سے بری ہے۔

۵۔ حلول و اتحاد نہیں ہو سکتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک چیز دوسرے میں ہو کر پائی جائے اس طرح کہ اسکی صفت بن جائے جیسے رنگ و بو پھول میں یا دو چیزیں اس طرح ایک ہو جائیں کہ ایک کی طرف اشارہ بعینہ دوسرے کی

طرف اشارہ فرمایا ہے۔ خدا کی ذات اس سے بالکل بری ہے کیونکہ اس صورت میں وہ محتاج اور محدود ہو جائیگا اور ناقص کے ساتھ یکساں بلکہ ایک ہو کر خود بھی ناقص ہو جائے گا۔

۶۔ وہ مرئی نہیں ہے یعنی آنکھوں سے دیکھنا اس کو غیر ممکن ہے کیونکہ آنکھوں سے وہی چیز دیکھی جاتی ہے جو سامنے ہو اور رنگ و شکل رکھنے والا جسم ہو۔ خدا نہ جسم ہے نہ رنگ و شکل رکھتا ہے نہ کسی خاص سمت میں محدود ہے۔ اس لیے اس کے دیدار کا اعتقاد صحیح نہیں ہے۔

۷۔ اس کی ذات میں تغیرات کا ہونا اور حالتوں میں تبدیلی پیدا ہونا ممکن نہیں ہے کیونکہ یہ پیدا ہونے والی حالت اگر کمال ہے تو اس کی ذات سے جدا نہیں ہے اس لیے ہمیشہ سے یہ کمال ثابت ہوگا اور اگر کمال نہیں ہے تو اس کی ذات سے اس کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ بیشک اس کے افعال دنیا میں مصالح کے مطابق مختلف صورتوں سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور مصلحتوں کی تبدیلی سے ان میں تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں اسی کو "بداء" کہا جاتا ہے لیکن ان تمام تبدیلیوں کا علم اسکو ہمیشہ سے ہوتا ہے اس لیے نہ وہ علم کے تغیر کا سبب ہیں اور نہ پشیمانی و ندامت کا نتیجہ

۸۔ خدا کی ذات سے علاوہ صفتیں نہیں ہیں اس لیے کہ اگر خدا کی صفتیں ذات کے علاوہ ہوں تو خود ذات کمال سے خالی ہوگی اور صفتوں کی محتاج ہوگی پھر اسکو ان صفتوں سے متصف ہونے کے لیے کسی دوسرے سبب کی ضرورت ہوگی تو خدا کی ہستی اپنے کمال میں غیر کی محتاج ہو جائیگی اور اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ غیر اس سے مقدم ہوگا۔ اس طرح توحید کا جو اصل اصول ہے قلع قمع ہو جائے گا۔

عدل:

خدا کے افعال سب حکمت اور مصلحت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ کوئی برا کام نہیں

کرنا اور کسی ضروری کام کو ترک کرتا ہے۔ اس میں حسب ذیل باتیں داخل ہیں:-

۱- دنیا کے تمام افعال بجائے خود یا اچھے ہیں یا برے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی بات کی اچھائی برائی ہماری عقل پورے طور پر سمجھ سکے لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ حقیقتاً بھی وہ اچھے یا برے نہیں ہیں۔ خدا جو کام کرتا ہے وہ اچھا ہی ہوتا ہے برا کام وہ کبھی نہیں کرتا۔ خدا ظلم اور ناانصافی سے بری ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ بندوں کو غیر ممکن باتوں کا حکم دے یا ایسے کام کرے جو بالکل فضول ہوں اور جن کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لیے کہ یہ تمام باتیں نقص ہیں اور خدا ہر نقص سے بری ہے۔

۲- خدا نے انسان کو اس کے افعال میں خود مختار بنایا ہے یعنی وہ جو کچھ کام کرتا ہے اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے۔ بیشک یہ قدرت خدا کی طرف سے عطا کی ہوئی ہے اور جب وہ چاہتا ہے تو اس قدرت کو سلب کر لیتا ہے لیکن جب وہ قدرت کو سلب کر لے تو انسان پر ذمہ داری باقی نہیں رہ سکتی یعنی اس صورت میں جو کچھ سرزد ہو اس پر کوئی سزا نہیں دی جا سکتی۔

خدا بندوں کو اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بری باتوں سے روکتا ہے۔ اچھے کاموں پر وہ انعام عطا کرتا ہے اور برے کاموں پر سزا دیتا ہے۔ اگر اس نے ہمیں مجبور پیدا کیا ہو یعنی وہ خود ان کے ہاتھوں سب کچھ کام کرتا ہو تو احکام نافذ کرنا اور جزا و سزا دینا بالکل غلط اور بے بنیاد ہوگا۔ خدا کی ذات ایسے غلط اور بے جا طرز عمل سے بری ہے۔

۳- خدا کو بندوں کے تمام افعال کا علم ہمیشہ سے ہے لیکن اس کا علم ان لوگوں کے افعال کا باعث نہیں ہوتا بلکہ چونکہ یہ لوگ ان افعال کو اپنے اختیار سے کرنے والے ہیں اس لیے خدا کو ان کا علم ہے۔

۴- خدا کے لیے عدالت کو ضروری قرار دینے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ ظلم یا فعل قبیح یا عبث پر قادر نہیں ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ خدا کی کامل ذات اور اس

کے علم و قدرت کے لیے یہ خیال نہیں ہے کہ وہ ظلم و فعل قبیح وغیرہ کا ارتکاب کرے۔ اس لیے ان افعال کا صادر ہونا اس سے بالکل غیر ممکن ہے۔

عقیدۂ توحید و عدل کا انسانی معاشرہ پر اثر:

توحید سے عالم انسانیت کو ایک مشترک نقطہ کی طرف توجہ پیدا ہوتی ہے جو سب کا مرکز قرار پائے۔ جغرافیائی حدود و نسل، وطن، قوم اور رنگ کے تفرقوں کے باوجود دنیا منسلک ہو جاتی ہے۔ ایک نظام میں اس ایک ہستی کے اقرار سے جو سب کا خالق اور معبود ہے۔

پھر یہ کہ اس سے انسان میں احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ مطلق العنان نہیں ہے اگر سب ذاتی خواہشوں کے غلام ہوتے تو ہر ایک کی طبیعت اور خواہش کے اختلاف سے مقصد اور عمل میں اختلاف پیدا ہو سکتا تھا مگر سب ایک مالک کے فرمانبردار ہیں اس لیے ان کا ہم آہنگ عمل اور مقصد ایک ہونا چاہیے۔ یہ حاکم کیسا ہے؟ حاضر و ناظر ہے ہر جگہ موجود ہے اور ہر بات کو جانتا ہے اس لیے انسان کو ہوشیار رہنا چاہیے کہ کوئی بات خلاف قانون ہو جانے یا کسی کام کو چوری چھپے کرتے ہوئے مطمئن نہ ہو کہ کسی نے نہیں دیکھا کیونکہ اسی نے دیکھا ہے جس کے ہاتھ میں جزا و سزا ہے۔

وہ یکتا ہے۔ کوئی اس کا مد مقابل نہیں۔ اس لیے بس اسی کی رضامندی کی فکر رہنا چاہیے اور اسی کی ناراضی سے اندیشہ کرنا چاہیے۔ اس کی طاقت ہر ایک سے غالب ہے اس لیے ناحق کسی طاقت سے مرعوب نہ ہو۔ وہ ہر بات پہ قادر ہے۔ اس لیے اپنی ناتوانی سے کبھی ناامید نہ ہو۔

اس عقیدہ سے ایسی انسانی برادری کی تشکیل ہوتی ہے جس میں ہر ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد و مساوات کا احساس رکھتا ہو اور سب ایک نصب العین پر گامزن ہوں سب اپنی خواہشوں کو مشترک مقصد اور عمل میں فنا کر دیں اور سب پختہ ارادہ

حاکم کی رضامندی کے خوف اور بھی ہر حالت میں طلبگار رہیں اور کسی وقت قانون کا احترام کو ہاتھ سے نہ دیں۔ اس جماعت کے افراد میں خودداری ہو کر وہ کسی ان طاقت کے سامنے سر نہ جھکائیں۔ بلند حوصلگی ہو کہ کسی دشوار مقصد کو ناممکن نہ سمجھیں اور اعتماد ہو جس سے کبھی اپنے دل میں یاس کا گزر نہ ہونے دیں۔ یہی وہ عناصر ترقی ہیں جو قدر مرتبہ اقوام کے شایان شان ہیں۔

عدل کے ماتحت یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ اس کا قانون جو اس کے تمام کاموں میں جاری ہے وہ عدالت ہے لہٰذا وہ بندوں سے بھی انصاف اور عدالت کا طالب ہے۔ اس نے ہمیں ایک امانت دی ہے جس کا نام "قوت اختیار" ہے۔ ہمیں اس اختیار کو حق اور عدالت کے مطابق صرف کرنا چاہیے۔

اس عقیدہ سے اس برادری میں جو انسانیت کے حدود میں قائم کی گئی ہے تبادلۂ حقوق اور انصاف و مساوات کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اس برادری کے افراد ایک دوسرے کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے کیونکہ یہ ظلم ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک کو دوسرے پر دولت و ثروت یا طاقت و اقتدار میں جو فوقیت نظر آتی ہے وہ بالکل وقتی ہے اور عارضی۔ خالق کی نگاہ میں ان سب کے لیے ایک قانون ہے کہ جس سے ان کی کامیابی وابستہ ہے۔ گناہ اگر غریب کرے تو سزا ملے گی۔ اور امیر کرے گا تو سزا پائے گا۔ وہاں اس کی دولت مندی کچھ کام نہ آسکے گی نہ وہ رشوت دے کر اپنے بچاؤ کا سامان نکال سکے گا۔ اسی طرح اچھا کام اگر امیر کرے گا تو جزا پائے گا اور غریب کرے گا تو جزا پائے گا۔ اس کی غربت اس کی کسمپرسی کا باعث نہ ہوگی۔ اسی طرح ہر شخص کو اپنے فرائض کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اپنے اعمال کی جانچ کی ضرورت پڑتی ہے۔ افراط اور تفریط، اسراف اور کنجوسی سب ظلم ہیں اور ہر چیز میں وسط کا نقطہ عدالت کا مرکز ہے۔ انسانی کمالات کی دنیا اسی اعتدال کے نقطہ پر مبنی ہے۔

خدا کو عادل سمجھنا اس اعتدال کی پابندی کا واحد محرک ہے اور اسی لیے جہاں

اعتدال پر قائم رہیں انھیں عادل کہا جاتا ہے اور سچے مسلمان وہی ہیں جو عدالت کی صفت سے ممتاز ہوں۔

نبوت :

اس کے تحت میں حسب ذیل باتیں ہیں :-

۱- انسانی جماعت کو ٹھیک راستے پر چلانے کے لیے خدا کی جانب سے رہنما اور مصلح مقرر ہوتے رہے ہیں جن کے ذریعے سے ان کو خداوندی احکام پہنچتے رہیں اور انتظام خلق درست ہو۔ ان مصلحین کو جو خدا کی طرف سے احکام پہنچانے کے لیے مقرر ہوتے ہیں نبیؐ اور رسولؐ کہتے ہیں اور انسانوں کی بہبودی کے لیے جو تعلیمات خدا کی طرف سے کسی معلم کے ذریعے سے آتے ہیں ان تعلیمات کے مجموعہ کو "شریعت" کہتے ہیں اور وہ رسول کے ذریعے سے دنیا کو پہنچتے ہیں۔

۲- انسانی آبادی کا کوئی خطہ اور کوئی طبقہ خدا کی جانب سے رہنمائی سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ممکن ہے کہ بعض اقوام اور بعض ممالک کے متعلق ہم کو صحیح علم نہ ہو کہ ان کی بھی رہنمائی خدا کی طرف سے کن اشخاص سے متعلق تھی لیکن یہ کلیہ بہرحال مسلّم ہے کہ ہر قوم کے لیے خدا کی طرف سے رہنما ضرور قرار دیا گیا ہے۔

۳- انبیاء یعنی خدا کی طرف سے مقرر شدہ مصلحین عملی حیثیت سے دنیا کے لیے نمونہ ہوتے ہیں اس لیے انھیں گنہگار نہیں ہونا چاہیے اور نہ غلطیوں میں مبتلا ہونا چاہیے نہ بھول چوک میں کسی کا مرتکب ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہوگا تو ان کے باعث خلق خدا کے گمراہ ہونے کا اندیشہ پیدا ہوگا۔ اور ایسے اشخاص کا جن سے یہ اندیشہ ہو خدا کی طرف سے مقرر کیا جانا درست نہیں ہے۔

۴- خدا کی طرف سے مقرر شدہ نبی کے پاس کوئی ایسی غیر معمولی مخصوص بات ہونا ضروری ہے جس کو وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کرے اور کوئی دوسرا شخص اس کے مقابلہ میں اس کی مثال پیش نہ کر سکے۔ ایسی غیر معمولی بات کو "معجزہ" کہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو سچے

اور جو سلسلے میں کوئی تمیز نہ ہو گی اور ہر شخص نبوت کا دعویٰ آسانی سے ساتھ کر سکے گا۔

۵- ہمارے رسول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ جو دنیا کے سامنے ہمیشہ کے لیے باقی ہے قرآن مجید ہے۔ جو اس زمانہ کے لوگوں کے لیے بھی معجزہ تھا اس لیے کہ اس کی فصاحت و بلاغت انسانی طاقت سے بالاتر تھی اور اب بھی معجزہ ہے اور ہمیشہ معجزہ رہے گا۔

۶- قرآن خدا کا کلام ہے یعنی وہ رسول کی ذہنی طاقت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے ان پر نازل کیا گیا ہے۔ وہ پورا رسول کے زمانہ ہی میں متفرق طور پر لکھ لیا گیا تھا۔ بعد وفات رسول وہ تمام ہو کر ان کتابی صورت میں جمع ہو گیا۔ نہ اس میں کوئی زیادتی ہوئی ہے اور نہ کمی اور نہ تبدیلی۔ ہاں اس کی ترتیب شانِ نزول کے مطابق نہیں ہے۔

۷- شریعتِ اسلام اپنی جامعیت کے لحاظ سے ہر زمانہ کے ضروریات کے لیے مکمل حیثیت رکھتی ہے اس لیے اس شریعت کے بعد کسی شریعت کے آنے کی ضرورت نہیں رہی اور نہ حضرت محمد مصطفےٰ ص کے بعد کسی نبی و رسول کے آنے کا محل رہا۔ قرآن مجید میں واضح طور پر اعلان کر دیا گیا ہے کہ یہ سب سے آخری رسول ہیں اور خود پیغمبر نے بھی بتایا کہ آپ کے بعد کوئی نبی و رسول آنے والا نہیں ہے۔

عقیدۂ رسالت کا عملی تقاضا:

رسول خدا کے حکم سے احکام کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کے احکام خدا کے احکام ہوتے ہیں لہٰذا کسی کو رسول کے مقابلے میں اپنے ذہنی، عقلی رائی اور طبع آزمائی کا حق نہیں ہے۔ نہ اس کے فیصلہ کے بعد کسی چون و چرا کا موقع۔ اس طرح رسول کے اقتدار کے تحت آپس کی انفرادی جاہلی غرور، عصبیتِ انانیت، جبروت اور نفسانیت سے پیدا شدہ ہر کشمکش کو جو جماعت کے افتراق کا باعث ہوتی ہے ختم ہو جانا چاہیے اور اسی میں جماعت کی تنظیم و ترتیب اور تمام افراد کی فرض شناسی کا راز مضمر ہے۔

امامت

چونکہ رسول کی زندگی دارِ دنیا میں محدود ہے اور وہ شریعت جس کی تبلیغ رسول کی زبانی ہوئی ہے اس کی حفاظت اور نیز افرادِ ملت کی عملی تربیت اور ان کو احکامِ شریعت کی صحیح تعلیم دینے کی ضرورت ہے اس لیے رسول کے بعد ایک ایک جانشین ہونا ضروری ہے جو تمام افرادِ امت میں پورے طور پر اس رسول کی شریعت اور تعلیم کی حفاظت کرنے کے قابل ہو۔ یہ جانشین امام ہوتا ہے۔ اور یہی رسول کا واقعی خلیفہ ہوتا ہے۔ اس جانشین کا انتخاب خدا کی جانب سے پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اگر رسول کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد عام افراد کو ان کی رائے، خواہش اور مرضی پر چھوڑ دیا جائے تو مطلق العنانی اور خود غرضی برسرِ کار آ جائے گی جس کا نتیجہ افتراق و تشتت و ابتری کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور اس طرح جو شیرازہ پیغمبرِ خدا کی اطاعتِ مطلقہ کی بنا پر جمع ہوا تھا وہ بکھر جائے گا۔

امامت منصوصہ کا عقیدہ اس اجتماعی انتشار کا سدِّباب ہے۔ اس کے تحت میں حسبِ ذیل امور ہیں:-

۱- رسول کے بعد بھی خدائی قانون پر دنیا کو چلانے کے لیے مرکز موجود رہتا ہے۔

۲- یہ مرکز ایسا ہوگا جو خود قانون پر عمل کا بہترین نمونہ ہو۔ اس لیے اسے بھی گناہ کل اور خطاؤں سے بری ہونا ضروری ہے ورنہ پھر اس کے ہاتھوں خلقِ خدا کی گمراہی کا امکان ہوگا اور مقصدِ امامت ختم ہو جائے گا۔

۳- اسلام کسی شہنشاہیت کی بنیاد قائم نہیں کرتا بلکہ انسانیت کا نظام بناتا ہے اور ایک قوم کی تشکیل کرتا ہے جو انسانیت کا صحیح نمونہ ہو اور اس نظامِ انسانیت کے لیے ایک محافظ قرار دیتا ہے جو تمام انسانوں کا واحد مرکز ہو۔ یہ اپنے زمانہ میں رسول ہیں اور رسول کے بعد ان کے نامزد کردہ جانشین یعنی امام اور اگر امام اور امامت رہنمائی کے لیے سامنے نہ ہوں تو ایسے افراد جو ان کی تعلیمات پر زیادہ سے زیادہ مطلع اور عامل ہوں۔

۴۔ امام کے مقابلے میں کسی کو حکومت کا حق نہیں ہے اور جو حکومت اس طرح کی قائم ہو وہ حکومت غیر شرعی ہوگی۔

۵۔ نظریۂ امامت میں صرف قرابت یعنی رسولؐ سے رشتہ داری کا کوئی دخل نہیں ہے بلکہ اصل معیار صفات کی بلندی اور اس کے لحاظ سے خالق کی جانب سے بحیثیت جانشین رسولؐ نامزد ہونا ہے اور اسی لیے محبت اہل بیت رسولؐ جو نجات آخرت کے لیے ضروری ہے اور بغیر اس کے انسان با ایمان نہیں سمجھا جا سکتا یہ انھی ہستیوں کی محبت ہے جو اپنے کردار کے لحاظ سے "معصوم" ہیں اور جنھیں خالق کی طرف سے ہدایت خلق اور نیابت رسولؐ کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

۶۔ چونکہ ہدایت خلق اور حفاظت شریعت کا کام مستقل طور پر قائم ہے اس لیے اس سلسلے کی کسی فرد کا آخر عمر زمانہ تک موجود رہنا ضروری ہے اور جب کہ وہ آنکھوں کے سامنے نہ ہو تو اسے پردۂ غیبت میں باقی و برقرار اور اپنے طور پر برسرکار رہنا ضروری ہے۔

معاد: اس کے تحت میں حسب ذیل امور ہیں:۔

۱۔ خدا کی طرف سے بندوں کو ان کے اچھے اور برے افعال کا بدلا ملنا ضروری ہے جو اچھے کام کریں انھیں جزا اور جو برے کام کریں انھیں سزا ملے گی۔ اس لیے کہ خدا عادل ہے اور عدالت کا تقاضا یہی ہے۔

۲۔ جزا و سزا کے لیے ایک دن مقرر ہے جسے "قیامت" کہتے ہیں۔ اس دن سب مرنے والے دوبارہ زندہ ہوں گے تاکہ انھیں جزا اور سزا عطا کی جائے۔

۳۔ جزا یعنی اچھے کاموں پر جو انعام کا اعلان ہے۔ وہ کبھی ٹل نہیں سکتا لیکن گناہوں پر سزا کا جو اعلان ہے وہ صرف استحقاق کا پتہ دیتا ہے یعنی یہ شخص سزا کے قابل ہے لیکن عفو و کرم کے ماتحت ہو سکتا ہے کہ خدا اس سے درگزر کر دے

اس کا نام "مغفرتِ ذنوب" یعنی گناہوں کی بخشش ہے۔

۴۔ ان گناہوں کی بخشش کبھی رسول یا ائمہ دینؑ کی بارگاہِ الٰہی میں درخواست سے ہوتی ہے اس کو "شفاعت" کہتے ہیں۔

اصولِ دین کا خلاصہ یا اصل جوہر:

مذکورہ بالا اصول کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کو مان کر ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوتی ہے جو خدا کی بادشاہت کو تسلیم کرے اور اس کے ماتحت اس کے مقرر کردہ حاکم (رسول) اور اس کے تابعین (اولوالامر یعنی ائمہ معصومینؑ) کے احکام پر وفاداری کے ساتھ عمل کرے۔ خالق کی عظمت کے مقابلہ میں کسی دنیوی طاقت سے مرعوب نہ ہو اور اس طرح کسی باطل اقتدار کی بیعت کے لیے تیار نہ ہو اور اقتدارِ الٰہی کے مقابلہ میں خود اپنے ذاتی اختیار اور خود رائی سے کبھی کام نہ لے اور اس کے مقرر کردہ مرکز سے منحرف نہ ہو۔ اسی کا نام ہے "شیعیت" اور یہی ہے "حقیقتِ اسلام"

اصولِ دین کے نمایاں پہلو یہ ہیں:-

۱۔ خالق کی ذات کو اسکے شایانِ شان کمال کے ساتھ ماننا۔ اسکا نام توحید ہے۔

۲۔ خالق کے افعال کو اس کی شایانِ شان حکیمانہ صفت کے ساتھ ماننا۔ یہ عدل ہے۔

۳۔ رہنمایانِ دین کو جو اللہ کے مقرر کردہ ہیں کامل طور پر کردار کی ہر پستی سے بلند ماننا جس کا نام ہے "عصمت" یہ نبوت کا لازمی جزو ہے۔

۴۔ خالق کی طرف کے رہنمائی کے نظام کو تا قیامت باقی ماننا اور "حکومتِ الٰہیہ" کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ قبول کرنا۔ اس کا نام امامت ہے۔

۵۔ جزا و سزا کے لیے اس دورِ زندگی کے اختتام کے بعد ایک دوسرے دورِ حیات کو تسلیم کرنا۔ اسے معاد کہتے ہیں۔

خصوصیات مذہب شیعہ

(عقائد کے لحاظ سے)

۱۔ تنزیہِ خالق: یعنی خالقِ عالم کے کمالِ ذات کے خلاف کسی طرح کے بھی نقص کی یہاں کی جسمانیت کسی طرح کی بھی شباہت کو غیر کے ساتھ گوارا نہ کرنا۔

اس بنا پر دنیا یا آخرت کسی عالم میں بھی وہ جسمانی آنکھ سے خالق کے دیدار کو ممکن نہیں سمجھتے۔ اس لیے وہ ذات کے علاوہ صفات نہیں سمجھتے کیونکہ اس طرح ذات اپنے کمال میں صفات کی محتاج قرار پاتی ہے۔

ذاتِ خالق کے سوا کسی قدیم کا تصور نہیں کرتے مثلاً اگر ذات کے علاوہ اس کے علم کو بھی قدیم کہا جائے بلکہ یہاں تک کہ صفتوں کو قدیم کہا جائے تو صفتِ قدم میں خالق کے شریک دوسرے معلوم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے جس طرح تمام ادیانِ عالم میں دینِ اسلام میں توحید سب سے زیادہ مکمل ہے اسی طرح تمام فرقِ اسلامیہ میں شیعی مذہب کی توحید سب سے زیادہ خالص ہے۔

۲۔ عدلِ الٰہی کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ تسلیم کرنا جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خالق کے افعال میں کوئی ظلم کا کام، کوئی عبث کام اور کوئی برا کام نہیں ہو سکتا۔

۳۔ شیعہ حق کو طاقت مانتے ہیں۔ اتنی ہمہ گیری کے ساتھ کہ خالق کے افعال میں بھی سوا حقانیت اور انصاف کے کسی دوسرے تصور کے لیے تیار نہیں ہیں۔

یہ خیال کہ وہ قادرِ مطلق ہے لہٰذا اس پر کوئی پابندی نہیں، نتیجہ ہے طاقت کو حق سمجھنے کا جو شہنشاہانِ خود مختار کی مطلق العنانی کا سنگِ بنیاد ہے۔ شیعہ اس تصور کے شروع سے آخر تک مخالف ہیں۔

۴۔ شیعہ تقدیر یا "مشیتِ الٰہی" کے کسی ایسے تصور کو درست نہیں جانتے جو ظالموں اور بدکاروں سے ان کے افعال کی ذمہ داری کو سلب کر دے۔ اس طرح نہ خالق کے افعال میں شر کا تصور رکھتے ہیں اور نہ دنیا میں کسی شر کے وقوع میں اس کے ارادہ و عمل کی کارفرمائی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی سے ظلم اور ظالموں سے نفرت کی بنیاد مضبوط

ہوتی ہے اور یہی صحیح معنی میں اصول تبرا کا سنگ بنیاد ہے۔

۵۔ شیعہ حسن و قبح کو عقلی جانتے ہیں یعنی شریعت کے احکام سے قطع نظر کرتے ہوئے بجائے خود بھی افعال میں اچھائی اور برائی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض چیزوں کی اچھائی اور برائی کے پہلوؤں تک ہمارا ذہن نہ پہنچ سکے مگر فی نفسہ ان میں اچھائی یا برائی ہے ضرور اور اسی اچھائی یا برائی کی بنا پر شریعت میں حلال اور حرام کے احکام نافذ ہوتے ہیں۔ نہ یہ کہ اندھا دھند جس چیز کو خالق نے چاہا حلال کر دیا اور جسے چاہا حرام کر دیا۔

شیعی مذہب کے اس اصول کی بنا پر عقل انسانی کے لیے شرعی احکام کے فلسفۂ تشریع پر غور و خوض کی راہیں کھلتی ہیں اور انسانی بصیرت کو جلا ہوتی ہے۔

۶۔ شیعہ حکومت الٰہیہ کو اس کے پورے تقاضوں کے ساتھ تسلیم کرتے ہیں۔ اسلام کے معنی ایک "سر نہادن بطاعت" کے ہیں اور دوسرے نمبر پر ان کے۔ دونوں کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ اللہ کی مرضی کے مقابلہ میں انسان کا حق خود مختاری خواہ شخصی ہو یا جمہوری کوئی چیز نہیں ہے۔ حاکم مطلق صرف اللہ ہے اور جسے وہ اپنا نائب بنائے صرف اسی کی اطاعت انسان پر فرض ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا حق حکومت نہیں رکھتا جو حکومت اس کے مقابلہ پر قائم ہو وہ ناجائز ہے۔

۷۔ شیعہ تعلیمات اسلامی اور کتاب و سنت کے علم کے لیے اس مرکز سے وابستہ ہیں جو خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا بتایا ہوا تھا۔ یعنی اس طرح کہ انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اھل بیتی ما ان تمسکتم بھما لن تضلوا بعدی

"میں تم میں دو گرانقدر چیزیں چھوڑتا ہوں۔ اللہ کی کتاب اور میری عترت جو میرے اہلبیت ہیں۔ جب تک تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے کبھی گمراہ نہ ہو گے۔"

کبھی فرمایا۔ مثل اھل بیتی کمثل سفینۃ نوح من رکبھا نجا و من تخلف عنھا غرق و ھوی۔ "میرے اہل بیتؑ کی مثال کشتی نوحؑ کی سی ہے جو اس پر سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جو اس سے الگ رہا وہ غرق ہوا۔"

بھی فرمایا۔ انا مدینۃ العلم و علی بابھا فمن اراد العلم فلیات الباب "میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے تو جو علم کا طلبگار ہو اسے دروازہ پر آنا چاہیے"

فرقہ شیعہ نے رسول اللہؐ کے بعد جس طرح حکومت کا اقتدار صرف انہی کو سمجھا، جن کے لیے خدا اور رسولؐ کا اعلان ہو چکا تھا، اسی طرح دینی تعلیمات کے باب میں بھی صرف انہی کی رہنمائی قبول کی اور وہ انہی ارشادات کو اپنی تعلیم کا سرچشمہ مانتے ہیں جو قرآن، حدیث رسولؐ اور ان اہل بیت معصومینؑ سے پہنچے ہوں جنھیں پیغمبرؐ نے اپنے علوم کا وارث بنایا اور بتایا تھا۔

اسلام کے عملی ارکان اور احکام شرعی

قانون الٰہی کے تحت میں کچھ فرائض مقرر ہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کی درستی کے لیے ضروری ہیں یا عملی ہیں سے جو بہت اہم حیثیت رکھتے ہیں وہ ارکان اسلامؑ کہے جاتے ہیں جنھیں عام طور پر "فروع دین" کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اصول عقائد کے ساتھ وہی تعلق رکھتے ہیں جو شاخوں کو درخت کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان پر عمل کرنا ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔ بغیر ان پر عمل کے اسلام کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

قانون الٰہی کو مذہب کی زبان میں "شریعت" کہتے ہیں اور جو اس قانون کے تقاضے ہوں انھیں احکام شرعی کہا جاتا ہے۔

ضروریات دین وہ شرعی احکام جو تمام مسلمانوں میں اس طرح تسلیم شدہ ہیں کہ بچہ بچہ انھیں جانتا ہے۔ انھیں "ضروریات دین" کہا جاتا ہے جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کا واجب ہونا، شراب، زنا اور سود خواری کا حرام ہونا بلکہ نماز کے کچھ شرائط اور کچھ کیفیات، مثلاً نماز کے لیے طہارت کا ضروری ہونا، قبلہ رخ ہونا، واجب نمازوں کی تعداد، ان کی رکعتیں اور قیام و قعود اور رکوع و سجود کا جزو نماز ہونا وغیرہ یہ بھی ضروریات دین میں داخل ہیں جن کا منکر کافر ہے۔ اسی طرح اگر فہرست نویسی

دین کی مرتب کی جائے تو وہ کافی بسیط ہو گی۔

احکامِ شرع کے ماخذ

احکامِ شرع حاصل کرنے کے چار ذریعے ہیں:-

۱۔ قرآن: اس میں جن آیات کے معنی ظاہر ہیں انہیں خود سمجھ کر عمل کرنا فرض ہے اور جن کے معنی مجمل یا مبہم ہیں ان کی شرح کو احادیث معصومینؑ سے معلوم کرنا چاہیے۔ [illegible] ان آیتوں میں رائے زنی کرنا درست نہیں ہے۔

۲۔ حدیث: یعنی رسول اللہؐ اور آپ کے جانشین بارہ اماموںؑ کے اقوال و افعال۔

۳۔ اجماع: اس میں عام اشخاص کا کسی بات پر متفق ہونا کوئی چیز نہیں جب تک کسی ذریعے سے یہ یقین نہ ہو جائے کہ امام بھی ان سے متفق ہیں۔ اس کا موجودہ زمانے میں حاصل ہونا غیر ممکن ہے۔

۴۔ عقل: یقینی طور پر جو عقل کے فیصلے ہوں جیسے امانتداری کا مستحسن ہونا خیانت کا فعل قبیح ہونا۔ یہ فیصلے عقل کے بھی مستند ہیں مگر قیاس یعنی ایک چیز کے شرعی حکم سے دوسری چیز کے شرعی حکم کا صرف گمان کی بنا پر اپنے دل سے نکالنا۔ یہ ہمارے نزدیک بے اصل ہے اور اس پر عمل کرنا جائز نہیں ہے۔

اصولِ عملیہ

جس چیز کے بارے میں مذکورہ ماخذوں سے کوئی علم حاصل نہ ہو سکے اور اس میں شک ہو اسے کیا سمجھا جائے اور عملاً کیا کیا جائے؟ اس کے لئے چند ضوابط ہوتے ہیں جو کہ انہی ماخذوں سے حاصل ہوئے ہیں "اصولِ عملیہ" کہلاتے ہیں۔ یہ چار ہیں۔

۱۔ استصحاب: یعنی جو بات پہلے ہو اسے باقی سمجھا جائے جب تک کہ اس میں تبدیلی کے وقوع کا علم نہ ہو۔

۲۔ برائت: یعنی جس شے کے متعلق شریعت کی جانب سے فعل یا ترک کی پابندی ثابت نہ ہو اسے جائز سمجھنا چاہیے۔

۳۔ احتیاط: یعنی جب شرع کی جانب سے وجوب یا حرمت کی پابندی معلوم ہو تا ثابت ہو مگر پتہ نہ ہو کہ کیا واجب ہے یا کیا حرام ہے یا اس پابندی کے ادا کرنے کے طریقہ میں شک ہو تو ایسا طریقہ اختیار کرنا کہ یقینی طور پر انسان بری الذمہ ہو جائے اور حکم مولا کی تعمیل یقینی طور پر ہو جائے۔

۴۔ تخییر: جبکہ فعل یا ترک کی پابندی عائد ہونے کا یقین ہو مگر تعیین کے ساتھ معلوم نہ ہو اور احتیاط کی کوئی صورت ہو ہی نہ تو کسی بھی ایک پہلو پر عمل کرنے کا اختیار ہو گا۔

یہ تمام قاعدے جیسے کہ کہا گیا جمع زاد یا خود ساختہ نہیں ہیں بلکہ انہی شرعی کے ماخذوں سے ثابت ہیں لہذا ان پر عمل درحقیقت انہی شرعی دلائل پر عمل ہے کوئی الگ چیز نہیں۔

اجتہاد و تقلید:

مذکورہ بالا ماخذوں اور ان سے متعلق اصولی قواعد سے احکام شرعیہ کو سمجھنے کی کوشش کا نام اجتہاد ہے نہ کہ دل سے احکام تراشنے کا۔ اور جو لوگ اس طرح احکام کو خود سمجھ سکیں وہ مجتہد کہلاتے ہیں اور جو اتنی قابلیت نہیں رکھتے کہ وہ خود اس طرح احکام کو سمجھ سکیں تو ان کے لیے صحیح طریقہ احکام شرعیہ پر عمل کرنے کا یہی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اپنے بھروسے کے مجتہد کی طرف رجوع کریں اور اس سے مسائل کو دریافت کر کے ان پر عمل کریں۔ اسی کا نام تقلید ہے۔

وہ کوئی پیری مریدی کی طرح کی چیز نہیں ہے اس میں نہ مجتہد سے بیعت کرنا ہوتی ہے اور نہ کسی رسم کے ادا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ مجتہد کو اطلاع تک دینے کی ضرورت نہیں ہے کہ میں آپ کا مقلد ہوتا ہوں۔

وہ بس اپنی خوشنودی خدا احکام الٰہی پر عمل کرنے کا ایک عملی ذریعہ ہے اور کچھ سوا کچھ نہیں۔

نماز اور اس کے لیے ضروری چیز طہارت

کل ارکان میں سب سے اہم نماز ہے اور نماز کے لیے طہارت ضروری ہے۔

نجاسات: طہارت کے لیے سب سے پہلے ضرورت نجاستوں سے علیحدہ رہنے کی ہے جیسے

پیشاب، پاخانہ، خون وغیرہ ـــ حالانکہ ان میں سے اکثر چیزیں صحت و زندگی کی طبی حیثیت سے بھی امراض کا سبب ہیں لیکن اس نجاست میں اصل وجہ احکامِ شریعت پر ہے۔ اس حکمِ شرعی کا باعث یقینی حفظِ صحت بھی ہو سکتی ہے۔ اور بسا اوقات دوسری مصلحتیں بھی ہو سکتی ہیں جیسے نفرت پیدا کرنا یا ایسے لوگوں کے میل جول سے روکنا جن سے انسان کے لیے دینی حیثیت سے خطرہ ہے۔

بے شک ان تمام چیزوں سے علیحدہ رہنے میں صفائی بھی ہے مگر اصل مقصد صرف صفائی نہیں ہے۔ چنانچہ ان نجاسات میں علاوہ ان گندہ چیزوں کے جیسے پیشاب پاخانہ وغیرہ ایک نشہ دار سیال چیز یعنی شراب وغیرہ بھی ہے۔ اس کی نجاست جتا کر اس کی حرمت کی طاقت پہنچانے کے لیے ہے تاکہ انسان اس سے متنفر ہو کر رغبت نہ کرے۔ فعل حرام کی وجہ سے جنابت میں مبتلا ہونے والے کا پسینہ بھی نجس قرار دیا گیا جس سے اس فعل شنیع کی برائی کا ذہن نشین کرنا مقصود ہے اور اسی طرح غیر مسلمین کی نجاست کا حکم بھی فقہ جعفری کے مخصوصات میں سے ہے۔ یہ حفاظت گمراہی سے ذہن کو دور رکھنے کا ایک قوی ذریعہ ہے جس کی پابندی تعلیمات اہل بیتؑ کے رو سے قطعی طور پر ضروری ہے۔

مطہرات

جب کوئی شے مذکورہ بالا نجاستوں سے نجس ہو جائے تو اس کے پاک کرنے کے لیے سب سے اہم چیز پانی ہے۔ یہ عارضی نجاست رکھنے والی ہر شے کا مطہر ہے

دوسرے زمین۔ اس کے ذریعہ سے جوتوں کے تلے، ننگے پیر چلنے والوں کے پیروں کے تلوے، گاڑیوں کے پہیے وغیرہ غرض ہر چیز جو عموماً زمین پر چلتی ہے اس نجاست سے جو اسی نقل و حرکت میں نجس مقامات پر چلنے سے پیدا ہو پھر اسی نقل و حرکت کے ذیل میں خود بخود پاک ہوتی رہتی ہے۔

تیسرے آفتاب۔ اس کے ذریعہ سے غیر منقول چیزیں جیسے دیوار، دروازہ، درخت اور میوہ جو درخت پر ہو وہ اگر بحالت تری نجس ہوں تو دھوپ سے خشک ہو کر پاک ہو جائیں گی۔ ـــ یہ مطہرات وہ ہیں جن سے عارضی نجاستیں متعلق ہیں باقی وہ اصلی نجاست ہے جیسے پاخانہ، خون، کتا، سور، اور کافر وغیرہ جن کی اگر نوعیت بالکل بدل جائے

اس طرح کہ اصلی شے باقی ہی نہ رہے جیسے جل کر راکھ ہو جائے یا کتا نمک کی کان میں گر کر نمک ہو جائے تو اب جو شے وجود میں آئی ہے وہ پاک سمجھی جائے گی اسی طرح کافر اگر مسلمان ہو جائے تو اب نجاست کفر اس کی ختم ہو گئی اور وہ مسلمان ہو کر طاہر ہو گیا۔

وہ سیال چیز جو بغیر کسی قید و اضافت کے پانی نہیں کہی جا سکتی - آب مضاف کہلاتی ہے اس سے کوئی شے پاک نہیں ہو سکتی اور وہ ذرا سی بھی نجاست کے پڑ جانے سے فوراً نجس ہو جائے گا چاہے کتنا ہی زیادہ ہو لیکن آب مطلق یعنی جو حقیقی معنی میں پانی ہو اس کی کئی قسمیں ہیں ۱- ایک آب جاری یعنی جس کا کوئی خزانہ ہے جس سے اس کا اتصال ہے خواہ قدرتی ہو جیسے دریا چشمہ اور کنواں وغیرہ یا بنایا ہوا ہو جیسے نل کا پانی جو بڑی بڑی ٹنکیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ پانی جب تک برس رہا ہے وہ بھی اسی حکم میں ہے یہ قسم پانی کی نجاست کے اتصال سے اس وقت تک نجس نہیں ہوتی جب تک نجاست سے بو، رنگ، یا مزہ اس کا بدل نہ جائے اور اگر تبدیلی ہو جائے تو وہ اس وقت تک نجس رہے گا جب تک وہ تبدیلی باقی ہے اور جب وہ تبدیلی ختم ہو جائے تو وہ پانی خود بخود پاک ہو جائیگا۔

دوسرے آب کثیر یعنی ٹھہرا ہوا پانی جو کُر بھر ہو یا اس سے زیادہ - اسکا حکم یہ ہے کہ نجس تو اس وقت تک نہیں ہوگا جب تک کہ نجاست سے رنگ، بو، یا مزہ نہ بدلے لیکن اگر یہ تبدیلی ہو جائے تو پھر وہ خود سے پاک نہیں ہوگا بلکہ زوال تغیر کے علاوہ ایک کُر پانی اس میں ڈالنے کی ضرورت ہوگی۔

تیسرے آب قلیل یعنی کُر سے کم پانی - یہ ایک قطرہ نجاست سے بھی نجس ہو جائے گا اور پاک اسی صورت سے ہو سکے گا کہ ایک کُر پانی سے اس کا اتصال ہو۔

نماز میں جسم کا نجاست سے پاک ہونا لازم ہے اور لباس کا بھی سوا ایسے چھوٹے لباس کے جیسے ازار بند وغیرہ جس سے مرد کے جتنا ستر نماز میں ضروری ہے وہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ سجدہ گاہ یعنی پیشانی کے رکھنے کی جگہ کا طاہر ہونا لازم ہے۔

طہارت شرعیہ یعنی رفع حدث :

حدث ایک قسم کی اندرونی نجاست کا نام ہے اس کے لیے سابقہ نجاستوں سے پاک ہونے کے علاوہ غسل یا وضو کی ضرورت ہوتی ہے جس حدث کے دور کرنے کے لیے غسل کی ضرورت ہو اسے حدث اکبر کہتے ہیں اور جس کے دور کرنے کے لیے وضو لازم ہوتا ہو اسے حدث اصغر کہتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے غسل یا وضو ممکن نہ ہو تو دونوں صورتوں میں تیمم لازم ہوتا ہے۔

چونکہ عام حالات میں زیادہ تر نماز وضو سے ہوتی ہے لہذا پہلے اسی کو بیان کیا جاتا ہے۔

وضو اگر پیشاب پاخانہ وغیرہ ہوا ہو یا سو چکا ہو اور ایسا کوئی امر درپیش نہ ہو جس سے غسل واجب ہوتا ہے تو اب نماز کا وقت آنے پر وضو واجب ہوگا۔

وضو کی ترکیب قرآن مجید میں موجود ہے :-

اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق وامسحوا برؤسکم وارجلکم الی الکعبین "جب نماز کے لیے کھڑے ہونے لگو تو اپنے چہروں اور کہنیوں تک کے ہاتھوں کو دھوؤ اور مسح کرو اپنے سروں کا اور پیروں کا ٹخنوں تک"۔ اس میں صاف پیروں کا ذکر سر کے بعد مسح کے تحت میں ہوا ہے اس سے پیروں کا مسح کیا جانا ہی ثابت ہوتا ہے جس پر فرقہ شیعہ کا عمل ہے۔

غسل غسل جو واجب ہیں وہ کچھ مرد و عورت میں مشترک ہیں اور کچھ عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ جو مشترک ہیں وہ جنابت، غسل اموات اور غسل مس میت ہیں اور جو عورتوں سے خاص ہیں وہ حیض، استحاضہ اور نفاس ہیں۔

ترکیب غسل کی سب میں ایک ہے کہ اگر حوض، نہر یا تالاب وغیرہ موجود ہو تو غسل ارتماسی ہوسکتا ہے کہ نیت کے ساتھ ایک دم غوطہ لگائے جس میں ترتیب نہیں ہے۔ اور دوسری طرح کہ نیت کے ساتھ پہلے سر و گردن دھوئے۔ پھر داہنا حصہ جسم کا، پھر بایاں حصہ۔ جو اعضا درمیانی ہیں یا دونوں طرف ایک ہیں جیسے ناف وغیرہ انہیں دونوں طرف کے دھونے میں شامل کرے۔

ان میں سے ایک یعنی غسل مس میت کا وجوب فقہ جعفری سے مخصوص ہے یعنی جب مردہ کا جسم روح نکلنے کے بعد جسم سرد ہو جائے اور ابھی غسل میت نہ ہوا ہو تو جو شخص اس دوران میں جسم کو چھوئے اس پر غسل واجب ہوگا۔ اسے فقہ اہل سنت میں واجب نہیں قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ احادیث میں وہاں بھی اس کا ذکر ہے۔

نماز کے دیگر شرائط

ستر عورتین: یہ شرط مرد اور عورت سب کے لیے ہے اس کے علاوہ سوا چہرے اور دونوں ہاتھوں اور دونوں پیروں کے باقی تمام جسم کا چھپانا بھی لازم ہے۔ مرد کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ لباس خالص ریشم کا نہ ہو نیز سونے کی کوئی چیز بطور زینت پہننا ناجائز ہے۔ عورت کے لیے یہ دونوں پابندیاں نہیں ہیں۔ بیشک ایک یہ پابندی سب کے لیے ہے کہ غیر ماکول اللحم کا کوئی جزو لباس سے متصل نہ ہو اور لباس غصبی نہ ہو۔

قبلہ یعنی کعبہ کی سمت رخ ہونا۔ یہ نماز (یومیہ) میں بالاتفاق واجب و لازم ہے اور اس میں فرق اسلامیہ کے درمیان کوئی اختلاف بھی نہیں ہے۔

نماز واجب کے اقسام

نماز کی اصل شریعت میں جو قسمیں واجب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

نماز پنجگانہ جو ہر شب و روز میں ہے اور ہفتہ کی ایک نماز جمعہ اور سال کی ایک عید الفطر اور عید الاضحی (بقر عید) کی نمازیں اور خاص حالات سے متعلق نماز آیات جو چاند گرہن سورج گرہن اور زلزلہ وغیرہ میں ہوتی ہے۔

نماز جمعہ کا وجوب یعنی اور اسی طرح نماز عیدین کا وجوب فقہ جعفری کی رو سے مشروط ہے اس امر کے ساتھ کہ امام معصومؑ کی قیادت میں وہ ادا ہو۔

اگر امام معصوم کی قیادت میں نہیں ہے تو پھر نماز جمعہ کو ہمارے اکثر علماء واجب تخییری سمجھتے ہیں یعنی جمعہ کے دن اختیار ہے کہ ظہر ادا کرے یا جمعہ ادا کرے بشرطیکہ جماعت کے

ساتھ ہو سکے ورنہ ظہر پڑھنا لازم ہے کیونکہ جمعہ فرادیٰ طور پر نہیں ہو سکتا۔

عیدین امام معصومؑ کی قیادت نہ ہونے کی صورت میں مستحب ہے۔ واجب نہیں ہے اور اسے فرادیٰ اور بجماعت دونوں طرح پڑھا جا سکتا ہے۔

ترکیب نماز

نماز کی ترکیب قرآن مجید میں تو ہے نہیں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عمل سے ثابت ہوئی ہے یعنی آپ نے نماز پڑھ کر دکھائی کہ اس طرح نماز پڑھا کرو اور اس رسولؐ کے عمل کو صحیح طور پر ان کے اہل بیت طاہرین علیہم السلام جیسا بتا سکتے ہیں دوسرے اجنبی افراد نہیں بتا سکتے چنانچہ شیعہ نماز کے اسی طریقہ پر قائم ہیں جو اہل بیت طاہرینؑ سے ثابت ہے جس کے نمایاں خصوصیات میں یہ ہے کہ نماز کے قیام میں ہاتھ کھلے رہیں۔ امام مالک جو مدینہ منورہ یعنی دارِ رسولؐ کے باشندہ ہونے کی وجہ سے سیرتِ رسولؐ سے بہ نسبت بیرونی علماء کے زیادہ واقف ہو سکتے ہیں وہ بھی اسی کے قائل تھے چنانچہ اہل سنت میں سے بھی مالکی حضرات عموماً ہاتھ کھول کر نماز پڑھتے ہیں۔ اس کے علاوہ سورۂ حمد اور دوسرے سوروں کے ساتھ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لازمی جزو ہے جسے باآواز بلند کہنا بہتر ہے۔ اس میں امام شافعی اور ان کے تابعین شیعوں سے متفق ہیں۔ اس کے علاوہ سجدہ میں یہ پابندی ہے کہ زمین یا نباتاتِ زمین ہی پر سجدہ کیا جا سکتا ہے بشرطیکہ وہ کھانے اور پہننے کی چیز نہ ہو۔ آسانی کے لیے سجدہ گاہ رکھی جاتی ہے تاکہ کسی وقت دقت نہ ہو۔ احادیث اہل سنت سے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سجدہ کی جو کیفیت ثابت ہوتی ہے وہ اسی کے مطابق ہے۔

حالت سفر میں ہر چہار رکعت والی نماز دو رکعت ہو جائے گی اسے قصر کہتے ہیں۔ قصر کا حکم قرآن مجید اور احادیث سے ثابت ہے۔ نیز حالت سفر میں روزہ کو ترک کر کے کسی اور زمانہ میں اس کی قضا کا حکم بھی قرآن سے ثابت ہے جس پر فرقۂ شیعہ کا عمل ہے۔

نماز جماعت نماز کا بجماعت ہونا افضل ہے اور اس کا ثواب عظیم ہے مگر شیعہ ہر شخص کی اقتداء میں نماز درست نہیں سمجھتے بلکہ جماعت کے لیے یہ ضروری ہے

کہ کسی شخص کے پیچھے نماز پڑھے وہ عادل ہو۔

"عادل کے معنی یہ ہیں کہ گناہ کبیرہ سے پرہیز کرتا ہو اور صغیرہ گناہ پر بھی اصرار نہ ہو یعنی اگر رہتا ہو اور اتفاق سے عمل میں آئے تو اس کا خوگر نہ ہو۔ اس کے علاوہ ایسی باتوں سے پرہیز کرے جو عام طور پر خفت شان کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ باتیں "خلاف مروت" کہلاتی ہیں۔"

نماز جماعت میں فقہ جعفری میں کچھ اور شرطیں بھی ہیں مثلاً یہ کہ امام اور ماموم کے بیچ میں کوئی دیوار وغیرہ حائل نہ ہو ورنہ اقتدا درست نہ ہوگی بلکہ اس طرح کھڑا ہونا چاہیے کہ امام کو دیکھ رہا ہو یا ایسے شخص کو جو امام کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اگر امام اونچا اور ماموم نیچے ہو یعنی دونوں میں دو ایک سیڑھیاں ہوں تو نماز صحیح نہ ہوگی۔

روزہ: سال کے ایک مہینے میں جو ماہ رمضان ہے شروع سے آخر تک ہر روز طلوع صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک روزہ واجب ہے جس میں مسلمانوں کے درمیان اصل حکم میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور روزہ میں جن چیزوں کو ترک کرنا لازم ہے جنھیں "مفطرات صوم" کہتے ہیں ان میں بھی کوئی خاص اختلاف نہیں ہے مگر فقہ جعفری میں صرف سورج کا نگاہ سے چھپ جانا افطار کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ جب مشرق کی طرف کی سرخی دور ہو کر ذرا سیاہی چھا جائے اس وقت روزہ کھولنا چاہیے۔

قرآن مجید میں روزہ کی حد یہ بتائی گئی ہے کہ اتموا الصیام الی اللیل (یعنی "روزہ کو رات تک پورا کرو") اور یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ صرف سورج کے آنکھ سے چھپ جانے پر رات کا اطلاق کسی طرح نہیں ہوتا۔

زکوٰۃ: قرآن میں زکوٰۃ کا اکثر جگہ صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ اس پر واجب ہوتی ہے جس کے پاس بقدر نصاب مال سال بھر رکھا ہے۔ اس کے احکام میں فرق اسلامیہ کے درمیان بظاہر کوئی خاص اختلاف نہیں ہے۔

خمس: حقوق مالیہ میں زکوٰۃ کے علاوہ خمس کے متعلق قرآن مجید میں نص صریح موجود ہے انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتٰمیٰ

والمساکین وابن السبیل" جو کچھ بطور مال غنیمت تمہیں حاصل ہوا اس میں پانچواں حصہ خدا اور رسول اور مخصوص صاحبان قرابت اور یتیموں مسکینوں اور اپنے وطن سے دور افتادہ پریشان حال آدمیوں کا ہے۔ اس نص کے بعد یہ تو گنجائش نکل سکتی تھی کہ "ماغنمتم" کی تشریح کے ماتحت ان اموال کی تعیین میں اختلاف ہوتا جن میں خمس واجب ہے چنانچہ علمائے شیعہ کے درمیان اس بارے میں کسی حد تک اختلاف ہے مگر اصل حکم خمس کو تمام مسلمانوں میں متفق علیہ ہونا چاہیے تھا مگر صورت واقعہ یہ ہے کہ صرف فقہ جعفری کے پیروؤں میں یہ حکم قرآن آج تک باقی رکھا گیا ہے اور شریعت کے پابند افراد اس پر عامل ہیں باقی فقہ کے دوسرے مکاتب خیال میں خمس کو احکام شریعت سے خارج کر دیا گیا ہے جس کا کوئی جواز از روئے قرآن نہیں نکلتا۔ یہ ایک اور حیرتناک بات ہے کہ سادات آل رسول کے لیے دو خصوصی حکم از روئے شریعت ثابت ہیں۔ ایک یہ کہ زکوٰۃ غیر سادات کی ان پر حرام ہے اور دوسرے یہ کہ خمس میں انکا حق ہے۔ پہلا حکم ظاہری طور پر قرآن میں موجود نہیں ہے بلکہ سنت سے ثابت ہے اور دوسرا قرآن مجید میں موجود ہے لیکن نتیجہ یہ کہ جمہور دوسرے مسلمانوں میں پہلا حکم تو مستمراً باقی رہا ہے کہ سادات کے زکوٰۃ سے ممنوع ہونے کا تھا اور دوسرا جو سادات کو خمس کے ملنے سے متعلق تھا، فقہ اسلامی سے خارج کر دیا گیا۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

حج زندگی میں ایک بار بشرط استطاعت ہر مسلمان پر فریضہ لازم ہے جس پر تمام فرق اسلامیہ کے ساتھ فرقہ شیعہ کا بھی ایمان ہے مگر خاص مسئلہ جو از روئے قرآن ثابت ہے وہ یہ کہ ان لوگوں کے لیے جو خانہ کعبہ کے باشندہ نہ ہوں، دور سے جائیں "حج تمتع" لازم ہے یعنی پہلے عمرہ کا احرام باندھیں اور پھر عمرہ کے احکام پورے کرنے کے بعد اس احرام کو ختم کر دیں اور ۸؍ ذی الحجہ کو حج کا احرام باندھ کر عرفات جائیں اور مناسک حج بجا لائیں۔ حضرت عمر نے اپنے دور خلافت میں نکاح متعہ کے ساتھ حج تمتع کو ممنوع قرار دے دیا جس کے زیر اثر حج تمتع میں یہ تو نہیں ہو سکا کہ دوسرے مسلمان اسے ممنوع سمجھیں اور عمل بالکل ترک کر دیں مگر وہ اسے فرض یعنی لازمی نہیں سمجھتے شیعہ بتابعت قرآن باہر سے جانے والوں کے لیے اسکو تعین کے ساتھ لازم سمجھتے ہیں

اس کے علاوہ احرام کی کچھ پابندیاں مرد کے لیے فقہ جعفری میں زیادہ ہیں مثلاً بحالتِ رفتار سر پر سایہ کرنا درست نہیں ہے۔ یہ سب پابندیاں رسولؐ و آلِ رسولؐ کے احکام کی بنا پر ثابت ہیں جن پر عمل کرنا شیعوں کے یہاں ضروری ہے۔

جہاد

یعنی نصرتِ دین میں تلوار یا دوسرے خوں ریز اسلحہ کے ذریعے سے مقابلہ کرنا اس میں پیش قدمی کرنا شیعی فقہ کے رو سے بغیر معصوم کی سربراہی یا اجازت کے نہیں ہو سکتی اس لیے کہ جان دینا شہادت اسی وقت قرار پا سکتا ہے جب فی سبیل اللہ ہو اور فی سبیل اللہ یعنی رضائے الٰہی کے صحیح معیار کی شناخت یقینی طور پر معصوم ہی کی نگاہ کر سکتی ہے۔

ہاں جب کوئی حملہ آور ہو تو دفاعی طور پر جنگ کرنا بہرصورت درست ہے۔

مذہب شیعہ اور تبلیغ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ علی سید المرسلین وآلہ الطاہرین

اسلام میں تبلیغ کی اہمیت

اسلام تبلیغی مذہب ہے اور جب سے اس کی بنیاد پڑی تبلیغ کا پہلو اس کے تعلیمات کا جزو اعظم اور اس کے آئین و اصول میں پیش پیش رہا۔ اس کا نشوونما ترقی و وسعت اور اسکی ابتدائی و انتہائی کامیابیاں سب تبلیغ ہی کے ذریعہ سے تھیں۔ اور یہی اس کی ہردلعزیزی و مقبولیت کا راز ہے۔

وہ لوگ جو اسلام کی اشاعت کا ذریعہ تلوار کو قرار دیتے ہیں انہیں اس پہلو پر غور کرلینے کی ضرورت ہے کہ تلوار اٹھانے کے لیے خود ایک طاقت و قوت درکار ہے اور وہ طاقت و قوت کا حصول گروہ کا رہین منت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ ذریعہ کہ جو اسلامی ترقیوں کے لیے سنگ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ وہ رسول کی قولی و عملی تبلیغ ہی ہے اور کچھ نہیں۔

روحانیت فنا ہو چکی تھی۔ مذہب کی عمارت میں اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی۔ انسانیت کے خدوخال بگڑ چکے تھے اور بہیمیت و حیوانیت کا دور دورہ تھا۔ رواداری و ہمدردی بے معنی الفاظ بن چکے تھے۔ اور گمراہی و ضلالت کا سیلاب پوری طاقت کے ساتھ بڑھا چکا تھا۔ اس تاریک دور شرک و جاہلیت میں ایک منفرد و ممتاز نعرہ توحید تھا جو قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا کی آواز کے ساتھ زمین و آسمان کی درمیانی فضا میں گونج رہا تھا اور جس میں

قوتِ انقلاب حق کہ جس نے عالم کی کایا پلٹ کر دیا اور بڑی سے بڑی مادی
طاقتوں کو شکست دی۔

اس میں وہ مقناطیسی جذب تھا جس نے قوتِ احساس رکھنے والے
قلب کو ایک غیر معنوی کشش کے ساتھ کھینچ لیا۔ اور ان کے جسم و روح، طرزِ عمل
اور نظامِ زندگی میں وہ غیر معمولی انقلاب پیدا کیا کہ وہ ایک نئے رنگ
میں رنگے ہوئے نظر آنے لگے (صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ
صبغۃ ونحن لہ عابدون)

یہ مختصر کلمۂ توحید اگر کسی فوج و لشکر کی حیثیت رکھتا ہے، اگر اس میں
تلوار کی برش، نیزہ کی لپک اور تیر کی گونج ہے تو یہ بھی تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ
اسلام تلوار کی قوت اور فوج و لشکر سے پھیلا ہے اور اگر ایسا نہیں بلکہ وہ صرف
ایک معلمانہ دعوتِ حق اور تبلیغ حقانیت ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام
کی نشر و اشاعت کا ذریعہ تبلیغ حق اور بس تبلیغ ۔

وانذر عشیرتک الاقربین کی مخصوص و محدود دائرہ میں دعوت
ہو یا قم فانذر کا عمومی حکم، اس کی تعبیر بہرحال تبلیغ ہی کے ساتھ ہو سکتی ہے
اور اشاعت مذہب میں رسولِ اسلام کے فرائض کو صرف تبلیغ میں منحصر
کرتے ہوئے وما ارسلناک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیراً میں آپ کے
دعوتِ حقانیت کے صرف دو پہلوؤں کو روشن کیا گیا ہے ایک بشارت اور
دوسرے انذار یعنی وعدۂ جنت اور وعیدِ نار جو تبلیغ ہی کے دو شعبے ہیں اور
ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم
بالتی ھی احسن کے جامع الفاظ سے تبلیغ کا دستورِ عمل اور اس کا طرزِ عمل
پیش کیا گیا ہے جس کے مندرجہ ہدایات کے مطابق تبلیغ کے فریضہ کو انجام دینے

ہونا چاہیے۔ اور ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر و یامرون
بالمعروف و ینھون عن المنکر کے حکم عام سے ہمیشہ کے لیے
دعوت و تبلیغ کے سلسلہ کے باقی رہنے کی پیش بندی کی گئی جس پر
کاربند ہونا ہر زمانہ میں فرض کی حیثیت سے اہم ہوا۔

ان آیات میں غور کرنے سے صاف یہ نتیجہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی نشر و
اشاعت کے سلسلہ میں جو خاص طریقہ کار مقرر کیا گیا ہے وہ دعوت و تبلیغ
ہے اور اسی کو بار بار صراحت سے نمایاں کیا جانا ضروری سمجھا گیا ہے لیکن نشر و
اشاعت کے سلسلہ میں قوت کی وسعت آزمائی اسلام کے اصول اساسی میں
کسی جگہ نظر نہیں آتی، ورنہ ادع الی سبیل ربک کے الفاظ میں سب سے
پہلے یا بعد دعوت بالسیف کا تذکرہ ضرور ہوتا۔

بلکہ لا اکراہ فی الدین۔ اتکرہ الناس حتی یکونوا مومنین
وما انت علیھم بمصیطر کے الفاظ میں جبر و قہر کی نفی کر دی گئی ہے اور
ما علی الرسول الا البلاغ کہہ کر رسول کے فرض کو صرف سلسلہ
تبلیغ میں متعین کیا گیا ہے۔

تاریخ اسلام کا سرسری نظر سے مطالعہ بھی اس امر کے اندازہ کے لیے
کافی ہوگا کہ رسول صلعم کے طرز عمل میں بھی یہ پہلو پیش نظر رہا۔ حضور صلی اللہ
نے دعوت و تبلیغ کے فرض کو اپنا اولین نقطہ نظر بنائے رکھا اور یہی آپ
کی صداقت کا اصلی جوہر اور آپ کی کامیابی کا حقیقی راز تھا۔ مکہ کی فضا جہاں
تیرہ برس تک تشدد و سختی کا غلبہ رہا تھا وہاں دعوت حقانیت کا ایک حیرت
انگیز مجسمہ خاموش و بیباک تبلیغ میں مصروف تھا اور دنیا کی باطل طاقتوں کو اپنے
روحانی پیغام کے بے خوف و خطر لہجوں سے متزلزل بنائے ہوئے تھا۔

مہاجرین کی اپنی جماعت تھی جس کے کارنامۂ عمل سے اسلامی تاریخ کے ورق آج تک مسلسل پُر ہیں بلکہ انصار کی بھی جماعت جن کی فداکاری و جاں نثاری سے کر صداقت عہد و پیمانِ رسول کی ہجرت کے لیے محرک ہوئے۔ وہ سب اسی خارجی تبلیغی دور کے نتائج ہیں اور اسلامی کامیابیوں اور بہتریاں اور اس کے عنصری واقعات کا تعلق زیادہ تر اسی جماعت کے ساتھ ہے ورنہ اسلام کے آخری ادوار میں اور اسلامی مجاہدات کے بعد جو مدافعانہ ضروریات سے مجبور ہو کر لیے گئے تھے جتنے لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان میں سے زیادہ تر بیشتر مؤلفۃ القلوب اور ادنیٰ درجہ کے اشخاص ہیں جن کا اسلام کے روشن و زریں خصوصیات میں نہ کوئی ہاتھ ہے اور نہ کوئی تعلق۔ اس سے یہ نتیجہ زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کا حقیقی جوہر نشر و اشاعت دعوت و تبلیغ تھا اور اس کے بہترین نتائج کامیابی صرف اسی کا نتیجہ ہیں اور بس۔

علاوہ ان کارگزاریوں کے جو رسالتمآب بذاتِ خود تبلیغ و دعوت کے سلسلہ میں انجام دے رہے تھے حضرت نے تبلیغی کام کو وسیع پیمانہ پر آگے بڑھانے کے لیے تبلیغی وفود بھی روانہ فرمائے جن میں ملک حبش، فارس اور اسکندریہ کے والی و سلاطین بھی شامل ہیں اور یمن کی جانب اپنے ابن عم امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالب کو یہ کہہ کر روانہ فرمایا کہ لان یہدی اللہ بک واحداً خیرلک من الدنیا وما فیہا "تمہارے ہاتھ سے ایک شخص کی ہدایت ہو جائے تو یہ تمہارے لیے تمام دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے"۔

اس وقت بھی کہ جب اسلام کا مجاہدانہ دور شروع ہو چکا ہے رسالتمآب کے طرزِ عمل سے یہ صراحت نمایاں ہے کہ آپ کا اصلی نقطۂ نظر جنگ کرنا اور فتح و ظفر حاصل کرنا نہیں ہے بلکہ آپ حتی الامکان ایسے مواقع بہم پہنچاتے ہیں کہ جنگ کی

ہو گئے۔

حدیبیہ کی صلح میں جو اکثر جگہ صاف طور پر گراں ہی گزری یہ پہلو بہت زیادہ قابل ہے اسلام کے احکام شرعی اور فرائض مذہبی میں بھی جہاں تک دیکھا جائے بہت نمایاں تبلیغی مفاد مدنظر رکھا گیا ہے۔

پانچ وقت کا بلند بانگ نعرۂ توحید جو اذان کی صورت سے بلند ہوتا ہے وہ بھی تبلیغ کی غرض سے ہے اور نماز جماعت کا حکم اور اس میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں شریک ہونے کا اہتمام اور پھر حج میں تمام اطراف عالم کے مسلمانوں کو ایک مقام پر مجتمع ہونے کی دعوت شوکتِ اسلامی کے مظاہرہ کی رعایت واضح حیثیت رکھتی ہے۔

رسالتمآب کی زندگی کے آخر کا سب سے بڑا عظیم الشان واقعہ وہ بھی حضرت کی تبلیغی زندگی کا انتہائی اہم باب ہے جس کے متعلق خاص طور سے حضرت احدیت کی طرف سے حکم نازل ہوا تھا کہ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک وان لم تفعل فما بلغت رسالتہ واللہ یعصمک من الناس اور اسی فرض تبلیغ کے ادا ہونے کے بعد یہ پیغام پہنچا تھا کہ الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا اور رسالتمآب نے اس تبلیغ کو ہمہ گیر و غیر محدود بنانے کے لیے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں یہ اعلان فرمایا کہ فلیبلغ الشاھد الغائب جو اس وقت موجود رہنے والا ہے اس کا فرض ہے کہ وہ ان تک جو موجود نہیں ہیں اس کی تبلیغ کر دیں۔

رسولِ اسلام کے بعد مسلمانوں کے زاویۂ نظر میں اختلاف

مذکورہ بالا واقعات اور نیز اسلامی تاریخ کے ہر صفحے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ رسالتمآب کی زندگی کا حقیقی نصب العین اور نقطۂ نظر تبلیغ تھا اور یہی اسلام کی

ترقی و اشاعت کا واحد ذریعہ ہے اور اس درمیان میں رسالتمآب کا تلوار اٹھانا اور میدان جنگ میں آنا صرف ضمنی حیثیت رکھتا ہے جو موانع کے رفع کرنے اور جابرانہ طاقتوں کے دفع کرنے کے لیے تھا۔ اور اس کو براہ راست اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں کوئی دخل نہیں ہے۔

لیکن انسان افراد کا بیشتر حصہ اپنی افتادِ طبع کی بنا پر تنگ نظر اور ظاہر بیں ہوتا ہے وہ اپنے پست خیالی اور مادہ کے قیود میں گرفتاری کی وجہ سے ہر بات کے وجوہ و اسباب کو مادیات میں تلاش کرتا ہے۔ اور ایک بات کو نکال کر اسی کو واحد سبب قرار دے لیتا ہے اور اس لیے اسلام کی نشر و اشاعت کو جو تمام تر روحانی تعلیم و تلقین اور دعوت و تبلیغ پر مبنی تھی۔ مادی طاقت و قوت کا نتیجہ خیال کر کے بہت سے اس کے مخالفین یہ کہنے لگے کہ اسلام تلوار سے پھیلا ہے اور اس کی ترقی و اشاعت صرف جنگ و خونریزی کا نتیجہ ہے۔

ہمیں ان سے شکایت ہے اور بجا شکایت ہے اور حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے حقیقۃً عداوت اور تعصب اور فرق اغراض و تنگ بینی کی بنا پر اسلامی تاریخ کے واقعات کو انصاف اور صبر و سکون کے ساتھ پڑھا ہی نہیں ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے اور اس وقت ہمارے حیرت اور افسوس کی انتہا نہیں رہتی جب ہم دیکھتے ہیں کہ خود مسلمانوں نے رسالتمآب کی کامیابی اور اسلام کی حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی و اشاعت کے حقیقی فلسفہ پر غور نہیں کیا۔ اور وہ اس میں صحیح نقطہ پر نہ پہنچ سکے۔

رسالتمآب کے بعد مسلمانوں میں جو افتراق پیدا ہوا اور وہ اقلیت و اکثریت دو حصوں میں منقسم ہو گئے ان میں اکثریت نے یہی کہا کہ رسول کی کامیابی کا حقیقی راز صرف تلوار میں مضمر تھا۔ اور جب ہی انھوں نے بھی کشادہ حوصلگی کے

ساتھ تلوار کھینچ لی اور بیمصر علمی مدعیوں کے مقابلہ پر اس کا استعمال شروع کر دیا اور اس پاس کے مالک پر فوج کشی اور سفاکی میں اپنی طاقت صرف کر دی اور اس طرح دنیا کے امن وامان کو خاک میں ملا کر اسلام کو جو سلامتی اور صلح پسندی سے مشتق ہے، امن وامان کا دشمن ثابت کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اغیار کا یہ الزام کہ "اسلام تلوار سے پھیلا"* اس کی ذمہ داری بہت کچھ ان ہی اہلِ اسلام کے سر ہے جنہوں نے عملی طور پر اسلامی مفاد اور سلاطین کے نصب العین و مقصد نظر کی غلط ترجمانی کی اور یہ ثابت کیا کہ اسلام کی ترقی و اشاعت تلوار کھینچنے پر موقوف ہے۔ ایک طرف تو تیغ آزمائی وصف آرائی میں یہ انہماک اور دوسری طرف اسلام کے حقیقی مقاصد یعنی علمی تحقیقات اور مذہب کی حقیقی تبلیغ وتعلیم کو اس طرح پامال کر دیا کہ وہ فنا کے قریب پہنچ جائے، وہ دور کس سنگ دوش کے جانے کے قابل ہے جس میں معارف و حقائق کا چرچا نہ رہے، فلسفۂ الٰہیات اور علم کلام کے مسائل گوشۂ گمنامی میں پڑ جائیں۔ تصنیف وتالیف کا دروازہ بند ہو اور روایت احادیث کے تحت پابندیاں عائد ہوں، کتب علمیہ کی چھان بین اور تنقید و تجزیہ علمی تحقیقات کے راستے میں روڑے اٹکائے جائیں۔

علمی دنیا میں یہ امر کیا اچھی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے کہ اس عصر میں اگر کسی شخص کے دل میں کوئی شبہ پیدا ہو اور وہ کسی مذہبی مسئلہ کے متعلق تحقیقات کرنا چاہتا ہو تو بجائے اس کے کہ اس شبہ کو حل کیا جائے اور اس کی تسکین کی کوشش کی جائے اس کو تازیانہ سے تنبیہ کی جاتی تھی اور اکثر ضرب شدید تک نوبت پہنچا دی جاتی تھی۔

* ملاحظہ ہو امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم، وہ تحریر فرماتے ہیں۔

سیدنا عمرسے باب الکلام والجدل دضرب صبیغا بالدرۃ لما اوردعلیہ سؤالا فی تعارض آیتین من کتاب اللہ تعالی وھجرہ وامرالناس بھجرہ" سیدنا عمرنے علم کلام اور مذہبی بحث کے دروازہ کو بند کردیا اور اخیرسے ایک شخص کو جس کا نام صبیغ تھا درہ سے مارا جب اس نے آپ سے قرآن مجید کی دو آیتوں کے باہمی اختلاف کے متعلق سوال کیا اور اس کو جلاوطن کردیا اور تمام لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس سے قطع تعلق کردیں۔"

شارح قاموس سید مرتضیٰ زبیدی اپنی کتاب اتحاف السادۃ المتقین فی شرح احیاء علوم الدین مطبوعہ مصر ج ۱ صفحہ ۱۹۸ میں مذکورہ بالا عبارت کے تحت میں لکھتے ہیں :-

"ورأیت بخط الحافظ الذھبی فی کتاب لہ سماہ نعم السمر فی سیرۃ عمر مانصہ حدثنا مکی بن ابراہیم حدثنا الجعید بن عبدالرحمن عن یزید بن خصیفۃ عن السائب بن یزید قال اتی رجل عمر فقال یا امیرالمؤمنین انا لقینا رجلا یسأل عن تاویل القرآن فقال اللھم مکنی منہ فبینا عمر جالس اذ جاءہ علیہ عمامۃ وثیاب فقال یا امیرالمؤمنین والذاریات ذروا فالحاملات وقرا قال عمر انت ھو فقام الیہ وحسرعن ذراعیہ فلم یزل یجلدہ حتی سقطت عمامتہ فقال والذی نفس عمر بیدہ لو وجدتک محلوقا لضربت بہ رأسک البسوہ ثیابہ واحملوہ علی قتب واخرجوہ حتی تقدموا بہ بلادہ ثم لیقم خطیبا فلیقل

ان صبیغاً رشق العلم فاخطاه فلم یزل وضیعاً فی
قومه حتیٰ هلک وکان سید قومه"

"حافظ ذہبی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تصنیف "نقد الصرار تیز عمر"
میں مسلسل سند کے ساتھ تحریر ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر
کی خدمت میں آکر بیان کیا کہ ایک شخص ہے جو تاویل قرآن
کے متعلق کوئی سوال پیش کرتا ہے، یہ سن کر حضرت عمر نے کہا
خدا کرے وہ میرے ہاتھ آجائے۔ اتنی دیر میں وہ شخص آگیا،
اس کے سر پر عمامہ تھا اور جسم پر اچھا خاصہ لباس تھا اس نے
کہا یا امیر المومنین یہ آیت ما تعبیرہ۔ والذاریات ذرواً فالحاملات
وقراً۔

حضرت عمر: "اچھا تو یہی وہ ہے۔" بس یہ کہہ کر کھڑے ہو گئے اور
آستینیں چڑھا کے کوڑے مارنا شروع کر دیے اتنے کوڑے
لگائے کہ اس کا عمامہ گر گیا اور کہا کہ قسم اس کی جس کے ہاتھ میں عمر کی
جان ہے اگر میں تیرا سر منڈا ہوا پاتا تو تیرے سر پر بھی کوڑے لگاتا۔
اچھا اب اس کو اس کے کپڑے پہنا دو اور اس کو ایک اونٹ پر سوار
کر کے یہاں سے نکال باہر کرو اور جب یہ اپنے گھر پہنچے تو وہاں کوئی کھڑے
ہو کر عام اعلان کرے کہ صبیغ نے علم حاصل کرنا چاہا تھا لیکن
غلط راستہ اختیار کیا۔

بس وہ دن تھا کہ اس کے بعد سے صبیغ اپنی قوم میں ذلیل ہو گیا حالانکہ وہ اپنی
قوم میں سردار کی حیثیت رکھتا تھا۔

دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے ابو موسیٰ کو لکھ دیا اس کے ساتھ نشست
برخاست نہ کرنا۔

ابوعثمان نہدی کا بیان ہے کان لو رآنا ونحن ماشیۃ تفرقنا عنہ جب وہ آجاتا تھا تو ہم آدمی بھی ایک جگہ بیٹھے ہوتے تو وہ سب تمام متفرق ہو جاتے تھے۔

سلیمان بن یسار کا بیان ہے کہ ان صبیغ بن عسل قدم المدینۃ فجعل یسأل عن المتشابہ فبعث الیہ عمر و اعد لہ عراجین النخل فلما حضر قال لہ من انت قال عبد اللہ صبیغ قال وانا عبد اللہ عمر ثم قام فضرب راسہ بعرجون فشجہ ثم تابع ضربہ حتی سال الدم علی وجہہ فقال حسبک یا امیر المؤمنین فقد واللہ ذھب ما کنت اجد فی راسی

صبیغ بن عسل ایک شخص تھا وہ مدینہ آیا اور بعض متشابہ آیتوں کے متعلق دریافت کرنے لگا۔ حضرت عمر نے اس کو بلوا بھیجا اور پہلے سے بہت شاخیں درخت خرما کی اپنے پاس رکھ لیں جب وہ آیا تو حضرت عمر نے پوچھا تو کون ہے اس نے کہا کہ خدا کا بندہ صبیغ۔ عمر نے کہا اور میں ہوں خدا کا بندہ عمر۔ یہ کہہ کر اٹھے اور ایک شاخ خرمے کی لیکے اس کے سر پر ماری جس سے اس کے زخم آگیا۔ پھر برابر اس کو مارتے رہے یہاں تک کہ خون بہہ کر اس کے چہرے پر آگیا۔ اس نے کہا بس بس یا امیر المومنین کافی ہے اب وہ خیال میرے دماغ سے نکل گیا جو گردش کر رہا تھا۔

یہ الفاظ بہت معنی خیز ہیں جبر و تشدد اور سختی و تمرد یہ اگر کسی علمی اعتراض اور جستجو دماغی کے لیے تسکین کا ذریعہ ہو سکتی ہے تو بے شک حضرت عمر کی یہ کاروائی نتیجہ خیز ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔

ابن سیرین کہتے ہیں کتب عمر الی ابی موسیٰ ان لا یجالس صبیغ وان
یحرم عطاءہ ورزقہ

حضرت عمر نے ابو موسیٰ اشعری کو جو بصرہ کے حاکم تھے لکھا تھا کہ صبیغ کے پاس کوئی بیٹھنے پائے نہیں اور بیت المال سے جو اس کا عطیہ اور وظیفہ ہے وہ بند کر دیا جائے۔

سیوطی کی روایت ہے کہ انہ حلف لابی موسیٰ بالایمان المغلظۃ ما یجد فی نفسہ مما کان شیئا فکتب فی ذلک الی عمر فاجابہ اظنہ قد صدق فخل بینہ وبین الناس۔

صبیغ مذکور نے ابو موسیٰ سے بڑی سخت قسمیں کھا کر بیان کیا کہ اب بالکل وہ سابقہ خیالات اس کے دل میں نہیں رہے، ابو موسیٰ نے اسے حضرت عمر کو لکھا، انھوں نے فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ وہ سچ کہتا ہے اس کے بعد سے لوگوں کو اس سے ملنے جلنے کی مخالفت نہیں رہی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی علمی سوال پر سختی و تشدد کسی طرح مناسب نہیں کہا جا سکتا۔ اس سختی و تشدد کے بعد معترض کا یہ کہہ دینا کہ اس کی تسکین ہو گئی اس کے تسکین قلب کی دلیل نہیں ہے بلکہ اس قسم کے طرز عمل سے عام افراد کو یہ خیال قائم کر لینے کا موقع مل سکتا ہے کہ سوال لاجواب تھا اور سوائے مظاہرۂ جبر و تشدد کے اس کا کوئی حل موجود نہ تھا۔

اس دور میں تصنیف و تالیف اور کتابت علوم و معارف کا کام بھی جو مفید تھا بلاشبہ ایک مخصوص نظریہ کے ماتحت صرف نظر انداز نہیں بلکہ ممنوع قرار پا گیا تھا اور مسلمانوں کو علمی و مذہبی آثار کے قلمبند کرنے سے منع کیا جا رہا تھا۔

وہی مخصوص نظریہ جس کی بنا پر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتابت قرطاس کو نامنظور سمجھا تھا۔ اسی کی بنا پر اب عام ارباب علم کو کتابت احادیث سے منع کیا جاتا تھا۔ اور فرمایا جاتا تھا کہ لاکتاب مع کتاب اللہ۔ "خدا کی کتاب کی موجودگی میں اب کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے"

امام مسلم نے بھی اپنی کتاب صحیح کے شروع میں دبی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے۔ اختلفوا فی کتابة الحدیث فکرھا طائفة منھم عمر بن الخطاب

"احادیث کے قلمبند کرنے کے بارے میں اختلاف ہوا ہے اور ایک جماعت نے اس کو ناپسند کیا ہے جن میں سے حضرت عمر ہیں"

عروہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر نے احکام حلال وحرام کے قلمبند کرنے کا ارادہ کیا تھا، مگر بعد میں آپ کی رائے میں تبدیلی ہوئی۔ آپ نے اعلان فرمایا کہ انی کنت ارید ان اکتب السنن وانی ذکرت قوما کانوا قبلکم کتبوا کتبا فاکبوا علیھا وترکوا کتاب اللہ وانی واللہ لا اشوب کتاب اللہ بشئی ابدا۔

"میرا ارادہ ہوا تھا کہ احادیث کے قلمبند کرنے کا انتظام کروں لیکن مجھے خیال آیا کہ بہت سے لوگ سابق امم و اقوام میں ایسی گزرے جنہوں نے کتابیں تصنیف کیں اور ان ہی کتابوں کے ہو رہے اللہ کی کتاب خدا کو ترک کر دیا۔ میں خدا کی قسم کتاب خدا کے ساتھ کسی چیز کی آمیزش نہیں ہونے دوں گا"

دوسرے لوگوں میں بھی بعض افراد نے اس خیال میں آپ کے ساتھ اتفاق کیا۔ ابن سیرین کہتے تھے، انما ضلت بنی اسرائیل بکتب ورثوھا عن ابائھم۔ "بنی اسرائیل جو گمراہ ہو گئے وہ ان ہی کتابوں سے جو باپ دادا سے انہیں پہنچی تھیں"

زہری کا قول ہے کہ "انا کنا نکرہ کتاب العلم" ہم لوگ علمی مطالب کے قید تحریر میں لانے والوں کو ہمیشہ بری نظر سے دیکھتے تھے۔

یہ تو علمی و تبلیغی شعبوں کی خانہ ویرانی تھی لیکن اس کے برخلاف فتح کشی و وسعت آرائی میں انہماک۔ اس پالیسی کے مطابق پے در پے حملوں کا جوش، اسلامی مملکت کی توسیع کا خیال اور فتح و ظفر کا خوش کن طنطنہ جس کی بنا پر اس زمانہ کو نشر و اشاعت اسلام کا سب سے زیادہ زریں دور کہا جاتا ہے وہ اعلیٰ پیمانہ پر جاری تھا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت کے ذمہ دار افراد نے نشر اسلام کے رموز کو علوم و معارف کی وسعت، حقائق مذہب کی تفسیر، اخلاق حمیدہ کی تلقین اور سیرت نبیؐ کی عملی حیثیت سے تبلیغ میں منحصر نہ کیا تھا، بلکہ تلوار اور صرف تلوار ہی۔

لیکن وہ جماعت کہ جو اقلیت میں تھی اور عروج میں آتی کم کہ شمار میں آنے کے قابل نہ تھی اس نے نشر و اشاعت حق کے اصلی مرکز کو سمجھ لیا تھا اور اس کی جوہر کی حفاظت میں اس نے اپنی کوشش صرف کی اور اسی نقطۂ نظر کی تبلیغ میں جسے وہ سچائی کے ساتھ حقیقی اسلام کی حفاظت کا ذریعہ سمجھتی تھی، پر امن تبلیغ و تعلیم کے سلسلہ کو اختیار کیا اور ملک کی پر امن فضا کو مکدر کئے بغیر وہ اشاعت حق کے فرض کو انجام دیتی رہی۔

یہ جماعت شیعی جماعت ہے جس کی ابتدا، نشوونما، ترقی و وسعت سب تبلیغ و تعلیم کے ذریعہ سے ہوئی اور اسی فرض کو اس نے جانفشانی و تندہی کے ساتھ انجام دیا۔

مذہب شیعہ کی سب سے پہلی تبلیغ

یہ امر تاریخی حیثیت سے یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضرت

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتقال کے بعد سب سے پہلی جماعت جس نے اکثریت اور دبدبۂ حکومت کے خلاف تبلیغ حق کی آواز بلند کی ہے وہ صحابۂ کرام ہی سے بارہ آدمیوں کی جماعت تھی۔ خالد بن سعید بن العاص۔ ابی بن کعب ابوذر غفاری، مقداد بن اسود کندی، عبادہ بن صامت، سلمان فارسی، ابوالہیثم بن تیہان، عمار بن یاسر، خزیمہ بن ثابت ذوالشہادتین، سہل بن حنیف، ابو ایوب انصاری، جابر بن عبد اللہ۔

یہ لوگ سے جنہوں نے ابتدائی دور میں مسجد نبوی کے اندر نماز جمعہ کے بعد ہی کھڑے ہو کر باری باری اعلان حق کے فرض کو انجام دیا۔ اور انتہائی جرأت کے ایمانی قوت اور جوش و خروش کے ساتھ بسیط تقریروں میں اپنے نقطۂ نظر کو واضح کیا۔

علامہ فضل بن شاذان نے جو دوسری صدی ہجری کے محدث اور متکلم ہیں ان تقریروں کو اپنی کتاب رجال میں مکمل طور سے درج کیا ہے۔ اور صدوق ابن بابویہ قمی کی کتاب امالی اور طبرسی کی کتاب الاحتجاج میں بھی ان کا تذکرہ ہے

یہ مذہب شیعہ کی سب سے پہلی تبلیغ تھی جو رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اس اعلان کے ساتھ ادا کی گئی اور یہی حضرات وہ تھے جنہوں نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر انتہائی پُرامن طریقہ سے مذہب تشیع کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھا۔

سلسلۂ تبلیغ میں پہلا دورۂ سفر حضرت ابوذر غفاری رضوان اللہ علیہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے تبلیغ کے دائرہ کو وسیع کیا اور مذہب شیعہ کا حجاز کی حدود سے باہر دوسرے ملک میں شائع و منتشر کیا۔ اس وقت جب حضرت عثمان نے

ان کو شام بھجوا دیا اور علاقہ شام کے پایۂ تخت "دمشق" میں ان کا رہنا حکومت شام کے ملکی مصالح کے خلاف ثابت ہوا تو ان کو شام کے بیرونی دیہات اور کوہستانی علاقہ کی طرف جس کا نام "جبل عامل" ہے روانہ کر دیا گیا۔ یہاں انھیں شیعیت کی تبلیغ کا اچھا موقع مل گیا۔ اور سب سے پہلے جس قریہ میں ان کا داخلہ ہوا وہ "میس" تھا اور اس نے پورے طور سے ان کی دعوت پر لبیک کہی۔ دوسرا قریہ "صرفند" ہے جہاں کے رہنے والوں نے تشیع کو قبول کیا اور یہاں حضرت ابوذر کے نام کی ایک مسجد اور زیارت گاہ بطور یادگار اب تک قائم ہے (العرفان ج ۲ ص ۲۳۳)

اسی سلسلۂ تبلیغ میں ان کو وہ سخت تکلیفیں برداشت کرنا پڑیں جن کا آخری دلسوز نتیجہ "ربذہ" کے بے آب و گیاہ چٹیل میدان غربت میں ایک حسرتناک موت کی صورت میں ظاہر ہوا۔

تبلیغ شیعیت کے مختلف دور

بنی امیہ اور بنی عباس کی سلطنت میں تشیع کا نام بھی لینا جرم سمجھا جاتا تھا اور کیا مجال تھی کہ کوئی شخص عقیدۂ تشیع کا اظہار بھی کر سکے۔

مگر مبارک تھیں وہ ہستیاں جنھوں نے سلطنت وقت کے تمام جاہ و جلال، شوکت و جبروت کے باوجود اپنے فریضۂ تبلیغ حق میں کوتاہی نہیں کی۔ انھوں نے قید و بند کی سختیاں گوارا کیں، سولیوں پر جانا اور تلواروں سے گردنوں کا قلم ہونا منظور کیا مگر کھنچی ہوئی تلواروں کی چھاؤں میں بھی ان کی زبانیں اعلائے کلمۂ حق میں مصروف رہیں۔

اموی سلطنت کے دور میں حجر بن عدی، میثم تمار، رشید ہجری اور آخر میں سعید بن جبیر تابعی اور بنی عباس کے دور میں ابن سکیت نحوی وغیرہ وہ شہدائے راہ حق ہیں جنہوں نے حق گوئی کے جرم میں پاداش قتل کو برداشت کیا۔

بہت سے کارپردازان تبلیغ ایسے تھے جنہوں نے تقیہ نہیں کیا، جیسے کمیت بن زید اسدی جن کی زندگانی شاعری سرتاسر تبلیغ مذہب کا پہلو لیے ہوئے تھی اور اسی طرح فرزدق، دعبل، سید حمیری وغیرہ۔

امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہما السلام کے زمانہ میں تقیہ کی پابندیاں بہت کم تھیں، اس لیے متکلمین علم کلام نے خوب ترقی کی اور مبلغین کو ایک حد تک آزادی سے دعوت و تبلیغ کا موقع ملا۔

ان میں ہشام بن حکم، ہشام بن سالم، قیس ماصر، مومن الطاق وغیرہ بڑے متکلمین ہیں جنہوں نے مناظرات و مصنفات کے ذریعے سے مذہب شیعہ کے بڑے خدمات انجام دیے۔

اصحاب ائمہ کا دور ختم ہونے کے بعد علمائے مذہب کا دور شروع ہوتا ہے جس میں تبلیغ مذہب کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا۔

ان میں سے ہر دور کے سرآمد مبلغین اور ان کے علمی و تبلیغی خدمات کا تذکرہ بہت زیادہ بسط و تفصیل کا محتاج ہے جس کے لیے اگر زمانہ مہلت دے اور توفیق الٰہی شامل حال

ہو تو ایک مستقل تصنیف درکار ہے۔ اس وقت مزاج وقت ہے اور نہ موقع و محل کا اقتضاء ان تمام مبلغین کے تذکرہ کی اجازت دیتا ہے۔

مملکت ایران میں صفوی سلاطین جب برسراقتدار آئے تو ان کی روحوں کو اپنی سلطنت کا فرسے سیر وسیراب (بلکہ) انھوں نے ایران میں مذہب شیعہ کی نشر و اشاعت میں پورے انہماک کے ساتھ (مگر بزور شمشیر نہیں) کوشش کی اور اس میں کامیاب ہوئے کہ ایران پورا ایک شیعی ملک کی شکل میں آگیا۔

ہندوستان میں مذہب شیعہ کی تبلیغ

ہندوستان میں شیعی

مذہب کی تبلیغ کا سہرا تو جہاں تک میں سمجھتا ہوں ایرانیوں کے سر ہے اور ان میں بہت زیادہ سادات کو خصوصیت ہے۔

ہندوستان ہمیشہ سے زرخیز اور مال و دولت کا خواہ مشہور رہا ہے۔ اس لیے غیر ممالک کے لوگ جب پریشانی میں مبتلا ہوتے تو سب سے پہلے اپنے درد کا درماں یہیں سمجھتے کہ ہندوستان چلے آئیں۔

یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں شریف مسلمانوں کے خاندان بہت کم ایسے ہوں گے جن کا رشتہ ایران و عراق سے ملتا جلتا نہ ہو۔

سلاطین مغلیہ کے دور حکومت میں بڑے بڑے ارکان دولت اور ذمہ دار امرائے مملکت زیادہ تر ایرانی نژاد اور

شیعہ تھے۔ اور ان ہی کے ذریعے سے علمائے شیعہ کا جو زیادہ تر ایرانی یا عراقی ہوا کرتے تھے سلسلۂ آمد و رفت قائم تھا اور اکثر حضرات کو ان میں سے یہاں قیام کا موقع حاصل ہوتا تھا۔

صوفیت نے برعکس اس کے میرے خیال میں تشیع کی پرورش میں بڑا کام کیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اکثر صوفیائے کرام کے خیالات بعض امور میں شیعوں سے ملتے جلتے اور ان کے قریب ہوتے ہیں اور کم از کم ان کو تعصب شیعوں سے اتنا نہیں ہوتا جتنا دوسرے بہت سے افراد کو۔ حیدر آباد میں شیعیت کی تبلیغ اسی تصوف کے پردے میں شاہ طاہر رحمۃ اللہ علیہ نے کی جو ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اس کے بعد یہ حقیقت ہے اور تاریخ کی رو سے ناقابل انکار امر کہ اس تمام طول طویل مدت میں شیعی افراد کتنے ہی باہر اثر و اقتدار ہوئے اور حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے اور جاہ و منصب حاصل کیے۔ مگر ان کی ترقیاں شخصی و انفرادی تھیں۔ اجتماعی و مذہبی حیثیت سے کوئی تبلیغ و اشاعت مذہب کی اس دور میں نظر نہیں آتی۔

اس اعتبار سے اولیت کا شرف صرف ایک مجاہد ملی کو حاصل ہے۔ جو آج سے تقریباً ڈیڑھ سو برس پہلے پیدا ہوا اور جس نے اپنے ثبات و استقلال، ورزش عمل، و اخلاص قلب، اور جوش مذہبی سے زمین کو آسمان بنا دیا۔

اور ہندوستان بالخصوص صوبۂ اودھ کی مذہبی فضا میں وہ تشیع کی روح پھونکی جس کے روز افزوں نتائج آج شیعوں کی اڑھائی کروڑ کے قریب مردم شماری کی صورت میں نظر آرہے ہیں۔

یہ بزرگ ہستی مجدد ملت جعفریہ حضرت غفرانمآب مولانا سید دلدار علی طاب ثراہ کی ہستی تھی جنھوں نے عراق و ایران سے تکمیل علوم کر کے ہندوستان مراجعت کی اور لکھنؤ کو اپنا مرکز بنا کر شیعیت کا عملی حیثیت سے سنگ بنیاد قائم کیا۔

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ سب سے پہلی نماز جماعت جو اس ملک میں شیعوں کی منعقد ہوئی ہے وہ ۲۷ رجب سنہ ۱۲۰۰ھ کو مسجد حسن رضا خاں واقع[1] گول دروازہ لکھنؤ میں ہوئی جس میں جناب غفرانمآب مقتدا اور بادشاہ مع ارکان دولت اور عام مومنین شہر مقتدی تھے۔ اس کے قبل کوئی نماز جماعت شیعوں کی اس ملک میں نہ ہوئی تھی۔

انھوں نے "عماد الاسلام" لکھ کر ملت جعفریہ کی ناقابل تزلزل بنیاد قائم کی اور "ذوالفقار" "صوارم" "حسام" سے جہاد مذہب میں بیش قیمت کارنامے پیش کیے۔

ان کی اولاد اور تلامذہ نے ان کے قائم کیے ہوئے شجر کو سرسبز و شاداب رکھنے میں پوری کوشش صرف کی اور ملت جعفریہ کے گلوں بہا

---

[1] افسوس ہے کہ اس مسجد کا نام و نشان بھی اب نہیں ہے۔ کوتوالی اور دوسری عمارتوں کی بنیاد اس مسجد کی خراب شدہ بنیادوں پر قائم اور تاریخ رجسیات مذہبی کے لیے ماتم کا سرمایہ ہے۔

خدمات انجام دیے جن کے بہترین نمونے جناب سلطان العلماء رضوان مآب طاب ثراہ کی مذہبی جیلانیہ وطعن الرماح وغیرہ سید العلماء خلد مکان کی حدیقۂ سلطانیہ ، مولانا مفتی محمد قلی صاحب اعلی اللہ مقامہ کی تشئید المطاعن جناب مفتی میر محمد عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ کی روائح القرآن وجواہر عبقریہ مولانا سید حامد حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ کی استقصاء الافحام اور عبقات الانوار کی صورت میں موجود ہیں اور جن کے تبلیغی نقوش صفحات تاریخ کے صفحات پر روشن صورت میں ہمیشہ نمایاں رہیں گے۔

زمانہ رنگ بدلتا ہے۔ اور ضروریات زمانہ میں بھی اسی کے ساتھ انقلاب ہوتا ہے۔ ایک وقت وہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان شرفاء اپنے ایرانی نژاد ہونے کا احساس رکھتے تھے۔ اور اس لیے اپنی اصلی زبان فارسی رکھنے کو فخر سمجھتے تھے۔ اسی زمانہ کے عوام تک فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے اور فارسی کتابوں کا شوق سے مطالعہ کرتے تھے۔ اس لیے اس زمانہ کے ارباب قلم اپنے مصنفات بھی فارسی میں زیادہ تر تحریر کرتے تھے۔ لیکن زمانہ نے ورق پلٹا، اردو نے فارسی کی جگہ حاصل کی اور رفتہ رفتہ فارسی ترک ہونا شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ اب فارسی مثل عربی کے ایک علمی زبان ہو گئی ہے جس کے جاننے والے خال خال نظر آتے ہیں اور زیادہ تر عام افراد فارسی کتابوں سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ تبلیغی مصنفات اہل ملک کے سامنے خود ان ہی کی مادری زبان اردو میں پیش کیے جائیں۔

گذشتہ دور کے علماء میں جناب تاج العلماء سید علی محمد صاحب

قبلہ نے اس ضرورت کا خاص طور سے احساس فرمایا تھا انھوں نے مبسوط و مختصر گرانقدر عربی تصانیف کے علاوہ جن کی فہرست طویل ہے مذہبی حقائق کو اردو کے باس میں پیش کرنے کی طرف بھی توجہ فرمائی۔ ان کا "ترجمہ قرآن" اپنے رنگ کا نرالا اور واحد ترجمہ ہے جو بہت حد تک اس مقصد کا ترجمان ہے اور ان کی بعض دوسری کتابیں بھی اسی قسم کا ایک مخصوص سرمایہ ہیں۔

مرحوم و مغفور علامہ حکیم غلام حسنین صاحب کنتوری اعلی اللہ مقامہ کا بھی ذکر نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے جنھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ تبلیغ مذہب میں کیا اور مضامین و مولفات کے ذریعہ سے شکوک و توہمات کا بڑے وحشہ تک استیصال کیا۔

قبلہ حکما مولانا سید علی ظہر صاحب نے رسالۂ "اصلاح" کا اجراء کیا اور اس طرح نیز مستقل تصانیف کے ذریعہ سے تبلیغ مذہب کے ہزاروں برس گذرنے پر بھی ذیحولے والے خدمات انجام دیے اور مولانا محمد ہارون صاحب زنگی پوری مرحوم نے اپنی عمر کا آخری حصہ تمام تر تصنیف و تالیف میں صرف کرکے سنجیدہ طبقہ کے لیے انتہائی مفید ذخیرۂ معلومات پیش کیا اس کے بعد مدرسۃ الواعظین اور امامیہ مشن دونوں ادارے آپ کے سامنے ہی جو تقریری و تحریری تبلیغ کے مقصد سے قائم ہوئے اور شروع شروع میں قوم نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا اور ان کی ضرورت

کا احساس و اعتراف کیا مگر اب تک یہ اس ترقی کے درجے تک نہیں
پہنچے ہیں جو اس اہم مقصد کے شایانِ شان ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بنی امیہ کے عداوتِ اسلام کی ایک مختصر تاریخ

اقتباس

میدان کربلا کا عظیم کارنامہ

رسول اسلام کی آنکھیں بند ہوتی تھیں کہ عالم میں فتنہ و فساد کی آندھیاں چلنے لگیں اسلام کے مقابل میں وہ کینے دیرینہ جو ابتک دلوں میں آتش زیر خاکستر کی طرح چھپے ہوئے تھے مشتعل ہو گئے مولفۃ القلوب منافقین جنکو رسول نے مصالح اسلامی کی بنا پر فضل و کرم سے ایک حد تک موافق رکھا تھا رسول کی وفات کے بعد اپنے دلی مقاصد کے سرانجام دینے کیلئے آمادہ ہو گئے اور ایک طرف اسلام کو صفحہ عالم سے مٹا دینے کے منصوبے بندھنے لگے دوسری طرف بنی ہاشم کی تیغ کی مستقلی جو جنگ بدر و احد کے گروہ مشرکین کے خون کی ذمہ دار تھیں اور ابتک اسلامی ترقیوں کا سہرا انہیں کے سر تھا۔ اسی کیوجہ سے مقتولین کفار کے ورثہ میں ظاہری اسلام لانے کے بعد بھی انکا بغض و عناد جاگے ہوئے تھا۔ عترت رسول میں پوری کوشش کی گئی کہ ان افراد کی اہانت و تذلیل کی جائے مگر وہ کیا کرتے کہ واسطہ اور رسول کی نسبت جو خود انکی زبان انکی مدح و ثنا کے دفتر کھولے ہوئے دشمنوں کی کوششوں پر پانی پھیر رہی تھی۔

اہلبیت سے بغض و حسد اور انکے ساتھ اسلام کی دشمنی وفات رسول کے بعد عجیب عجیب صورتیں اختیار کیں جنکے ساتھ ملک و دولت کی ہوس اور حکومت و تسلط عالم کے طمع نے سونے پر سہاگے کا کام دیا اسلام اور اسکے ناموس محافظوں کے برخلاف مخالفت کا وہ طوفان بپا ہو گیا کہ الحفیظ۔ گروہ حکیم اہل اسلام جو مدت سلطنت میں سیاست مدن کا سبق حاصل کر چکا تھا اسوقت اپنے ناموش طرز عمل سے اسلام کی حفا

کر رہا تھا وہ مسلم اس وقت بت چلا ہوتا اور مٹا دیا اس وقت قریب تھا اسلام کے
نقش سے سادہ ہو جاتا۔ بنی امیہ کی بے دست اسلام سے عرب الناس تھی اور رسول کو جن کے
ہاتھوں سخت ترین مصائب کا مقابلہ کرنا پڑا تھا وہ ابھی تک اسلام کی
قوت سے متعجب ہو کر کسی طرف بھی خیال سے رسالہ رسول کے بعد حکومت سلطنت انہیں
نصیب ہوئے اسلام کی مخالفت کے سوا کچھ نہ رہا۔ تاہم باوجود رسول کے بعد حکومت
بنی ہاشم سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی بنی امیہ کسمپرسی تیم و عدی کے ہاتھ میں پہنچ گئی
جس کے بعد سے لوگوں کو ان کے بعد صاحب ہونے کی کوئی امید ہی نہیں رہی۔

پہلے ہی دور میں اسلام کے مٹانے کیلئے مکر و تزویر کا جال پھیلا دیا۔ ابوسفیان
اس وقت اسی گروہ میں سرگرم تھا۔ امیر المومنین علی ابن ابی طالب کے پاس آکر کہنے لگا
ما بالکم علی ہذا الامر اذل بیت فی قریش اما واللہ لئن شئت لاملانہا علیہ خیلا ورجالا
یعنی یہ کیسی بات ہے کہ یہ خلافت کے بارے میں تم لوگوں میں سب سے زیادہ ذلیل
خاندان قریش کو مل گئی۔ خدا کی قسم اگر تمہاری مدد کیلئے زمین حجاز کو سواروں اور پیادوں
سے بھر دونگا۔ (دیکھو مستدرک حاکم مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد جلد اول صفحہ ...) یہ وہ وقت
تھا جب امیر اور زبیر جیسے لوگ ہوا کرتے تھے تو اسلام کا خاتمہ تھا وہ عرب جو ابھی تک
اسلامی سلطنت اختلافات سے پہلے خود سر ہو گئے اور دین کو بار گراں سمجھتے تھے
کہ شہادت رسول کے بعد فوراً اسلام کو خیرباد کہہ دیتے تھے بہت مسلمان باقی رہے
مخالفین کے جتنا مقابل ہو جاتے اسلام کا نام لیوا آج کوئی نہ ہوتا لیکن
امیرالمومنین کی بصیرت نے فوراً ابوسفیان کے کلام سے اس کے ضمیر کو دیکھ لیا
تھی جواب میں وہ سب بیان کیا کہ دوبارہ ایسے کلام کی جرأت نہ ہو ارشاد
ہوا کہ تو ہمیشہ اسلام کا دشمن رہا جاہلیت میں بھی اور اسلام کے بعد بھی۔

یہ پہلا وار تھا جو رسول کے بعد بنی امیہ کی طرف سے اسلام پر کیا گیا ...

ہوا مگر دل کی عداوت کہیں جا سکتی ہے وقتاً فوقتاً یہ مختلف صورتیں اختیار کرتی رہی
دوسرے مایوس ہو کر بنی امیہ کو حکومت سے متوسل ہونا پڑا اور اسطرف سے بمقتضائے
وقت ان کی پوری تلافی اور مراعات کی گئی۔ شام کی حکومت کا امیر معاویہ کے پاس علم
ہونا بھی اسی وقت کا ایک کارنامہ ہے جو خوش قسمتی یا بدقسمتی سے حکومت کے تغیر کے دور
میں قرعۂ فال بنی امیہ کے نام نکلا اور اس گروہ کو اسلام کیساتھ اپنی حسرتوں کے
نکالنے کا پورا موقع مل گیا چنانچہ اس عہد میں صحابہ رسول اور سچے اسلامی فرزندوں
کیساتھ جو شرمناک برتاؤ اختیار کئے گئے وہ تاریخ کے اوراق کو تاریک بنا رہے
ہیں پانی سر سے اونچا ہو گیا ظلم و ستم تو سہتے سہتے دونے چوگنے ہلک اٹھے،
جسکا افسوسناک نتیجہ قتل خلیفہ کی صورت میں ظاہر ہوا تاریخ کے دیکھنے سے
اس قتل کی بہت کچھ ذمہ داری بنی امیہ کے سر دکھائی دیتی ہے۔

تاریخ نے پچھے ورق کو الٹا اور وقت نے اپنے مرکز پر عود کیا مدینہ میں بڑے بڑے
صحابہ رسول نے بالاتفاق امیر المومنین علی علیہ السلام کی بیعت کی مگر شام کو دیکھا اور
معاویہ ابن ابی سفیان پورے طور پر قبضہ کئے ہوئے اسلامی شخصی فیصلے کے سامنے سرنگوں نہ
ہونا تھا نہ ہوئے خون عثمان کے بہانے سے علی ابن ابی طالب کے مقابلہ میں کوئی دقیقہ اٹھا
نہیں رکھا گیا جنگ صفین کے سینکڑوں معرکے جن میں ہزاروں مسلمانوں کا خون پانی
کیطرح بہہ گیا اسلام کو کمزور بنانے میں بہت کچھ دخل رکھتے ہیں۔ آخر اس جنگ کا فیصلہ
ایک مکارانہ مصالحت کیساتھ ہوا جو ساتھیوں کی کمزوری اور بے ثباتی سے مجبور ہو کر
امیر المومنین کو قبول کرنا پڑی۔ اگر دیانت و امانت سے کام لیا جاتا تو مسلمانوں کے درمیان سے
اس ناگوار جھگڑے کا خاتمہ ہو سکتا تھا مگر افسوس کہ روز بروز کے بڑھتے ہوئے سبب
نے اس ظاہری مصالحت کو شدہ و فساد کا ایک عظیم پیش خیمہ کر دیا اور عمرو بن العاص نے
ابو موسیٰ اشعری کی سادہ لوحی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر مسئلہ تحکیم کو بازیچۂ اطفال اور مکر و فریب کا

ایک لشکر بنا دیا جس کی وجہ سے لشکر اسلام میں افتراق کی خلیج پہلے سے زیادہ وسیع ہو گئی جنگ نہروان اور خوارج کے اسلام سوز حالات کو بھی اسی جنگ صفین کا ایک شاخسانہ سمجھنا چاہئے بہرحال یہ وہ وقت تھا کہ شام کے تخت پر بنی امیہ کے قدم پوری طاقت کے ساتھ جم گئے تھے ادھر امیر المومنین علیہ السلام کو مسجد کوفہ میں شہید کیا گیا ادھر شام میں مخالفت اہلبیت کا طوفان پوری قوت سے بلند ہو گیا امام حسن علیہ السلام کو انصار کی کمی اور دشمنوں کی کثرت کے سبب سے خانہ نشین ہونا پڑا معاویہ کو پوری آزادی حاصل ہو گئی دمشق بلکہ تمام بلاد اسلامیہ کے منبروں پر کھلم کھلا جرأت کیساتھ اہلبیت رسول پر لعن و طعن کا بازار گرم ہو گیا اہلبیت رسول کی مخالفت میں خزانوں کے دہانے اور کیسہ ہائے زر و جواہر کے منہ کھول دیئے گئے رواۃ احادیث کو نوٹ دیئے جاتے تھے کہ وہ امیر المومنین کی مذمت میں وضع احادیث کریں ابو الحسن علی بن محمد مدائنی جو اسلامی مؤرخین میں بڑے پایہ کا شخص ہے اپنی کتاب الاحداث میں اس زمانہ کی حالت کی عجیب و غریب الفاظ میں تصویر کھینچی ہے وہ لکھتا ہے کہ:-

معاویہ نے ایک فرمان اپنے تمام گورنروں کے پاس بھیجا کہ میں اپنی ذمہ داری کو بری ہوں اس شخص کی حفاظت سے جو ابو طالب کی فضیلت میں کوئی روایت بیان کرے بس پھر کیا تھا ہر شہر و قریہ میں اور ہر منبر پر خطباء و واعظین علی بن ابی طالب کے لعن کیلئے کھڑے ہو گئے سب سے زیادہ مصیبت اہل کوفہ کیلئے تھی کیونکہ ان میں شیعہ ایک خاص تعداد میں تھے معاویہ نے وہاں زیاد بن سمیہ کو حاکم بنا دیا اُس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو قتل کرنا شروع کیا ہاتھ پاؤں کٹوائے آنکھیں نکالیں درختوں پر سولی چڑھایا یہاں تک کہ کوئی مشہور و معروف شخص ان میں سے باقی نہیں رہا اس کے بعد صحابہ کبار کے فضائل میں احادیث وضع ہونا شروع ہوئے یہاں تک کہ ہر خطہ عالم میں مشہور ہو گئے علی بن ابی طالب کی ذات سے اسلام کو جو عروج ملا تھا اس کو جیسے عمل

تھا کہ علی کی عداوت اسلام کی حدود تک تو پہنچتی اس فسق و کذب اور ظلم و جور نے تمام اسلامی تعلیمات کو فنا کر دیا اور دلوں سے اسلامی روح بالکل مفقود ہو گئی۔

اس زمانہ کے بعض اہم خصوصیات

امیر شام معاویہ اگرچہ صحابہ رسول میں محسوب کئے جاتے ہیں مگر ان کی حکومت کے یہ افسوسناک خصوصیات ہیں جو ہر اسلامی تاریخ میں جلی حروف میں نمایاں نظر آتے ہیں جن سے اسلام کے ضعف و کس مپرسی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

(۱) جھوٹ اور حضرت رسول پر افترا پوری آزادی کیساتھ عمل میں لایا جانے لگا بلکہ حکومت وقت کیطرف سے اس پر جائزہ و انعام دیا جاتا تھا جیسا کہ ابوالحسن مدائنی نے کتاب الاحداث میں لکھا ہے کہ معاویہ نے تمام عمال کو لکھا کہ جو شخص حضرت عثمان کی فضیلت میں کسی حدیث کو بیان کرے اسکا پورا نام معہ پتہ کے میرے پاس لکھ بھیجو اور پوری طرح جائزہ و انعام سے مالا مال کر دو اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ فضیلت عثمان میں بہت سی احادیث پیدا ہو گئیں پھر تمام گورنروں کو لکھا کہ عثمان کی فضیلت میں احادیث کا بہت کافی ذخیرہ جمع ہو گیا ہے اب تم دیگر صحابہ کے بارے میں روایات احادیث کیطرف لوگوں کو دعوت دو اور جو کوئی فضیلت بھی ابوتراب کی نسبت احادیث میں وارد ہوئی ہے اسکے مقابل دوسرے صحابہ کیلئے بھی بیان کرو تاکہ علی اور انکے شیعوں کی دلیل کے باطل کرنے کا سبب زیادہ ذریعہ ہیں۔ یہ فرمان لوگوں کے سامنے پڑھا گیا اور بکثرت حدیثیں صحابہ کرام کے مناقب میں بیان کی جانے لگیں جن کی کوئی اصلیت نہ تھی معلمین مکتب بچوں کو منبر پر پڑھتے اور معلمین بچوں کو قرآن کیطرح حفظ کراتے تھے بلکہ لڑکیوں عورتوں اور غلام و ملازم تک کو یاد کراتے تھے۔

اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سچی اسلامی روایات بھی ان بے حقیقت اخبار کے ساتھ مخلوط

ہو کر بے اعتبار ہو گئے اور علمی تحقیق و تدقیق میں ایک بہت بڑا رخنہ پڑ گیا۔

(۸) سب و شتم اور اکابر اہل اسلام کو گالیاں دینے کا دستور نکلا۔ دمشق و شام کے منبروں پر چالیس برس تک یہ منحوس رسم ادا ہوتی رہی بلکہ سنت بنا لی گئی۔ ابو عثمان جاحظ نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے معاویہ سے کہا کہ امیر آپ نے اپنے مقصود کو حاصل کر لیا خدا کیلئے اب اس شخص (علی بن ابی طالب) کی جان چھوڑ دیجئے۔ معاویہ نے کہا۔ اگر ہرگز نہیں یہاں تک کہ اسی پر کمسن بچے تربیت پا جائیں اور سن رسیدہ لوگ ختم ہو جائیں اور کسی شخص کی زبان پر فضیلت علی کی رہ نہ سکے۔

سلطنت کی یہ کوششیں تھیں مگر خدا کی شان جس کو وہ عزت دینا چاہے اس کو کوئی ذلیل نہیں کر سکتا اور جس کو وہ ذلیل کرے اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا۔ اسلامی تصانیف کی ورق گردانی کیجئے کوئی باب ایسا نہ ملے گا جس میں علی کے فضائل کا دریا موجزن نہ ہو۔ کچھ چراغے را کہ ایزد برفروزد

(۹) بلاد اسلامیہ میں شراب سب آزادی کیساتھ استعمال کی جانے لگی اور اس کی خرید و فروخت میں کوئی روک ٹوک باقی نہیں رہی چنانچہ عبدالرحمن بن سہل انصاری (صحابی رسول) نے شراب کے بارے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھا تو اپنے نیزہ کی نوک سے ان مشکوں کو چاک کر ڈالا معاویہ کو خبر معلوم ہوئی تو کہا اس بڈھے کو چھوڑ دو اس کی عقل جاتی رہی ہے عبدالرحمن نے سنا تو کہا کہ خدا کی قسم میری عقل نہیں گئی ہے مگر رسالتمآب نے منع فرمایا ہے اس سے کہ شراب ہمارے شکم میں داخل ہو یا مشکوں میں رکھی جائے اس واقعہ کو علامہ ابن حجر نے لکھا ہے (دیکھو اسد الغابہ مطبوعہ مصر جلد ثالث ص[illegible] نیز اصابہ ابن حجر جلد ۲ ص[illegible])

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شراب کی روک تھام مسلمانوں میں افراد سے ہو گئی تھی اور اگر کوئی سچا مسلمان تعرض کرنا چاہتا تو اسے دیوانہ اور بے عقل کا خطاب دیا جاتا تھا

(۱۰) بیگناہ مسلمانوں کا خون بیدردی سے بہایا جانے لگا۔ سینکڑوں ہزاروں

کی گئی میں ہزاروں جانیں گئیں۔ سمرہ بن جندب اور بسر بن ابی ارطاۃ اور زیاد بن ابیہ کی سفاکیاں
اسی عہد کا کارنامہ ہیں عبیداللہ بن عباس کے دو کمسن بچے ماں کی گود میں ذبح کر دیئے
گئے جس کی وجہ سے وہ مجنون ہو گئیں (ملاحظہ ہو استیعاب مطبوعہ حیدرآباد جلد اول ص ۱۳۶)
الناس علی دین ملوکہم حکومت جس رنگ پہ ہوگی زمانہ کا رخ اسی طرف پلٹ جائیگا
خصوصاً وہ زمانہ جبکہ بدوی عربوں کے دلوں میں اسلام کے نقش تازہ بیٹھے ہوئے تھے پرانی
عادتیں جاہلیت کی بو ابھی تک ناخنوں میں باقی ہوئی تھی وہ منتظر رہتے تھے کہ کسی طرح پا
شریعت اور اسلامی قوانین کا جوا گردن پر سے اتر جائے سلطنت کی نظر میں خود دیانت امانت
کا کوئی پاس و لحاظ نہ تھا کھلم کھلا شریعت کی مخالفت اور اسلام فروشی کا طرۂ امتیاز تھا
مثال تصدیق کیلئے دیکھئے استیعاب ابن عبدالبر حالات حارث ہاشمی اور جاریہ بن قدامہ اور احنف
بن قیس تینوں شخص جنگ میں گئے وقت معاویہ کے پاس اگر شکایت کی کہ آپ نے ان دونوں شخصوں
کو میرے اوپر ترجیح دی اور ان کا مرتبہ بڑھایا حالانکہ یہ تمہارے مخالف تھے معاویہ نے جواب دیا میں نے
ان کا منصب محض دل لینے کی خاطر سے بڑھایا ہے تم بھی میرا منصب سمجھ لیجئے (استیعاب جلد اول ص ۱۰۵)
ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم ان مورخین کے اقوال کی تکذیب کریں یا وجود یکہ امیر معاویہ سے حسن
عقیدت رکھتے ہوئے ایسے احادیث وضع کریگا کوئی باعث نہیں یا ان واقعات کو تسلیم کر لیں تو
ایسی مظاہرہ توہین اسلام کی توقع ایک فاسق و فاجر معمولی شخص سے بھی نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ
ایک مدعی خلافت بڑے شخص سے مگر کار ہمیں بیت ایسے اتفاقات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں

دربار شام کا ایک حیرت انگیز واقعہ

اسلام کا مشہور و معروف مسلم الثبوت مورخ طبری اپنی تاریخ میں سنہ ۳۲ھ کے واقعات
لکھتے ہوئے رقمطراز ہے کہ عمرو بن عاص اہل مصر کے ایک گروہ کو لیکر معاویہ کی ملاقات کو گئے
اس زمانہ میں عمرو بن عاص معاویہ سے کچھ برسر مخالفت تھے انہوں نے ان لوگوں کو سکھلا دیا
کہ تم معاویہ کے پاس جانا تو اس کی توہین کرنا اور خلیفہ کہہ کر سلام نہ کرنا معاویہ کو حیا

لوگوں کو خبر معلوم ہوئی تو وہ عمرو بن عاص کی سازش کو تاڑ گئے اور وہاں سے بھاگ نکلے مگر عمرو بن عاص نے شاید ان لوگوں کی نظر میں میرے مرتبہ کو سبک کر دیا ہے تم ان لوگوں کیساتھ جتنی سختی و تشدد کر سکتے ہو وہ کرنا تاکہ یہ لوگ پھر اس راہ کی چلیں خلاصہ یہ ہے دوسروں نے بھی اسکی اطاعت کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص دربار میں معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوا اسنے کہا السلام علیک یا رسول اللہ اور بقیہ لوگوں نے بھی اسکی پیروی کی (تاریخ طبری ص۲۰۱) یہ واقعہ جب ہماری نظر سے گزرا تو حیرت و تعجب کی انتہا نہ رہی شام کے اسلامی دربار میں خلیفہ وقت کو رسول اللہ کہہ کر سلام کیا جائے اور ان لوگوں کو سزا و سرزنش بھی نہ کی جائے اس سے ضمیر کا پتہ صاف چلتا ہے اور حقیقی منصب نبوت بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے خود حاکم وقت کہلانے والے دمشق کے بھرے ہوئے دربار میں کسی ایک شخص کا بھی اس واقعہ پر تحسین ہونا تاریخ میں نظر نہیں آتا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسوقت اسلامی جذبات کس حد تک فنا ہو چکے تھے اور ایمان کی اہمیت کا چراغ کس درجہ تاریک ہو گیا تھا۔

بہر حال معاویہ کا زمانہ کسی نہ کسی طرح بسر ہو گیا اور انہوں نے اپنی عمر گزار دی مگر وہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کے ایسے پہاڑ توڑ کر گئے جنسے اسلام کے نظم کو بالکل درہم برہم کر دیا یزید کے اخلاق و عادات سے امیر معاویہ واقف تھے یہ کسی شک میں آنے کی بات ہے تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود یزید کے خصوصیات سے واقف تھے اور اسکا اظہار بھی کیا ہے علامہ ابن حجر مکی تطہیر الجنان واللسان میں جو معاویہ کے مناقب فضائل میں تصنیف کی ہے لکھتے ہیں کہ ایک روز امیر معاویہ بیٹھے تھے یکبارگی رونے لگے مروان نے کہا کیوں کیا ہوا؟ آپکے رونے کا سبب؟ جواب دیا کہ دنیا میں کونسی دولت تھی جو میں نے نہ پائی ہو اب سن زیادہ ہو گیا ہڈیاں گھل گئیں جسم کمزور ہو گیا لیکن اگر مجھے یزید کی محبت کا غلبہ نہ ہوتا تو میں حق

لئے براہ راست کو حاصل کر لیتا (حاشیہ صواعق محرقہ صفحہ ۱۳۲) دوسرے مقام پر
علامہ مذکور لکھتے ہیں معاویہ نے پورے طور پر اقرار کیا کہ یزید کی محبت نے ان کو
عاقبت کے دیکھنے سے اندھا کر دیا ہے اور اسی فرط محبت نے مسلمانوں کو ان کے
بعد ایسے فاسق و فاجر کیساتھ مبتلا کر دیا جس نے ان کو ہلاک کر دیا (حاشیہ صواعق صفحہ ۱۳۴)
اسکے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ امیر معاویہ یزید کے افعال و عادات سے بے خبر تھے
اور اس کی ولی عہدی نیک نیتی پر مبنی تھی۔ یزید کی بیعت مسلمانوں سے زبردستی لی گئی
اور زر و جواہر کے خزانے اسی کے لئے وقف کر دئیے گئے۔ یزید تخت خلافت پر
متمکن ہوا اور اس کے فسق و فجور نے دنیا کو پُر کر دیا ہر طرف معصیت خدا اور
مخالفت شریعت کا بازار گرم ہوا۔ مذہب بازیچہ اطفال اور اسلام زینت طاق
نسیاں ہو گیا یزید کے اخلاق و عادات کے تفصیلی تذکرہ سے ان صفحات کو ملوث نہیں
کیا جا سکتا نہ اسکی ضرورت ہے کہ اس پر روشنی ڈالی جائے اسلام کی مستند تاریخیں امانت
داری کے فرض کو ادا کرتے ہوئے ان واقعات کو اپنے اندر محفوظ کئے ہوئے ہیں۔
واقدی نے مختصر الفاظ میں جس طرح یزید کی بدکرداری کی تصویر کھینچی ہے اسے
یہاں اقتباس کیا جاتا ہے۔ حنظلہ غسیل الملائکہ (صحابی رسول) کے فرزند عبد اللہ بن
حنظلہ کہتے ہیں کہ خدا کی قسم یزید ایسا شخص تھا جو اپنے باپ کی بیویوں (اپنی ماں
سے) اور اپنی بہنوں بیٹیوں سے نکاح کرتا تھا۔ شراب پیتا تھا۔ اور نماز کو ترک
کرتا تھا۔" اس روایت کو علامہ ابن حجر نے صواعق محرقہ صفحہ ۱۳۲ میں بھی لکھا ہے
کیا اسلامی بادشاہ اور مجوسی میں کوئی فرق ہوا؟ انتہائی فاسق و فاجر بھی اپنی
ماں۔ بہنوں۔ بیٹیوں پر تصرف عصمت و عزت بلکہ انسانیت کیخلاف سمجھتا ہے
بادشاہ وقت کی ان عادات و اخلاق کو دیکھ کر دنیا نے رنگ بدل لیا تھا اور
اسلامیت بالکل فنا ہو گئی۔ لطف یہ ہے کہ بڑے بڑے صحابہ سر تسلیم خم کئے ہوئے تھے
کسی کے دل میں صدائے احتجاج بھی بلند نہ ہوتی تھی۔ عبد اللہ بن عمر ایسے صحابی

رسول اور خلیفہ ماننے جیسے ہی حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام
کی بیعت مرتے دم تک نہیں کی تھی۔ ان لوگوں نے یزید کے ہاتھ پر خوشی بیعت کر لی تھی
(فتح الباری حافظ ابن حجر عسقلانی جلد ۲ صفحہ [illegible]) سوائے تین شخصوں کے
تمام صحابہ و تابعین یزید کو خلیفہ تسلیم کر چکے تھے وہ تین شخص حسین بن علی
علیہ السلام، عبداللہ بن زبیر اور عبدالرحمن بن ابی بکر تھے۔ یزید کی طرف سے کوشش
شروع ہوئی کہ ان کو بھی پابند بنایا جائے اور سب سے زیادہ امام حسین علیہ
السلام کے حلقہ بیعت میں داخل ہونے کے لئے اہتمام کیا گیا۔ اگر تاریخ اور
اسلام کی موجودہ حالت کو دیکھیے جسے ہر بالبصیرت سمجھ سکتا ہے کہ علی بن ابیطالب
کا فرزند اور رسول کا نواسہ ان کا سب سے بڑا شخص۔ اگر ان حالات کی موجودگی میں
یزید کی بیعت کرتے تو کیا اسلام کا نام بھی دنیا میں باقی رہ سکتا تھا؟ اسی لئے امام حسین
کی غیرت و حمیت اور اصلاحیت کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ وہ اپنی آنکھوں سے
رسول کے دین کو برباد ہوتے ہوئے دیکھیں اور سکوت کریں۔ حسین کا فرض عمل کتنے
گہرے تدبر پر مبنی تھا اس کی تفصیل کے لئے ایک مستقل مضمون درکار ہے تاہم اور
تاریخی اسباب و شواہد سے یہ ہم فرض کر لیں کہ حسین نے خود اپنی جان کو
معرض خطر میں ڈالا۔ اگر مدینہ میں قیام کرتے اور یزید کی بیعت پر عمل نہ ہوتے
تو کیا خون کربلا کی زمین پر نہ بہتا؟ حقیقت شناس افراد اس خیال کی
تصدیق نہیں کر سکتے۔ بنی امیہ کی عداوت بنی ہاشم اور خصوصاً علی بن ابی طالب
کی اولاد سے اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ وہ کسی طرح ان کو جیتے جی نہیں دیکھ سکتے
تھے اور ان کی ظاہری ہستی بھی ان کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتی تھی۔ حسن جیسے
ایسے صلح پسند جنہوں نے مسلمانوں کی جان بچانے کے لئے دنیاوی سلطنت کو ٹھکرا
دیا اور جن کے خلق عظیم و حلم کا دشمنوں تک کو اعتراف تھا، باوجود سلطنت
سے کنارہ کش ہونے کے اپنی زندگی کو دشمنوں سے محفوظ نہ رکھ سکے۔ امام حسن نے

جسطرح معاویہ کے افعال سے درگذر کیا اور فتنہ وفساد کو خاموش کیا اسکا بدلہ ان کیطرف سے کیونکر ملا؟ اسکا جواب تمام انصاف پسند با اطلاع مصنفین کی کتابوں سے مل سکتا ہے خواجہ حسن نظامی صاحب اپنی کتاب محرم نامہ ص اور دوسری کتاب یزید نامہ ص میں لکھتے ہیں۔

یہ خون سیدنا حضرت امام حسنؑ کا ہے جو تاریخ کی روایت سے قطعاً امیر معاویہ کے اوپر ثابت ہے اور کوئی قدیم وجدید عدالت تاریخی وقانونی ان کی بریت اس قتل سے نہیں کر سکتا۔

کون کہہ سکتا ہے کہ اگر حضرت امام حسین علیہ السلام عراق میں نہ آتے اور مدینہ میں قیام فرماتے تو ان کے قتل کیلئے کوئی ایسا ہی خاموش حربہ استعمال نہ کر دیا جاتا جسطرح امام حسنؑ پر استعمال کیا گیا، اس صورت میں علاوہ اس بات کے کہ امام حسینؑ کی جان جاتی عالم پر حقیقت کے آشکار ہونے کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جسطرح حضرت امام حسنؑ کی وفات کیسطرح طرح ... منافقین اپنے اصل واقعہ کو پردہ اخفا کے نیچے ... حرب سید الشہداء کی شہادت کا ایک مشتبہ صورت میں ہوتی۔ وہ صاف سادہ صحابۂ رسولؐ یا امام حسینؑ کے ہمدرد جو آپ کو کربلا جانے سے روک رہے تھے اور کہتے تھے کہ جوار رسول میں قیام کیجئے اس نکتہ پر متوجہ نہ تھے اس کو سید الشہداء کیطرف سے یہی جواب ملتا تھا کہ یہ لوگ مجھ کو نہیں چھوڑیں گے نہیں اور واقعہ بھی یہی تھا سید الشہداء جو کچھ ہونیوالا تھا اس سے باخبر تھے اور آپ نے یہ خیال کر کے کہ جان جائے تو اسلام کو نفع کیے جائے اس سفر کو اختیار کیا نتائج کربلا کے واقعہ نے یزید کے کفر و الحاد کو طشت از بام کر دیا اور رسول اسلام کے نواسہ کے قتل نے عالم کی آنکھیں کھولدیں کربلا میں مظالم کا خاتمہ ہوا ایک طرف شام و کوفہ کے لشکر کی بے رحمی، وحشت اور ننگ انسانیت افعال دوسری طرف حسین بن علی اور انکے عزیزوں پر نثار کر دینے کے قابل رفقا کا صبر و حلم تحمل تھا

قدم وفاداری اسنے دنیا کے سامنے حق و باطل کو علیحدہ کرکے پیش کر دیا حقانیت
و باطل کے وہ گہرے پردے جو آنکھوں پر پڑے ہوئے تھے ایک مرتبہ اٹھ گئے اور
حقیقت کا چہرہ صاف نظر آنے لگا شام اور اسکے اطراف کے عرب جس فضا میں پلے
بڑھے ہوئے تھے اسکا نتیجہ یہ تھا کہ رسول و آل رسول کے نام سے بھی واقف نہ تھے
وہ سمجھتے تھے وہ بنی امیہ کے جابر بادشاہوں کو انہی نے کوشش کر کے اہلبیت رسول
کا نام چھپایا جاتا تھا ان کے سامنے حقیقت کے واضح ہونیکا کوئی ذریعہ نہ تھا صرف
اسلئے جو حسین نے اختیار کیا اور کربلا میں عورتوں اور بچوں کو اپنے ساتھ لے گئے اس
میں فلسفہ یہی تھا اگر تنہا سید الشہداء کربلا میں قتل کر دئے جاتے تو حقیقت
کی وہ تبلیغ جو بصورت موجودہ ہوئی نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اہلبیت رسول کی
اسیری اور انکے ہر کوچہ و بازار میں پھرائے جانے اور راستے میں ان کے صبر و ضبط
جلال عصمت و طہارت اور جابجا معارف و حقائق سے مملو خطبوں نے ہر ایک
عالم کو حسین مظلوم کا مرثیہ خوان بنا دیا اور حقائق اسلام پر ایک عالمگیر
روشنی ڈال دی۔

اے حسین ابن علی میرا سلام آپ پر جو آپنے آخر دم تک فرض شناسی اور
سکون و تحمل کو ہاتھ سے نہیں دیا آپنے جان و مال، بیوی، بچے ہر چیز کو اسلام پر
فدا کر دیا۔ آپنے اپنے نانا کی شریعت سے کسی چیز کو عزیز نہیں کیا۔
آپنے دنیا کو توحید حقیقی کا نہ بھولنے والا سبق یاد دلایا، آپ خود وقتی
طور پر مٹ گئے مگر اسلام کو زندہ کر گئے آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی زمین پر
گرا وہ تھا شریعت میں ایک روح پھونکتا جاتا تھا۔ مذہب آپ کا رہین منت
ہے۔ اور اسلام آپ کے احسان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا خدا آپکے
سامنے ہماری طرف سے تحیۃ و درود کے تحفے پیش کرے۔
یا لیتنا معک فنفوز فوزا عظیما۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خلافتِ یزید کے متعلق آزاد رائیں

ضمیر کی آوازیں

طبری نے لکھا ہے :-

حدثني الحارث قال حدثنا علي عن مسلمة قال فلما اراد معاوية ان يبايع ليزيد كتب الى زياد يستشيره فبعث زياد الى عبيد بن كعب النميري فقال ان لكل مستشير ثقة ولكل سر مستودع وان الناس قد ابدعت بهم خصلتان اذاعة السر واخراج النصيحة الى غير اهلها وليس موضع السر الا

مجھ سے حارث نے بیان کیا کہ مجھ سے علی نے مسلمہ کی زبانی نقل کیا، ان کا بیان ہے کہ جب معاویہ نے یزید کی بیعت کرانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے ایک خط لکھ کر زیاد سے مشورہ طلب کیا۔ زیاد نے عبید بن کعب نمیری کو اپنے پاس بلایا اور کہا ہر مشورہ طلب کرنے والا ایک شخص قابل اعتماد ہوتا ہے اور ہر راز کے امانت رکھے جانے کا ایک محل ہوتا ہے اور لوگوں کی تباہی کا باعث دو چیزیں ہوتی ہیں ایک راز کا افشا کرنا اور دوسرے نصیحت کا نااہل کے

احد رجلين رجل اخرة
يرجو ثوابا و رجل
دنيا له شرف في نفسه
وعقل بعيون حسبه و
قد جمعتهما منك
فاحمدت الذي قبلك
لقد دعوتك لامر اتهمت
عليه لطون . لصحت
ان امير المؤمنين
كتب الي يزعم انه قد عزم
على بيعة يزيد وهو
يخاف نفرة الناس ويرجو
مطابقتهم ويستشيرني
وعلاقة امر الاسلام
وضمانه عظيم ويزيد
صاحب رسلة وتهاون
مع ما قد اولع به
من الصيد ذا لق
امير المؤمنين
موديا عني فخبره
عن فعلات يزيد
فقل له رويدك

سامنے پیش کرنا ۔ اور راز کی حفاظت کے
لائق دو ہی طرح کے شخص ہو سکتے ہیں ایک
آخرت کا لحاظ رکھنے والا جو ثواب کا امیدوار
ہو اور ایک وہ دنیادار آدمی جو عزت و وقار
رکھنے کے ساتھ اپنے عقل و ہوش کا مالک
ہو جس سے اپنے شرف و وقار کو محفوظ رکھتا
ہو اور میں نے تمہاری ان دونوں حیثیتوں
سے جانچ کی ہے اور تمہیں اس معیار پر
پورا پایا ہے اور میں نے تمہیں ایک ایسے
اہم معاملہ کے لیے بلایا ہے جس پر تحفظ
پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا ۔ وہ یہ ہے
کہ خلیفہ وقت کا میرے پاس خط آیا
ہے جس میں ظاہر کیا ہے کہ وہ یزید کی
بیعت حاصل کرنے کا ارادہ کرتے
ہیں اور ان میں انہیں لوگوں کے متنفر
ہونے کا اندیشہ ہے اور یہ خیال ہے
کہ وہ کسی طرح انہیں اپنے موافق
بنائیں اور اس بارے میں وہ
مجھ سے مشورہ طلب کرتے ہیں
حقیقت امر یہ ہے کہ اسلام کا
معاملہ اور اس کی ذمہ داری
کا سوال بہت اہم ہے اور

بالامر فانتم من ان
يستمر لك ما تريد
ولا تعجل فان دركا
في تاخير خير
من تعجيل ما تبتغيه
الفوت فقال عبيد
له انلا غير هذا
قال ما هو قال لا
تفسد على معاوية
رأيه ولا تمقت اليه
ابنه والقى انا يزيد
سرا من معاوية
فاخبره عنك
ان امير المومنين
كتب اليك يستشيرك
في بيعة وانك تخوف
خلاف الناس لهنات
ينقمونها عليه و
انك ترى له ترك
ما ينقم عليه فيستحكم
لامير المومنين
الحجة على الناس

یزید میں جو مطلق العنانی اور
لاپروائی ہے وہ ظاہر ہے، اس
کے علاوہ شکار کے ساتھ انہیں
غیر معمولی شغف ہے۔ لہٰذا تم
جا کر خلیفہ کی خدمت میں میرے
خیالات کی ترجمانی کرو، اور
انہیں یزید کے افعال و اعمال
کی اطلاع دو اور کہو کر تھوڑی
تاخیر سے کام لیجیے تو بہت
ممکن ہے کہ آپ کا مقصد بہتر
طریقہ پر انجام پا جائے اور
جلدی نہ کیجیے، اس لیے کہ دیر
کرنے سے تھوڑا نقصان بہتر ہے
اس تعجیل سے جس کا نتیجہ یہ
ہو کہ مقصد بالکل فوت ہو
جائے۔ عبید نے کہا، اس
کے سوا ایک دوسری صورت
اختیار نہ کی جائے؟ زیاد نے
کہا، وہ کیا؟ کہا بہتر ہے کہ
معاویہ کی رائے کو غلط نہ
ٹھہرائیے اور انہیں ان کے
صاحبزادہ سے متنفر نہ بنائیے

ويسهل الله ما يزيد	اور میں معاویہ کی اطلاع میں
فتكون قد نصحت	یزید سے جا کر ملوں اور انہیں
يزيد وقد رضيت	آپ کی طرف سے اس کی
امير المومنين وسلمت	اطلاع پہنچا دوں کہ خلیفۃ المسلمین
مما تخاف من	نے ان کی بیعت کے لیے
علاقة امر الامة	آپ سے مشورہ طلب کیا ہے
فقال زياد لقد	اور آپ کو ان سے کچھ ناگفتہ بہ
رميت الامر بحجرة	حرکات کی وجہ سے جنہیں ناپسند
اشخص على بركة	کیا جاتا ہے عوام کی ناراضگی
الله فان اصبت	کا اندیشہ ہے۔ لہذا آپ کی
فما لا ينكر وان	رائے یہ ہے کہ وہ ان ناپسندیدہ
يكن خطاء فغير	باتوں کو ترک کر دیں تاکہ اس
مستغش وابعدك الله	ذریعہ سے اعلیٰ حضرت ان کی
ان يشاء الله من	بیعت لوگوں سے لینے میں کوئی
الخطاء قال نقول	کمزوری نہ محسوس کریں، اور
بما ترى ويقضى الله	آپ کے لیے بھی اس مہم میں
لغيب ما يعلم فقدم	آسانی ہو۔ اگر یہ کیا جائے
على يزيد فذاكره	تو آپ کی بہ بدرجہ خیر خواہی
ذلك وكتب زياد	کا مظاہرہ بھی ہوگا اور اعلیٰ حضرت
الى معاوية يامره	کے لیے بھی باعث خوشنودی
بالتؤدة وان لا يعجل	ہوگا اور آپ کو مسلمانوں کے
فقبل ذلك معاوية	مفاد کے لحاظ سے جو خطرہ ہے

وكمن يزيد عن كثير مما عاب ان يصنع ثم قدم عبيد على زياد فاقطعه قطيعة (تاریخ طبری جلد ۴ صفحہ ۱۲۴)

اس سے بھی محفوظ رہیں گے زیاد نے کہا وہ تو میں سمجھ لیا تمہارا انتخاب ہی بہت عمدہ کیا تھا، ٹھیک ہے بسم اللہ، روانہ ہو جاؤ۔ اگر تمہارا عمل صحیح ہی تو وہ توقع کے بالکل مطابق ہوگا، اور اگر غلطی بھی ہوئی تو تمہاری خیر خواہی اور نیک نیتی بہرحال مشیر سے بالاتر ہے اور امید یہی ہے کہ تم غلطی کوئی نہ کروگے۔ کہا خیر یہ آپ کا حسن ظن ہے۔ اور اصل واقعہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ اور وہ اس کے مطابق فیصلہ کرے گا۔ چنانچہ وہ شخص یزید کے پاس گیا اور یہ سب تذکرہ کیا اور زیاد نے معاویہ کو خط لکھا جس میں ان کو تھوڑے توقف کا مشورہ دیا۔ چنانچہ معاویہ نے یہ مشورہ قبول کیا اور یزید نے بہت سے ان کاموں کو جن کا وہ مرتکب تھا ترک کر دیا۔ پھر عبید زیاد کے پاس آیا تو انھوں نے انعام میں اسے ایک جاگیر عطا کی۔

طبری نے اس واقعہ کا ذکر سنہ ۵۶ھ کے واقعات کے تذکرہ میں اس مناسبت سے کیا ہے کہ اس سال معاویہ نے یزید کی ولی عہدی کا اعلان کیا۔ لہٰذا انھوں نے اس کے ذیل میں پہلے یہ عنوان قائم کیا کہ ذکر السبب فی ذالک اس کے اسباب کیا ہوئے، چنانچہ ان اسباب کے ذکر میں

پہلے تو مغیرہ کا معاویہ کو یہ خیال پیدا کرنا درج کیا ہے اس کے بعد زیاد سے مشورہ طلب کرنے اور اس کے نتیجہ کا تذکرہ کیا ہے جو ابھی بیان ہوا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مغیرہ کی وہ تحریک اور زیاد سے یہ خط و کتابت سنہ ۵۶ھ میں ہوئی ہو۔ کیونکہ زیاد کی تو سنہ ۵۳ھ میں موت ہو گئی تھی، جیسا کہ دینوری اور طبری دونوں نے تصریح کی ہے اور مغیرہ کی موت اس کے پہلے سنہ ۴۹ھ یا سنہ ۵۰ھ میں ہو گئی تھی۔

مذکورہ بالا واقعہ پر غور کیجیے تو حسب ذیل نتائج آسانی سے برآمد ہوں گے :-

۱- یزید کے قابلِ اعتراض افعال و اعمال اور مسلمانوں میں ان کے متعلق غم و غصہ کے جذبات کا اس کے باپ امیر شام معاویہ کو بخوبی علم تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ زیاد ایسے اپنے ہوا خواہوں سے مشورہ لیتے وقت یہ نہ لکھتے کہ مجھے لوگوں کی نفرت کا خوف ہے۔

۲- اسلام کے وقار اور مسلمانوں کے مفاد کا خیال خود امیر شام کو اتنا بھی نہ تھا جتنا کہ ان کے گورنر زیاد نے اصلی یا نمائشی طور پر ظاہر کیا۔ اس لیے کہ زیاد نے عبید نمیری سے اپنی گفتگو میں علاوہ سیاسی پہلو کے علاقہ امر الاسلام و ضمانہ عظیم کہہ کر ایک مجمل دینی احساس کا پتہ دیا ہے۔ مگر امیر شام کے خط کا جو مضمون بیان کیا ہے اس میں قطعاً اس طرح

کے کسی احساس کا نام و نشان تک نہیں ہے، بلکہ صرف مسلمانوں میں ہیجان کا اندیشہ ظاہر کیا ہے اور یہ کہ ان کو کسی طرح اس پر تیار کیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ امیر شام یزید کو ولی عہد بنانے کے شوق میں ہیئتِ حداس کے نتیجہ کے تصور سے بالکل بے نیاز ہو رہے تھے۔ اور انہیں خوفِ خلائق کے سوا خالق کی ذرہ بھر پروا نہ تھی۔

۳۔ زیاد اور زبیر عبید ذیری نے یزید کے افعال و اعمال کی طرف جن الفاظ میں اشارے کیے ہیں وہ اگرچہ سیاسی معیار پر بہت محتاط انداز میں ہیں، اور یوں سمجھنا چاہیے کہ وہ بہت گھٹا کر ہیں مگر اس اجمال سے ان تمام تفصیلات کی تصدیق ہوتی ہے جو یزید کے متعلق دوسرے لوگوں نے صاف بتائے ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن حنظلہ غسیل الملائکہ نے یزید کی سیرت ان الفاظ میں بیان کی تھی۔ انہ رجل ینکح امہات الاولاد والبنات والاخوات ویشرب الخمر ویدع الصلوٰۃ۔ "وہ ایسا شخص ہے جو باپ کی عورتوں اور اپنی بیٹیوں، بہنوں تک کو نہیں چھوڑتا شراب پیتا، اور نماز ترک کرتا ہے۔"

(صواعق محرقہ، مطبوعہ مصر صفحہ ۱۳۲)

زیاد نے یزید کے اوصاف کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ صاحب رسلۃ و تہاون مع ماقد

اولیع جبة من الصید۔ اس میں "عشق شکار" کا تو نام لے کر اظہار کر دیا ہے، جو بجھنا چاہیے کہ اس کے جرائم میں سب سے ہلکا تھا جب ہی نام لے کر اس کے کہہ دینے کی ہمت ہوئی۔ اس کے علاوہ باقی باتوں کو "رسلة وتهاون" کے دو الفاظ میں ملفوف کیا گیا ہے لغوی معنی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو "رسلة" کا مفہوم اردو کے ان الفاظ سے ادا ہوتا ہے:۔

چھٹا ہونا، بے قید ہونا، بے لگام ہونا، مطلق العنان ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اور دوسرا لفظ "تهاون" کے معنی سستی، سہل انگاری، لاپروائی وغیرہ الفاظ سے ادا ہوتے ہیں۔ پہلا جزو "چھٹا ہونا، بے قید ہونا، بے لگام ہونا" یہ محرمات کے فعل (مثلاً نکح امہات الاولاد والبنات والاخوات ولیشرب الخمر) پر منطبق ہے۔ اور دوسرا "سستی اور لاپروائی" ترکِ واجبات (یدع الصلوٰۃ) پر صادق ہے۔

عجیب کے الفاظ باوجود مزید اختصار اس سے زیادہ معنی خیز ہیں۔

"لهنات ينعمونها عليه"۔ هَنٌ لغتِ عرب میں شرمناک، ناقابلِ اظہار چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ اصلی معنی اس کے اس طرح ہیں۔

هن المرأة فرجها وهما هنان وهنانان جمع هنات وهنوات (قاموس) اسی لیے اردو زبان میں

اسس کا ہم نے "ناگفتہ بہ حرکات" کے ساتھ ترجمہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے صرف "شوق شکار" مراد نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ تو ان چیزوں کے مقابلہ میں اتنی سبک بات ہے کہ اس کا اظہار صراحتہً کیا جا سکتا۔ پھر اس میں جنسی تعلقات میں بے راہ روی اور مطلق العنانی نیز شراب خواری کے ایسے افعال قبیحہ مضمر نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟

۴۔ زیاد نے خود اپنی جگہ خوف آخرت کا کچھ احساس ظاہر کرنے کے باوجود امیر شام کو یزید کے افعال کی طرف توجہ دلانے کے ساتھ اپنے پیغام میں انھیں نتیجۂ اخروی کی طرف متوجہ کرنے کا موقع نہیں دیکھا بلکہ صرف سیاسی پہلو کا ذکر کیا کہ جلد بازی کی وجہ سے مقصد کے فوت ہو جانے کا امکان ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ معاویہ کے اتباع خود بھی خلیفۃ المسلمین سے اس بارے میں بالکل مایوس تھے اور سمجھتے تھے، کہ اندیشۂ آخرت کو وہ کوئی اہمیت نہ دے رہے ہیں اور نہ دیں گے۔

۵۔ واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبید بن کعب نمیری باوجود تاریخ میں بہت حد تک گمنام ہونے کے زیاد سے زیادہ سیاست دان اور مزاج حکومت کا لحاظ رکھنے والا تھا۔ کہ زیاد نے ہمت کر کے معاویہ سے جو کچھ "حق گوئی" کے طور پر کہنا چاہا! اسے بھی اس نے روک دیا۔ ہاں چونکہ زیاد نے نمائشی کلمات اس کا اظہار کرنے

رہنے آنحضرت کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ اس لیے اس نے
بجائے خود ایسی تدبیر نکالی کہ یزید اور معاویہ دونوں
خوش بھی رہیں اور فریضۂ دینی کی تکمیل بھی ہو جائے۔
مگر اس کے لیے اس نے جو صورت اختیار کی وہ کیا
فریضہ سے سبکدوشی کے لیے کافی تھی؟ کیا عبید اور
خود زیاد دونوں کو نہیں معلوم تھا کہ صرف وقت کے سیاسی
اندیشوں کی بنا پر یزید نے اپنے میں جو تبدیلی کی ہو وہ
دیرپا نہیں ہو سکتی؟ کیا ابتدائے عمر سے پڑی ہوئی عادتیں
واقعی ترک ہو جاتیں جب کہ شاہزادۂ نامدار بلکہ خود اعلیحضرت
کو آخرت کی بازپرس اور دین کے فرائض کا احساس خود
ان کے علم میں قطعاً نہیں تھا تو فقط مسلمانوں کی زبان بندی
کے لیے جو ظاہری کچھ تغیر کیا گیا ہو اس میں اصلیت کیا ہو
سکتی تھی؟

یہ سب باتیں کیا زیاد اور عبید نہیں سمجھ سکتے تھے
ظاہر ہے کہ وہ اتنے بھولے نہ تھے۔ خوب سمجھتے تھے مگر انہیں
تو مسلمانوں کو بے وقوف بنانا تھا جو ان کی سیاست داخلی
کا تقاضا تھا۔ اور خود اپنے کو بھی بے وقوف بنانا تھا تاکہ
ان کی دینداری پر بظاہر کوئی حرف نہ آنے۔ مگر اس سبب
سے کیا وہ خدا کو بھی معاذ اللہ بے وقوف بنا سکتے تھے؟
لا حول ولا قوۃ۔ یخادعون اللہ والذین امنوا
وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔

تاریخ اسلام میں واقعۂ کربلا کی اہمیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاریخ اسلام کی ابتدا کب سے ہوتی ہے؟ مذہبی نقطۂ نظر سے تو اسلام اسی وقت سے شروع ہوتا ہے جبکہ دنیا وجود میں نہ آئی تھی اور آدم و نیز دیگر انبیاء و مرسلین اسلام ہی کا پیغام لے کر دنیا میں آئے، لیکن مذہبی معتقدات سے قطع نظر کرتے ہوئے خالص تاریخی حیثیت سے تاریخ اسلام کی ابتدا اس وقت سے ہوتی ہے، کہ جب سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث برسالت ہوئے۔

اس وقت کی حالت یہ تھی کہ دنیا کے مختلف ممالک میں چند مذہبوں کی تعلیم جاری تھی ان میں کسی میں بھی ہمہ گیر انسانی بلندی کا تخیل موجود نہ تھا۔ بلکہ یہ تعلیمات صرف ایک قوم، ایک ملک اور ایک زمانہ میں محدود تھے۔ ہندوستان ہی کو لیجئے یہاں جس طرح کی تعلیم رائج تھی۔ اس نے اپنے پیغام کو شودر کے حدود کا پابند بنا دیا تھا، وہ اپنے ماننے والوں کو شودر سے مخاطب کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتا تھا۔ تو اسے شودر بیچاروں کے اصلاح کی فکر کیا ہوتی۔

دوسرا بڑا مذہبی ادارہ عیسائیت کا تھا۔ اس کی تعلیم کا نقطۂ نگاہ جو موجودہ انجیل میں پایا جاتا ہے اس سے ظاہر ہے کہ وہ اللہ کو صرف بنی اسرائیل کا باپ قرار دیتا ہے مگر اللہ صرف اس کے ظاہر و کرم اور رحمت کی بنا پر باپ کے نام سے تعبیر کیا جاسکے تو اس کی رحمت کا حق دنیا کے سارے انسانوں کو پہنچنا چاہئے۔ مگر عیسائیت

کہ مذہبی تعلیم اس وسیع النظری سے خالی تھی۔

خود عرب کے لوگ اپنے مقابلہ میں دنیا کی کسی قوم کو حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے اپنا نام رکھا تھا "عرب" یعنی دل کی بات کو زبان سے ظاہر کر سکنے والے اور اپنے سوا دوسری قوموں کو کہتے تھے "عجم" یعنی گونگے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے سوا دیگر اقوام کی زبانوں کو انسانی زبان ماننے کیلئے تیار نہ تھے۔ بلکہ جیسے جانوروں کے منہ سے نکلتے ہیں، ویسی ہی دوسری قوموں کی بولیاں ہیں۔

ایسے ماحول میں حضرت محمد مصطفےٰ اسلام کا پیغام لیکر آئے جس کا خاص جوہر تھا "بین الاقوامیت" یعنی وہ صرف عربوں کیلئے نہیں بلکہ دنیا کی تمام قوموں کیلئے تھا۔ ابھی تک کسی نے اتنا بڑا دعویٰ نہیں کیا تھا۔ انہوں نے کل انسانوں کو اخوت اور مساوات کا سبق دیا ذات پات کے جھگڑوں کو دامن انسانیت سے دھو ڈالا۔ کل انسانوں پر یکساں فرض عائد کئے اور سب کے حقوق مساوی رکھے۔ آپ نے اعلان کر دیا "لا فخر لقرشی علیٰ غیر القرشی ولا للعربی علیٰ غیر العربی" کوئی فخر نہیں قرشی کو غیر قرشی پر اور نہ عربی کو غیر عربی پر۔ سب آدم کی اولاد ہیں (خلقکم من نفس واحدۃ) اللہ نے تم سب کو ایک نفس سے پیدا کیا ہے۔

یہ اب ہمیں آسان معلوم ہوتا ہے جبکہ ہمارے کان سنتے سنتے عادی ہو چکے ہیں لیکن جس زمانہ میں رسولؐ ان خیالات کو پھیلا رہے تھے اس وقت دنیا ان سے بالکل اجنبی تھی۔ اس وقت دنیا کی تمام قوموں میں باہم منافرت قائم کیا جاتا تھا۔ ایک ہی ملک و قوم کے دوسرے قبیلے کے افراد کو اپنے سامنے کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ اس ماحول کے اعتبار سے رسولؐ کا یہ اعلان ایک بڑی غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا۔ قول سے عمل کی شکل۔ رسولؐ نے زبانی ہی تعلیم نہ دی بلکہ ہر موقع پر خود عمل کر کے دکھا دیا۔ انہوں نے اپنے ہاتھوں سے دنیا کے سامنے ایک بین الاقوامی قوم کی تشکیل کر کے دکھا دی جس میں ایک طرف حمزہؓ و عثمانؓ جیسے قرشی تھے تو دوسری طرف ابوذر غفاریؓ اور مقداد کندیؓ

جیسے غیر قریشی اور عجمی سلمان فارسیؓ، بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ جیسے غیر عرب۔ اتنا ہی نہیں
بلکہ سلمان کو "سلمان منا اھل البیت" کہہ کے اعزازی طور پر اپنے خاندان کا شریک کر لیا۔ اور
بلال کو مؤذن کے عہدہ پر فائز کر کے یہ بھی بتا دیا کہ اگر کوئی شخص کسی بلند عہدہ و منصب کا اپنے
ایمان و عمل سے حقدار ہو تو اس میں رنگ، نسل، وطن وغیرہ کا فرق کسی طرح بھی حائل نہیں کیا جائے گا
حقیقی مصلح وہی ہے کہ جو ماحول کے خلاف مختلف طبقوں کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے
ہوئے ضروری اقدام عمل میں لائے

رسول اللہ کی جانب سے تمام دنیا کے سامنے ایک ایسی عظیم اصلاح کی پکار جس تک پہنچتے ہوئے
لامحالہ سطح پر پہنچا ہے اسی لئے انہوں نے تمام اقوام عالم کے سامنے ایسا انداز اختیار کیا جس میں
عقل و انصاف کی رو سے کسی کو بھی مخالفت قائم نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ تمام قدیم
پیشوایان مذاہب میں سے کسی کا تعین کرنے کیلئے کھڑے ہو جاتے کہ کون پیشوا حقیقت میں منجانب
اللہ بنا کر بھیجے گئے تھے اور کون نہیں تو اس سے ایک جنگ ان شخصیتوں کے بارے میں قائم ہو
جاتی جس کا کوئی بھی نتیجہ انسانی برادری کے مستقبل کے لحاظ سے مفید نہ تھا۔ اسی لئے انہوں نے اقوام
عالم کے گذشتہ پیشواؤں میں سے کسی کی نفی نہیں کی بلکہ قرآن میں کچھ کے نام کے ساتھ
یہ اعلان کر دیا کہ "رسلا قد قصصناھم علیک من قبل و رسلا لم نقصصھم علیک" یعنی کچھ
پیغمبروں کا ہم نے تمہارے سامنے ذکر کیا ہے اور بہت سے پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا ہے"۔ ہر ایک
مذہب کے قدیم پیشوا کیلئے یہ امکان باقی رہ گیا کہ وہ انہی ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں
میں ہو اور اسی طرح یہود کیلئے بھی جو صرف حضرت موسیٰ کی عظمت کے قائل رہ چکے ہیں ہوں،
عیسائیوں کیلئے موقع ہے کہ حضرت عیسیٰ کی عظمت بشریہ کے قائل ہوتے ہوئے اسلام کے دائرہ میں
داخل ہو جائیں اسی طرح پارسیوں کیلئے موقع حاصل ہے کہ زردشت کی عظمت کو ماننے کے
ساتھ، ہندوؤں کیلئے موقع ہے کہ اپنے سابق پیشواؤں کی عظمت کی فطری حدود میں رہتے
کے ساتھ ساتھ اسلام کے پیغام کو قبول کر لیں۔ اب ان سابق شخصیتوں کے احترام اور عدم احترام
کی کوئی بحث ہی باقی نہیں۔ جبکہ آئندہ کیلئے اصول سب کی طرف سے ایک تسلیم کر لیا جائے
اور وہ یہ ہے کہ جسے اسلام دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے۔

یہ سب عالمی طور پر ایک جماعت کو ایک مقصد پر جمع کرنے کا وہ طریقہ تھا جسے اسلام نے اختیار کیا

کا احساس ہی کا کمال حاصل کر چکے تھے۔ قرآن عربی زبان میں تھا۔ اس میں یہ پہلو تھا کہ
عرب قوم دوسری قوموں پر فوقیت کی دعویدار تھی اس سے ان کے لئے باعث فخر ہو سکتی تھی۔ مگر قرآن
نے اس پہلو کی تشریح کر کے عرب سے اس فخر کو ختم کر دیا۔ اس نے صاف لفظوں میں کہہ دیا!
ولو نزلناه على بعض الاعجمين فقرأه عليهم ما كانوا به مؤمنين یعنی قرآن کا عربی زبان
میں نازل ہونا صرف یہ ہے کہ عربوں میں جاہلانہ تنگ نظری یہی ہے کہ اگر یہ کسی
اور زبان میں نازل ہوتا تو یہ ایمان نہ لاتے۔ برخلاف دوسری قوموں کے یہ تنگ نظری
ان میں نہ تھی باوجود قرآن کے عربی ہونے کے ایمان لانے کیلئے تیار ہو سکتی تھیں اس سے
قرآن عربی زبان میں آ گیا۔ گویا قرآن کے اس ایک پہلو عرب کی فوقیت کا پیدا ہو سکتا تھا اسے
ختم کر دیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کی بین الاقوامیت کے یہ معنی نہ تھے کہ ایک
قوم یعنی عرب کا غلبہ تمام دوسری قوموں پر ہو جائے بلکہ اس کے یہ معنی تھے کہ عرب اور تمام دوسری
قومیں یکساں طور پر اسلام کے چند بنیادی نظریات مثلاً اصول اخلاق و عقائد کو قبول کر کے
ایک متحدہ قوم بن جائیں۔ اس طرح ان کے لئے کوئی چیز بیگانہ یا اجنبی نہ تھا بلکہ سب کو ساری
دنیا کو اپنے لئے تنگ نہ سمجھنا تھا۔ اس لئے کسی دوسری قوم کا دین اسلام قبول کر کے
کسی شکست یا پسپائی کا احساس نہیں کرتا تھا۔ بلکہ فخر محسوس کرتا تھا
اسلام کے ان تعلیمات میں جبر کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ (لا اکراہ
فی الدین) اگر تبلیغ مذہب کا صرف ایک ذریعہ تھا کہ اپنی حقانیت دلائل سے اور
اسوۂ حسنہ اور اچھے اصول کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیجئے کہ وہ اس سے متاثر
ہو کر اس کی خوبیوں کا قائل ہو کر اسے اختیار کرے اور مسلمان ہو۔

یہ ہے اسلامی تاریخ کے دور اول کا مختصر سرسری بیان جس سے معلوم ہے کہ اصل مقصد
مسلمانوں کے تبلیغی طریقہ کا ایک نقشہ ذہن میں آ جاتا ہے اس کے بعد تاریخ کا ورق
الٹتا ہے۔ رسول کی وفات ہوتی ہے اور مسلمانوں کے فتوحات کا دور شروع ہوتا ہے
کوئی شبہ نہیں کہ ان فتوحات کی بنیاد اسی بین الاقوامی تخیل پر تھی جو اسلام نے مسلمانوں
کے دماغ میں پیدا کیا تھا۔ مگر اس بین الاقوامیت کے اصل میں جو تبلیغی طریق کار کی نوعیت
پر اسلام کے ساتھ وقت نہیں کیا گیا۔ نہ اس کی ہی سکتی نہیں پہنچایا اور دینی چاہیے تھا

کیونکہ پیغمبر کے عملی نمونوں کی وہ تیغ قبیلوں کے وہم سے کہیں کا مقصود تھا یہ فتوحات کی جنگ ہے
دینِ اسلام کے پیش نظر بھی فتوحات تھے اور مسلمانوں کی نظر میں فتوحات پہلی بار فتوحات
کے مفہوم میں دخل جگہ فرق تھا۔ مسلمانوں کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کے ملک ان سے
لیکر اپنے بنا لئے جائیں۔ اور پیغمبر اسلام کے فتوحات یہ تھے کہ دوسروں کو خود اپنا بنایا
جائے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کا ملک اپنا ہو جائے۔ پہلی قسم کے فتوحات میں زمینیں چھینی
جاتی ہے اور دوسری قسم کے فتوحات میں دلوں کو تسخیر کیا جاتا ہے۔

یہ فتوحات جنہیں مسلمانوں نے اپنا نصب العین بنایا اس سے ممالک تو اپنے
ہو گئے مگر ملک کے رہنے والے ان فتوحات سے ہرگز اپنے نہیں ہو سکتے تھے بلکہ اس
طرح کی فتح کا ایک خاصہ ہے یہ کہ مفتوح قوم میں فاتح کی طرف سے جذبۂ نفرت
پیدا ہو جائے جب دل میں نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا تو اچھائیاں بھی نظر جائے گی نہیں اور
جب اچھائیاں دیکھی نہ جائیں گی تو دلوں میں ایمان کا رجحان کیا پیدا ہوگا۔

اس قسم کے فتوحات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح کے خلاف فرد قرارداد جرم
مرتب کرے اور صحیح یا غلط مظالم کی داستانیں جوڑے۔ تاریخ پر نظر ڈالئے تو اسلامی
فتوحات اس سے مستثنیٰ نظر نہ آئیں گے۔

مان لیا جائے کہ کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا الزام غلط ہے مگر اس غلط الزام کا گھڑ جانا
اور اصل ایسے ہی الزام کا ایران کی طرف سے عائد کیا جانا جسے مولانا شبلی نے شعر العجم میں بھی
نقل کیا ہے۔ یعنی یہ کہ ایران کی قدیم شاعری اور ادبی لٹریچر کا ذخیرہ باقی نہیں رہا
اس لئے کہ مسلمانوں نے ایران کے تمام قدیمی سرمایہ کو تلف کر دیا۔ ان غلط الزاموں
کا بالکل یکساں دو ملکوں کی طرف سے عائد کیا جانا، خود اس کا ثبوت ہے کہ
مفتوحہ ممالک کو فاتح جماعت کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ جبکہ مخاصمت تھی ویسی
ہی جیسی ہر مفتوح قوم کو فاتح کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

رسولؐ نے دکھا دیا اتحاد دیکھو ملک یوں فتح کئے جاتے ہیں۔ حضرت علیؑ کو فتح یمن کے
لئے بھیجا اور انہوں نے بغیر ایک قطرہ خون بہائے ہوئے تمام ملک کو اپنا بنا لیا مگر مسلمانوں
نے اس مثال کو یاد نہیں رکھا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ملک تو اپنے ہو جائیں مگر ملک

ملا لے اپنے نزدیک،

آلِ محمدؐ میں سے سرگروہ حضرت علی بن ابی طالبؑ تھے اس صورتِ حال کو دیکھ رہے تھے اور اس کے نتیجہ کو محسوس کر رہے تھے۔ انہوں نے بمصالحِ سیاستِ وقت کی مخالفت میں مزاحمت مناسب نہیں سمجھی۔ مگر نہیں الگ تھلگ بالخصوص وہ کام جس کام کا انجام دینا تھا جو پیغمبرِ اسلامؐ کی تمام مقاصد میں ان کے پیشِ نظر تھا۔ اگرچہ ان کا کام بہت مشکل بن گیا تھا مگر یک رخی انسانی شخص مشکلوں سے گھبرا کر اپنے فرض کو ترک نہیں کیا کرتا۔ انہوں نے پیام یہ قرار دیا کہ غیر ملک کی زمینوں کو سلطنت کے قبضہ میں لانے انسان کے دلوں کو آلِ محمدؐ اپنے عمل اور سیرت کے جذب سے اپنا بنائیں اور اس طرح ان میں اسلام کے ساتھ حقیقی ہمدردی پیدا کریں۔

اسی مقصد سے حضرت علیؑ نے اپنے دورِ خلافت میں بجائے مکہ یا مدینہ کے کوفہ کو دارالسلطنت قرار دیا۔ جو عراق کا مرکزی شہر تھا جو ایران اور حجاز دونوں کے بیچ میں واقع ہے۔ کوفہ فوجی چھاؤنی تھا۔ اور چھاؤنی میں ایرانیوں کی کثرت سے آمد تھی۔ ایران کے لوگ جب یہاں آتے تو وہ ان ہی اخلاق و کردار کو جو یہاں نظر آتے اسلامی کردار خیال کرتے اور اس کی وجہ سے اسلام کے خلاف ان کی نفرت مستحکم ہوتی جاتی۔

جنابِ امیرؑ نے یہاں قیام فرما کر اور اسے خاندانِ رسولؐ اور اپنے تربیت یافتہ سچے مسلمانوں کی جماعت کا مرکز قرار دے کر یہ موقع فراہم کر دیا کہ ایرانی نسلے قریب سے اسلامی اخلاق و آئین کا مطالعہ کریں اور اس کے بلند انسانی خصوصیات کو محسوس کریں جبکہ اب عمل طور پر بنی امیہ کی سیاست کو سختی کے ساتھ تباہ کر دینا کو دیکھ رہے تھے۔ جو پیغمبرِ اسلامؐ نے دنیا کے سامنے پیش کی تھی۔ جہاں غیر قریش مالک اشترؓ کی تنی عورت سے عقد رشتے بڑے خاندانی قریشیوں کی زوجیت اور قنبر غلام کے ساتھ مراعات تھیں جو بہت سے عربوں کے ساتھ نہ تھیں۔ جہاں انسانی حقوق میں مساوات کا اتنا خیال اور علی وغیرہ کی طرح کے صحابہ میں جنہوں نے تمام قرب ملک و نشانات (سعید شعبان عمر) نے ایک ایرانی

ہرمزان کو ناحق قتل کر دیا تھا اور گذشتہ دورِ حکومت میں تازی کی شخصیت کے اثر سے اس کا بدلہ لیا گیا تھا۔ اور جب حضرت علی ابن ابی طالب خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اعلان کر دیا تھا کہ اس ایرانی کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔ قتل سے عزیزی ہے اسلامی قانون میں عرب اور غیر عرب اور بڑے اور چھوٹے کی تفریق کی گنجائش نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عبید اللہ بن عمر بھاگ کر حضرت علیؓ کے حریف مخالف یعنی معاویہ کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور پھر صفین کی جنگ میں حضرت علیؓ کے مقابلے میں آ کر قتل ہوتے ہیں۔

کیا اس سے اسلام کی اس عین انسانیت کا اعلیٰ مظاہرہ نہیں ہوتا، یا نہیں ایرانیوں کا اعتماد نہیں بڑھا ہوگا اور کیا اس سے انہیں اسلام کے بنیادی اصول کے ساتھ محبت نہیں پیدا ہوئی ہوگی؟

علاوہ ازیں ایران کی شاہزادی کا حضرت امام حسینؓ کے عقد میں آ جانا گویا ایرانیوں اور عربوں میں رشتۂ اتصال قائم ہو جانے اور ملک و قوم کی تفریق کے مٹا دینے کا عملی سبق دنیا کو دیا جانا ہے۔ اس وقت جب شہنشاہ و قیصر کی بیٹی کے دامن پر کنیزی کا داغ آ رہا تھا، امیر المومنینؓ نے اپنے عزیز فرزند کے ساتھ اس کا عقد کر کے اس کو دنیائے اسلام کی ملکہ بنا دیا۔

کیا اس سے بڑھ کر ایران کو اسلام کا گرویدہ بنانے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی کہ آئندہ کے ہونے والے اسلامی پیشوا (زین العابدینؑ) ایک طرف ملک عرب کے دینی شہنشاہ، محمد و علی کے پوتے ہیں اور دوسری طرف ملک ایران کے شہنشاہ (یزدجرد) کے نواسے ہیں۔ اس کا نتیجہ تھا کہ خود وہ نفرت جو ایران کو فتح کرنے والوں اور ان کے مذہب سے ہونا چاہیے تھی وہ دور ہو گئی۔ اور اگر رہی بھی تو صرف ان لوگوں سے جنہوں نے براہ راست ان پر فوج کشی کی تھی۔ لیکن اسلام اور رہنمایانِ اسلام سے مذہبی طور پر انہیں کوئی نفرت نہیں باقی رہی۔ بلکہ دلی محبت و الفت اور والہانہ شیفتگی و گرویدگی پیدا ہو گئی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کے بعد اسلامی علوم اور مذہب کی جتنی خدمت ایران نے کی کسی دوسرے ملک کو نصیب نہیں ہوئی۔

چاہے سوادِ اعظم کے وہ قدیم اور متوسط دور کے علما ہوں جیسے بیہقی، نسائی، طبری، رازی، دوانی، جرجانی، نیشاپوری وغیرہ اور چاہے فرقۂ امامیہ کے ہر

دور کے علماء اعلام جیسے شیخ طوسی، نوبختی، فارسی، اصفہانی، رازی، طبرسی رازی،
ہمدانی، طہرانی، یزدی وغیرہ سب ہی سرزمین ایران سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک اور ثبوت ایران کے مذہبی شغف کا دیکھئے کہ ایران میں تشیع کا قائم کیا ہوا تہوار "نوروز" ہمیشہ منایا جاتا تھا۔ یہ "نوروز جمشیدی" کہلاتا تھا جو اعتدال ربیعی کے موقع پر قائم ہوتا تھا اس کے مقابل میں "مہرگان" تہوار تھا جو اعتدال خریفی کے موقع پر یعنی موسم خزاں میں ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک قوم کو اپنے قومی تہواروں اور قومی شخصیتوں کے ساتھ محبت ہوا کرتی ہے مگر چونکہ نوروز ہی کا دن مطابق ہو گیا حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ کی جانشینی کے دن سے تو ایرانیوں نے اپنے مخصوص تہوار کی قومی خصوصیت کو قربان کر دیا۔ اس مذہبی خصوصیت پر جو اس تاریخ کو حاصل ہو گئی تھی اور نوروز بجائے "نوروز جمشیدی" ہونے کے "نوروز اسلامی" اور نوروز علوی بن گیا جب اس میں اسلامی نماز پڑھی جاتی ہے اور حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے اوصاف و مناقب بیان ہوتے ہیں اور جمشید کے ساتھ جو اس دن کا تعلق تھا وہ صرف تاریخ کے اوراق پارینہ کی زینت بن کے رہ گیا ہے۔

یہ مذہبی دلبستگی مذہب کے ساتھ بغیر ضرب شمشیر فتح سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ یہ آل محمد کے اس اخلاقی جذب کی تاثیر ہے جس کی امیر المومنین حضرت علی نے ابتدا کی اور آل محمد میں سے ہر فرد نے جس کو برقرار رکھا اور امام رضا نے اپنے ولیعہدی کے دور اور زمانۂ قیام خراسان میں جس کو لازوال زندگی بخش دی۔

یاد رکھئے کہ دنیا کے ہر انسان کے چال چلن کا بشدت اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔ ہر شخص معلوم طریقہ پر اپنے افعال و حرکات سے دوسروں پر اچھا یا برا اثر ڈالتا رہتا ہے اور دوسرے اپنے عمل سے دوسروں پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے اس لحاظ سے کسی ایک شخص کی پارسائی، عدل، فیاضی، حسن سلوک، ہمدردی وغیرہ اوصاف کی اہمیت نظر انداز کرنا غلطی ہے۔ مگر تاریخ کا ایک خاصہ ہے کہ وہ حرکت کو دیکھتی ہے سکون پر نظر نہیں ڈالتی۔

اگر آپ حکومتوں کی عہد بہ عہد ترقی کی تاریخ اور شخصیتوں کی تاریخ پڑھیں تو آپ کو

جنگ ہنگامہ، شورش اور کاوشوں کے حالات بڑے شرح و بسط کے ساتھ ہیں مگر
لیکن جمود و سکون کی جاودانی یا مستقل اور تعمیر خلق کی کوششوں کا تذکرہ اگر ہے بھی تو
نہیں اور ہے تو ضمنی طور پر سرسری طریقے سے اور اختصار کے ساتھ

تاریخ اسلام اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایران و روم کی فتوحات تاریخ
کے صفحات پر چھا گئے۔ فتوح الشام واقدی اور فتوح البلدان بلاذری اسم با مسمیٰ ہو کر
اسلامی فتوحات کی حامل بن گئیں مگر یہودیوں کے باغ میں آب کشی کر کے بسر اوقات
کرنے والا پیغمبر کا جانشین اس دور کی تاریخ میں ڈھونڈے نہیں ملتا۔ حضرت علی کے
علاوہ دیگر ائمہ کے واقعات زندگی صفحات تاریخ پر زیادہ کیونکہ ان میں کہیں
کی کڑک، تیروں کی کھنک اور تلواروں کی جھنکار نہ تھی۔ گو مدینہ طیبہ سے لے کر
بوسہ خراسان تک بیٹھے ہوئے اور کرتے سب تاریخی شخصیت بنے
ہوئے ہیں لیکن یہ شخصیتیں دنیا کی خاموش فضا میں کام چلا کرنے کی وجہ سے تاریخ
کے معیار پر پوری نہ اتری تھیں اور زین العابدین محمد باقر، جعفر صادق، موسیٰ کاظم
وغیرہ اپنی عبادات اپنے علم اپنے صدق اپنے ضبط نفس وغیرہ صفات کمال میں بہت
تاریخی معیار پر پورے نہیں اترتے اس لئے کہ وہ اپنی خاموش سیرت سے سلطنت
دنیائے اسلام کی تعمیر میں کتنا ہی حصہ لے رہے ہوں مگر ان کی زندگی میں سکون ہے
اور سکون تاریخ کا جزو بننے کے قابل نہیں۔ اس صورت سے جو اسلامی تاریخ مرتب
ہوئی ہوتی اس میں یقیناً بس وہ خون آشام لڑائیاں ہوتیں جو اشاعت اسلام کے
نام پر فتوحات کی حیثیت سے اس پاس کے ممالک پر فوج کشی کی صورت
میں ہوتیں اور ایسی تاریخ سے مسلمان اپنی جگہ کتنا ہی ناز محسوس کرتے مگر اقوام
کی ہمدردی کا سرمایہ ان کو دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

ضرورت تھی ایک ایسے واقعہ کی جس میں ہو تو نوعیت جنگ کی، ہو باہمی
تصادم اور کشمکش، زمین پر بہتے ہوئے خون اور تڑپتے ہوئے لاشے ہوں
فتح اور شکست اور غالب و مغلوب کا انجام ہو۔ مختصر یہ کہ وہ سب باتیں ہوں
جن کی وجہ سے تاریخ کی نگاہ اٹھتی ہے۔ جن کی وجہ سے تاریخ اپنی خوش

کو گھیر لیتی ہے اور واقعات کو جگہ دیتی ہے۔ مگر اس جنگ کی تہ میں اسلام کے سچے اصول کی جاذبیت، اس کی صداقت و اخوت، اس کی خوفِ خدا کے ساتھ ہمدردی۔ اس کی حقوق اللہ و حقوق الناس کی محافظت اور اس کی انسانیت کی تعمیر میں تمام کوششوں کا نچوڑ اس طرح مضمر ہو کر اس جنگ کے ساتھ ساتھ یہ تمام باتیں ایسی ہیں یا اس سے بہتر تاریخی زندگی حاصل کریں جیسی فرشتہ خصال انسانوں کا حاصل ہے۔

اس واقعہ کے وجود کی وجہ سے تاریخ اسلام میں فریق حق کے لئے وہی جاذبیت اور وہی مقناطیسیت پیدا ہو سکتی تھی جو اصل اصول اسلام اور پیغمبر اسلام کی سیرت و زندگی میں موجود تھی اور جس پر فاتحانہ روایتوں نے نفرت کے جذبات کا پردہ ڈال کر اقوام عالم کی آنکھوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ واقعہ کربلا بھی ایک ایسا ہی واقعہ تھا۔ یہ ایک جنگ تھی اور جنگ بھی وہ جو خصوصیتوں اور خصوصی مشغلوں کی حامل ہونے کی وجہ سے کسی دوسری جنگ سے زیادہ تاریخ اس کو محفوظ رکھنے پر مجبور تھی یہاں بھی کھنچی ہوئی تلواریں تھیں۔ چمکتے ہوئے نیزے تھے۔ کڑکتی ہوئی کمانیں، اور سنسناتے ہوئے تیر تھے۔ زمین پر بہتا ہوا خون، کٹے ہوئے سر اور تڑپتے ہوئے لاشے اور پھر جنگ ایسی جس میں ایک طرف تیس ہزار اور دوسری طرف بہتر۔ ایک طرف سیر و سیراب اور دوسری طرف تین دن کے بھوکے پیاسے، ایک طرف تن و توش والے تیار اور جوان اور دوسری طرف چند جوانوں کے علاوہ بڑی عمر کے بوڑھے اور کمسن بچے۔ کون سی دنیا کی جنگ ایسی ہوئی ہوگی جس میں تمام ایسے بالغ کمسن کا کیا ذکر جس میں ششماہہ شیرخوار بھی قربان ہوا ہو۔

لہذا حیثیت جنگ سے تاریخ مجبور تھی کہ اس واقعہ کی جزئیات کو محفوظ کرے۔ مطلب اگر یہ جنگ بھی محض کسی غیر مسلم جماعت اور دوسری قوم کے مقابلہ میں ہوئی ہوتی تو غیر اقوام کو اس سے ہمدردی نہ پیدا ہوتی۔ بلکہ وہ اسے اسلام کی دوسری لڑائیوں کے ساتھ جو اقوام غیر اور دوسرے مذاہب کے ساتھ ہوئی ہیں، شامل کر کے اس سے غیریت بلکہ مخاصمت محسوس کرتیں۔ مگر اس جنگ کی

خصوصیت یہ تھی کہ کسی طور پر کسی ایک مذہب کی حمایت میں دوسرے مذہب کے خلاف نہ تھی۔ بلکہ ظاہری طور پر ایک ہی مذہب (اسلام) کے پیروؤں میں جو لوگ اس کے اخلاق اور بلند تعلیمات سے ہٹ گئے تھے۔ ان کے خلاف لڑی گئی تھی اس لئے دنیا کی دوسری قوم کو اس سے مخاصمت نہیں بلکہ ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور انہیں اس کے حالات معلوم کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے علاوہ اس کے ساتھ ان سے اسلام کے ان اصول اور اخلاقی حدود کا تعارف ہوتا ہے جو حسینؑ اور یزید کے درمیان خط فاصل بنے ہوئے تھے اور وہ جب حسینیت کی ہمدردی کے جذبہ کے ساتھ ان اصول پر غور کرتے ہیں تو ان کے دل پر اسلام کی عظمت کا سکہ قائم ہوتا ہے اور یہی وہ مقصد تھا جو پیغمبر اسلامؐ کے پیش نظر تھا اور جس کی حسینؑ نے اپنے خون سے تکمیل کی۔

یہ ایک بڑی خصوصیت ہے واقعۂ کربلا کی جو اسے تاریخ اسلام میں بڑی اہمیت کا مالک بنا دیتی ہے یعنی اگر تاریخ اسلام سے واقعۂ کربلا کو نکال لیا جائے تو غیر اقوام کی ہمدردی کے لئے کوئی چیز ہمارے پاس نہیں رہ جاتی اور یہ ایک ثابت حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر قوم کو حسین واقعات سے ہمدردی پیدا ہوتی ہے۔

پھر امام حسینؑ نے اپنے واقعات کے ساتھ اسلامی تعلیمات کو ایسا مدغم کر دیا ہے کہ حسینی تاریخ بغیر ان تعلیمات کے تذکرہ کے مرتب ہی نہیں ہو سکتی اور اس طرح ان واقعات کے ساتھ وہ تعلیمات بھی قدرتی طور پر تاریخ کا جزو بن گئے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے واقعۂ کربلا کی تمدنی حیثیت ایک مخصوص ذہنیت کے ساتھ وابستہ ہے۔

تم شمشیر تاریخ کا جزو بنا ہے زخم محراب نہیں تیروں کی بارش ہر جنگ کی آب مبدل کرتی ہے۔ خوف خدا سے آنسوؤں کی بات نہیں۔ پیش کرتی ہوئی لاشوں کو بیچ دیکھتی ہے سجدہ الٰہی میں زمین پر گری ہوئی پیشانیوں کو نہیں۔ مگر حسینؑ نے کربلا میں یہ کیا کہ تیروں کی بارش میں نماز جماعت ادا کی اب کیا ممکن ہے کہ تاریخ اس نماز کو نظر انداز کر دے۔ خنجر کی دھار کے نیچے خالق کا سجدہ کیا۔ اب کیا مجال

کر کے دنیا اس بھید سے آنکھ بند کر لے۔

اس طرح امام حسینؑ نے تعلیمات اسلام کو تاریخی زندگی کا لباس پہنا دیا جس کی مثال واقعۂ کربلا کے سوا تاریخ اسلام کے کسی واقعہ میں نہیں مل سکتی۔

کربلا میں مادیت پرستی اور حق پرستی کا مقابلہ صاف نظر آتا ہے۔ جب میدان جنگ میں صفیں مرتب ہوتی ہیں اور فوج شام کا افسر عمر ابن سعد تیر چلہ کمان میں جوڑ کر حضرت امام حسینؑ کی طرف رہا کرتا ہے پہلے اپنی فوج کو آواز دیتا ہے کہ گواہ رہنا پہلا تیر فوج حسینؑ کی جانب میں لگا رہا ہوں۔ یہاں گواہ کس کے جا رہے ہیں فوج کے سپاہی۔ کس بات کے لئے؟ حاکم وقت کے سامنے گواہی دینے کے لئے۔ صاف ظاہر ہے کہ صرف مخلوق کی رضامندی اور مادی فائدے کا حصول مدنظر ہے۔ اور ادھر جب حسینؑ کا جوان بیٹا رخصت ہو کے مرنے چلتا ہے تو زبان پر یہ الفاظ آتے ہیں: خداوندا گواہ رہنا کہ اب وہ جوان جا رہا ہے، جو صورت و سیرت میں تیرے رسولؐ کی تصویر ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ صرف اللہ کی خوشی خالق کی رضامندی کے لئے۔

کیا تاریخ کربلا کی جنگ سے اس خدا پرستی کے مظاہرہ کو الگ کر سکتی ہے؟ ناممکن ہے اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ گھریلو واقعات جن میں قرابتداروں کے باہمی حقوق مع دلائل کے ساتھ برتاؤ۔ باہمی محبت و سلوک کے کتنے ہی تابناک جواہرات ہیں کہ تاریخ انہیں ہرگز نہیں دیکھتی۔

حضرت امام حسینؑ کربلا میں اپنے عزیزوں کو اور ان سے بھی بڑھ کر اہل حرم یعنی بی بیوں اور بچوں کو ساتھ لائے اور سب حسینی کارنامے کے ذیل میں عزیزوں کے حقوق قرابتداری بہن اور بھائی کی غیر معمولی محبت۔ شوہر اور زوجہ کی باہمی رفاقت میں غرض کتنے ہی زندگی کے پہلو منظر ہو گئے ہیں جنہیں ہمارا تاریخ اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں

اس کا قطعی ثبوت چاہتے ہوں تو یہ دیکھئے کہ آخر حضرت امام حسینؑ ۱۰ محرم ۶۱ھ کے بعد بھی زندہ امام حسینؑ رہ گئے۔ یقیناً آپ کی پوری زندگی ہی حقوق

افراد حقوق انسانی اور اخلاص کے ساتھ ملازم اور گھر والوں کے ساتھ معاملات میں ایسی ہی شائستگی کہ جیسی وہ کربلا کے میدان میں نظر آتی ہے۔ مگر کیا بات ہے کہ ستاون برس کی عمر میں صرف ایک ہی دن کے جزئیات و واقعات ہیں جو تاریخ کی زبان سے ہم تک پہنچے ہیں اور اس دن کے پہلے کے ستاون برس کے واقعات ہرگز مسلسل اور مرتب طور پر ہمیں دستیاب نہیں ہوتے

اب آپ کو ماننا پڑے گا کہ یہ صرف واقعہ کربلا کی خصوصیت ہے کہ اس میں مذہبی کارنامے کے ساتھ چونکہ زندگی کے دوسرے پہلو منسلک ہو گئے تھے اس لئے انہیں تاریخی زندگی حاصل ہو سکی۔ اور اب آپ کو واقعہ کربلا کی مخصوص اہمیت تسلیم کرنا پڑے گی۔ جس نے تمدن اسلامی کے ہر اجتماعی اور انفرادی معاشرتی اور منزلی پہلو کو کس طرح تاریخ کا جزو بنا دیا جو بغیر اس کے قطعاً ناممکن تھا۔

اسیری اہل حرم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَآلِہِ الطَّاہِرِیْنَ ؕ

واقعات کربلا اپنی اہمیت کے اعتبار سے عالم کے واقعات میں اپنی آپ مثال ہیں۔ ان میں سے ہر واقعہ ان تمام وجوہ کو لیے ہوئے ہے جو کسی واقعہ کو اہم بنانے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کا تعلق براہ راست ایک ایسی ہستی سے ہے جس کی عظمت شرق و غرب کے کروڑہا انسانوں کے دلوں کو مسخر بنائے ہوئے ہے اور اس حیثیت سے بھی کہ عالم کی ایک متعدد ، اور کثیر التعداد جماعت (شیعہ) اس مقدس ہستی کو امام مفترض الطاعۃ سمجھتی ہے۔ نیز اس حیثیت سے کہ ندرت اور بے مثالی میں اس کی نظیر ازل و ابد کی حدود کے درمیان دیکھنے میں نہیں آئی اور اس حیثیت سے بھی کہ وہ عظیم انقلابات و تغیرات کا پیش خیمہ قرار پایا۔ ان وجوہ کی بنا پر کوئی تعجب نہیں کہ یہ واقعات صدیاں گزرنے کے بعد بھی برابر افکار و عقول کے لیے مرکز توجہ بنے رہے اور ہمیشہ ہی انکے اسباب و علل میں بحث کا سلسلہ قائم رہا۔

چنانچہ ہمارے سامنے اعتراض یہ پیش ہے کہ جب سید الشہداءؑ کو معلوم تھا کہ وہ اس سفر میں شہید کیے جائیں گے۔ اور آپ کے بعد اہل حرم کی اسیری یقینی ہے۔ تو پھر ان اہل بیت کو

اپنے ساتھ لے کر نکلنے کے کیا معنی؟ کیا یہ خود اپنے ناموس و عزت کو دشمنوں کے ہاتھوں ہتکِ حرمت کے لیے دے دینا نہیں ہے اور کیا سیاست و عاقبت اندیشی اس بات کی مقتضی نہ تھی کہ آپ ابن عباس اور دوسرے لوگوں کے مشورہ پر عمل کرتے جو اہلِ حرم کو مدینہ منورہ میں چھوڑ جانے کے حامی تھے۔

بحث کا پہلا رُخ

مذہبی نقطۂ نظر

اس موقع پر بہت سے علمائے مذہب کی طرح یہ کہہ دینا بہت آسان ہے کہ اس قسم کے سوالات کا جن میں ائمۂ دین! انبیاء و مرسلین کے طرزِ عمل پر نکتہ چینی کا احتمال ہو جائے شرعی اصول کی بنا پر موقع ہی باقی نہیں رہتا۔ ہم کو ادلۂ عقلیہ اور براہینِ یقینیہ نے ایک ایسے مرکز پر پہنچا دیا ہے جہاں سے امامت و نبوت توحید کی کڑیاں اس طرح متصل ہو جاتی ہیں جن کے اندر جدائی ناممکن ہے۔ امام پر الزام اس کی ذات سے تجاوز کر کے رسول تک منتہی ہوتا ہے اور آخر میں ذاتِ احدیت تک سرایت کرتا ہے عصمت کے حدود مخصوص ادلہ و براہین کی حقیقت میں طے کر لینے کے بعد اس کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ ان ذواتِ مقدسہ کے افعال کو محلِ نقد و اعتراض قرار دیا جائے۔ ان بزرگانِ دین کی مثال بالکل ایک ایسے شخص کی ہے جس کو سلطان نے باضابطہ طور پر جانچ کر ایک بڑے منصب کے

سے پہلے وہاں کچھ لیا ہوا اور اسی اہلیت کی بنا پر اس کو سفیر بنا کر ایک خاص شہر میں بھیجا ہو کہ وہاں مطلوبہ اغراض و مقاصد کی تکمیل کرے۔ سلطان کی جانب سے اس کو ایک مخصوص دستور العمل بھی دے دیا گیا ہو جس سے یکسر مو تجاوز کرنے کا اس کو حق نہیں ہے اسی صورت سے انبیاء و ائمہ اپنے دور رسالت و امامت میں ایک خاص دستور العمل کے پابند ہیں جس میں ابتدا سے دور سے لے کر انتہا تک ہر وقت کی مناسبت سے مخصوص حکم و مصالح کے ماتحت ایک حکم قرار دے دیا گیا ہے جس کی پابندی ان پر فرض ہے اور بعض مواقع پر جہاں مقصد کی تکمیل کے لیے قربانی کی ضرورت ہے۔ وہاں جس قسم کی قربانی ضروری ہو وہ بھی اس کے فرائض میں داخل ہے۔ ان حکم و اسرار ہے جو اس قسم کے احکام کا منشأ ہیں رعیت کو بحث کا کوئی حق نہیں ہے۔ مگر یہ طریقہ اصولی حیثیت سے کتنا ہی مستحکم کیوں نہ ہو) موجودہ زمانہ کی آب و ہوا کے ساتھ سازگار نہیں ہے۔

آج کے زمانہ کا معترض اس طرح کا جواب سن کر اپنے اعتراض کی حقانیت کا زیادہ معتقد ہو جاتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس کا کوئی جواب ممکن ہی نہیں ہے۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ حسین علیہ السلام کی شخصیت پر معترض کے نقطۂ خیال اور زاویۂ اعتقاد کے مطابق نظر ڈالوں۔

بحث کا دوسرا رُخ

فلسفی حیثیت

میں حسینؓ کو صرف اس حیثیت سے دیکھتا ہوں کہ وہ ایک بلند مرتبہ عالی نسب باہمت انسان اور ایک محترم قبیلہ (بنی ہاشم) کے بزرگ خاندان اور سردار ہیں۔ جو اپنے تئیں حسب و نسب اور ان اوصافِ کمالات کے باعث جو انھیں حاصل ہیں یزید سے زیادہ خلافت و سلطنت کا مستحق سمجھتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ جس صورت سے بھی ہو یزید سے کہ جو بلا استحقاق غاصبانہ طور پر مسندِ حکومت کا مالک بنا بیٹھا ہے اپنے حق کو حاصل کریں۔ یا کم سے کم خود یزید کو خلیفۂ وقت تسلیم کر کے اس کی بیعت میں داخل نہ ہوں جبکہ یزید کے رسوائے عام اعمال آفتاب سے زیادہ روشن ہیں اور یہ امر پایۂ ثبوت تک پہنچ چکا ہے کہ اگر یزید اسی صورت سے خلافتِ اسلامیہ پر قابض رہا تو کچھ ہی دن میں شعائرِ اسلامیہ نیست و نابود اور شریعتِ نبویہ کے نقوش دھندلے نسیاً منسیاً ہو جائیں گے۔ اسلامی افراد کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ چکے تھے۔ الناس علیٰ دین ملوکھم کے فطری قانون کے مطابق ہر شخص کو اسلامی قانون کی خلاف ورزی میں خاص لذت محسوس ہونے لگی تھی، وہ اشخاص جن کے دل میں احساس مذہبی باقی تھا سلطنت کے خوف اور اپنی کمزوری کے باعث سکوت پر مجبور تھے ان حالات کے اندر حسینؓ یزیدی سلطنت کا تختہ

اٹھنے کے لیے کمربستہ ہوتے ہیں۔ ان کا آخری نقطۂ نظر یہ بھی نہیں کہ خود تخت حکومت پر بیٹھ کر دنیا کے مال و منال اور لذت حیات دنیا سے متمتع ہوں بلکہ ان کا مقصود اصلی یہ ہے کہ امت اسلامیہ کو اس ظالم کے فولادی پنجے سے رہا کریں۔ جس نے اس کو دینی و دنیوی ہر قسم کی ہلاکت میں ڈال رکھا ہے۔ اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ رائے عامہ کو یزید کے خلاف برافروختہ کردیں۔ جمہور مسلمین، تمام رعایا کے سامنے یزید کی اخلاقی پستی اور اسلام دشمنی کو مجسم صورت میں پیش کریں اور دنیا کو دکھلا دیں کہ یہ شخص کسی صورت سے سلطنت مسلمین کا حقدار نہیں ہے امام حسینؑ کو اس مقصد کے حصول میں اس سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز کوئی تدبیر نظر نہ آئی کہ وہ اپنے نفس کو خطرات کے مقابلہ میں پیش کردیں۔ اپنے تئیں ہر قسم کے مصائب کا نشانہ بنا کر عالم کے سامنے ظالم اور مظلوم کا انتہائی حیرت انگیز مرقع دکھلا دیں جس میں ایک طرف حق و صداقت رحم و کرم، اخلاص عمل اور دین، ثبات قدم، جانبازی، صبر و تحمل اور دوسری طرف ظلم و ستم، جفاکاری، قساوت قلب، بے حمیتی، کم ظرفی، وحشیت و حیوانیت کا مکمل نقشہ موجود ہے۔ اور اس کے سبب سے مسلمانوں کے دلوں پر وہ چوٹ پڑے جس کا نتیجہ انقلاب سلطنت کی صورت میں نمایاں ہو۔ صرف قتل ہو جانا اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا تھا، عرب قوم میں بات پر مرمٹنا ایک معمولی بات تھی۔ عربی جانبازوں کی آخری سانسیں اکثر تلواروں ہی کی چھاؤں میں چلتی تھیں۔ پسر فرزند رسولؐ بھی اگر اپنی جان سے گزر کر قتل کو منظور کر لیتے تو اس کو کوئی اہمیت عام نفوس میں حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ حسینؑ نے اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے اہل حرم کو

اپنے ساتھ رکھنا ضروری سمجھا، عورتوں اور بچوں کے ساتھ ہمدردی انسانی جبلت میں فطری طور پر داخل ہے اور بالخصوص عرب قوم میں غیرت و حمیت کے تحت میں یہ جذبہ خصوصیت سے پایا جاتا ہے۔ فرزند رسولؐ یزید اور اس کے بندۂ زر یقین رکھتے تھے کہ وہ بخیال خود فتح پانے کے بعد ان بے والی و وارث عورتوں کے ساتھ رحم و کرم کا کچھ خیال بھی نہ کریں گے اور مظالم و مصائب کا سلسلہ ان اہلِ حرم کے ساتھ ایک طویل مدت تک جاری رہے گا۔ خاندانِ رسولؐ کے مخدرات مختلف شہروں میں پھرائے جائیں گے۔ قید خانہ میں مقیم کیے جائیں گے اور ان کے ساتھ ہر قسم کا ظلم و ستم روا رکھا جائے گا۔ جس کا اثر یہ ہوگا کہ زندہ نہیں تو کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی اور دلوں میں جذبات حزن و ملال سے تلاطم برپا ہوگا۔ یقیناً بنی امیہ کی سلطنت تباہ ہوگی حسینؑ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے۔ ظاہری صورت سے تو یزید نے حسینؑ اور ان کے تمام انصار و اعوان کو قتل کر ڈالا لیکن حقیقتاً حسینؑ نے یزید اور تمام بنی امیہ کو ان کی پوری سلطنت سمیت قتل کیا۔ حسینؑ کی فتح ہوئی اور یزید کی شکست۔ اور شکست بھی ایسی کہ روز قیامت تک جس کے بعد فتح نصیب نہیں ہو سکتی۔

سید الشہداءؑ کا تبلیغی نقطۂ نظر

امام کو معلوم تھا کہ وہ قتل کیے جائیں گے، بے شک معلوم تھا۔ بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ تمام اعوان و انصار اعزا حتیٰ کہ شیرخوار بچہ بھی باقی نہ رہے گا۔ مردوں میں سوائے ایک بیمار فرزند کے کوئی نہ بچے گا۔

سب دوپہر کے عرصہ میں قتل ہو جائیں گے۔ یہ بھی یقینی تھا۔ کہ
بنی امیہ آپ کے قتل کو مختلف لباس پہنا کر دنیا کو یہ یقین دلانے
کی کوشش کریں گے کہ آپ کا قتل مذہبی قوانین کے لحاظ سے قابل
اعتراض نہیں بلکہ اصول کے مطابق ہے۔ اور یہ کہ حسینؑ خلیفۂ وقت پر
خروج کے باعث اس کے مستحق تھے کہ ان کو قتل کیا جائے۔ عراق
میں امیر المومنینؑ کی چند روزہ خلافت ظاہریہ کی بدولت اہل بیت
رسولؐ کو پہچاننے والے کچھ نہ کچھ تعداد میں موجود تھے۔ لیکن شام نے
اسلامی دنیا میں آنکھ کھول کر سوائے اموی سلاطین اور ان کے جاہ وحشم
کے کچھ نہ دیکھا تھا، ان کے کان علی بن ابی طالبؑ پر سب وشتم کو نماز
کے وظائف اور جمعہ کے خطبوں میں سننے کے عادی تھے اور ان میں سے
بیشتر افراد اس مقدس ہستی اور خاندان رسولؐ کے محترم افراد کو پہچانتے
بھی نہ تھے۔ ان میں سے ایسے بھی تھے کہ جب ان سے پوچھا جاتا تھا یہ
کون شخص ہے جس پر بعد نماز سب وشتم کی جاتی ہے۔ تو وہ کہتے تھے
(اراہ لصا من لصوص العرب) میرے خیال میں تو یہ عربستان
کے ڈاکوؤں میں سے کوئی شخص ہے (عقد فرید) ان حالات کی موجودگی
میں کوئی شبہ نہیں کہ ادھر حسینؑ قتل ہوتے ادھر واعظین اور خطبا کی
زبانیں خلیفۂ وقت کے طرز عمل کو سراہنے اور اس کے حق بجانب
ثابت کرنے میں مصروف ہو جاتیں اور اس وقت غزالی کا رسوائے
زمانہ مقولہ (قتل حسین تعی ح جئ؟) بالکل عام افراد مسلمین
کی نظر میں حقیقت کا لباس پہن لیتا، اس صورت میں سیدا لشہداؑ
نے اپنی جان و مال اولاد سب کو شرع اسلامی کے احیاء اور اپنی مذہبی
خودداری کی نگہداشت میں صرف کیا۔ لیکن نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ تاریخ کے

وقتی اور کتب سیر کے مصنفات نے یزید کو مثل دیگر جنگ آزما ہستیوں کے، غازی اور مجاہد کا لقب دے دیا۔ اور پیکر حقیقت، روح صداقت امام برحق حسینؑ بن علیؑ دنیا میں ہمیشہ کے لیے مجرم اور باغی مستحق قتل بن لیے گئے۔ کیا حسینؑ کا تدبر اس کی اجازت دے سکتا تھا! کیا وہ اپنی جان کو ہاتھ سے دیتے ہوئے مقصد کو بھی ہاتھ سے دیتے، یہ قتل صرف قتل حسینؑ نہ تھا۔ بلکہ ان کی تحریک، ان کے مقصد، ان کی اولوالعزمی، ان کی پاک دامنی اور نفسانی صفات و خصوصیات دین اسلام اور شریعت حقہ کے قتل کا مترادف تھا اور اس سے بڑھ کر سید الشہداء کی شکست کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

امام کے لیے اپنے قتل کے بعد اس مقصد کی حفاظت کا کون سازو سامان تھا؟ کس پر وہ اعتماد کرتے کہ وہ ان کی شہادت کے فلسفہ اور ان کی حقانیت وصداقت کی تبلیغ کے حق کو ادا کرے گا؟ کیا وہ اپنے اعزہ اور انصار پر بھروسہ کرتے؟ وہ تو سب ان کے سامنے قتل ہو جانے والے تھے۔ کیا وہ بیمار فرزند زین العابدینؑ پر اعتماد کرتے؟ وہ خود بھی طوق و زنجیر میں گرفتار اور شدید مرض میں مبتلا تھے۔ اور ان کا قتل کرنا سخت دل دشمنوں کے لیے معمولی بات تھی۔ پھر کون تھا جو امام کے بعد اس اہم فریضہ کا ذمہ دار ہو؟ کون دنیا کے سامنے حقانیت وصداقت کو بے نقاب کرکے دشمنوں کی حکمت عملی اور حیلہ سازی کو مکمل شکست دیتا اور بھرے ہوئے مجمعوں میں بازاروں کے اندر پُر زور و مدلل تقریروں سے ناواقف افراد کے سامنے حقیقت کو واضح کرتا؟

اس وقت کو دیکھو اور ان حالات پر غور سے نظر ڈالو زدہ ہولناک مواقع ایسے نہ تھے کہ کسی بڑے سے بڑے مرد کے قدم وہاں ٹھہر جاتے، فرض بھی کر لیا جائے کہ کوئی مسلمان اپنی جان پر کھیل کر اس موقع پر کھڑا ہوتا تو کیا اس کو اتنی مہلت بھی دی جاتی کہ وہ اپنے فرض کو ادا کر سکے؟ کون تھا جو حسینؑ کے مقصد کی تکمیل کرتا؟ بے شک اس مقصد کو پورا کیا قرآن ہی سے والی و وارث عورتوں نے جو قیدی بنا کر شہر بہ شہر پھرائی جا رہی تھیں، جن کے دلوں میں غم و غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی، جن کی رگوں میں علوی و فاطمی خون جوش کھا رہا تھا، جن کی زبانوں سے نبوی بلاغت اور علوی فصاحت الفاظ کی صورت میں موجزن تھی۔ انھوں نے وہ کام کیا جو بڑے بڑے پر جگر مردوں سے نہ ہوتا اور ایسے سخت موقع پر فریضۂ تبلیغ کو ادا کیا۔ جن میں بہادروں کے دل چھوٹ جاتے، فرزند رسولؐ کو معلوم تھا کہ وہ قتل کیے جائیں گے اور جتنے یگانے بیگانے آپ کے ساتھ ہیں سب شہید ہوں گے اور مردوں میں کوئی ایسا شخص باقی نہ رہے گا جو اسلامی افراد کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کرے ان کی آنکھوں سے غفلت کے پردے ہٹائے۔ آپ اگر اس پہلو سے چشم پوشی کرتے اور اپنے بعد کے لیے اس مقصد کا کوئی سرانجام نہ کرتے تو یقیناً آپ کی قربانی غیر مکمل اور عبث رہتی، اور اس سے جو اصلی مقصد تھا وہ حاصل نہ ہوتا۔ اس نصب العین کی تکمیل کے لیے حضرت کو مخدرات عصمت کا اپنے ساتھ رکھنا ضروری معلوم ہوا۔

حضرت کو اس امر کا احساس تھا کہ بنی امیہ اسلامی احکام و قوانین اور عربی عادات و اخلاق سے جتنا بھی تجاوز کریں لیکن یہ نہیں ممکن کہ ان کو بے

دالی وحشت عورتوں کے قتل کی ہمت ہو، نہیں ممکن کہ وہ ایک مصیبت زدہ غم رسیدہ عورت کو قتل کریں جس کا قصور صرف اتنا ہو کہ دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے اس نے کچھ الفاظ زبان سے نکالے ہوں۔ روز عاشورہ اگرچہ دشمنوں کے ہاتھ سے بعض عورتیں اور بچے بھی قتل ہوئے لیکن معرکۂ جنگ کی خصوصیات دوسرے اوقات سے مختلف ہیں۔ ابن زیاد اپنے تمام ظلم جور اور طغیان و سرکشی کے باوجود ہرگز اس امر پر قادر نہ تھا کہ وہ غیر معرکۂ جنگ میں ایک بے کس و بے بس عورت کا خون بہاتا جو اس کے سامنے ایک قیدی کی صورت میں کھڑی ہو۔

ملکی قوانین کی سختی یا شرعی یا عوام کے جذبات کے خیال سے سہی لیکن وہ کسی عورت کو قتل کرنا تو درکنار بظاہر ہاتھ بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ دیکھو جب مخدرۂ رسالت زینب کبریٰ نے اپنی باطل شکن تقریر سے اس کے بلکہ تمام اموی حکومت کے کفر و فسق اور خبث و شقاوت کو طشت از بام کر دیا۔ اور تکلف سے اصلاح یا ابن مرجانہ کے تعریفیہ کلمے دنیا کو اس کی آنکھوں کے سامنے تاریک بنا دیا۔ تو اس نے چاہا کہ ہاتھ اٹھائے اور زینب کبریٰ سے ان کے جگر سوز الفاظ کا بدلہ لے لیکن اسی کے لشکر کا بڑا سردار عمرو بن حریث سامنے آ گیا اور اس نے ابن زیاد کو یہ کہہ کر روک دیا کہ عورت کو اس کی زبان سے نکلی ہوئی باتوں کی سزا نہیں دی جاتی۔ ابن زیاد کو یہ کہہ کر ساکت ہو جانا پڑا کہ (اما ترہا کیف تجرأت علی) تو نہیں دیکھتا کہ زینب نے میرے ساتھ کتنی بڑی جسارت کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسینؑ اور انصار حسینؑ نے کربلا میں وہ یادگار نمونہ پیش کیا جس کی مثال ناممکن ہے۔ انہوں نے شجاعت و جرأت

کا مجسم بن کر ثبات قدم و استقلال کے وہ جوہر دکھلائے جن کی نظیر تاریخی صفحات میں ڈھونڈھنے سے نہیں ملتی۔ ستر آدمی اسّی ہزار کے مقابل میں کھڑے ہوئے پھر ان کو کوفہ و شام سے برابر مدد پہنچنے کی توقع اور ان کو کسی امداد کی امید نہیں۔ وہ نہر کے کنارے سیر و سیراب اور یہ ریگستان میں دو تین دن کے پیاسے آفتاب کی گرمی، لو کی تپش، زخموں کی کثرت آنکھوں کے سامنے بچے پیاس سے جاں بلب ان تمام حالات کے باوجود پائے ثبات میں تزلزل آنا تو کیسا، چہروں پر شکن بھی نہ آئے۔ بلکہ جتنا وقت سخت ہوتا جاتا تھا ان کے چہروں کی بحالی، رگوں میں خون کی روانی، ارادوں کی پختگی زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ یقیناً بڑا حیرت انگیز دہشت ناک موقع تھا۔ جس میں ٹھہرنا ان ہی بہادروں کا کام تھا لیکن اگر غور کرو تو اس سے زیادہ عظیم اور دہشت انگیز وہ موقف تھا۔ جہاں خاندانِ رسالت کے مخدرات عصمت و طہارت کو ٹھہرنا پڑا تھا اور وہ یزید ابن زیاد کا دربار ہے۔

ذرا دیکھو آرسی اکوفہ میں قصر دارالامارہ کے اندر دربار آراستہ ہے ابن زیاد تخت حکومت پر فتح و ظفر کے نشہ میں سرشار بیٹھا ہے تمام ارکانِ دولت، رؤسائے قبائل، عمالِ حکومت حاضر ہیں اور سامنے عام حاضرین بارگاہ صف در صف دم بخود ایستادہ ہیں۔ دنیا اپنی تمام ظاہری شان و شوکت کے ساتھ مجسم صورت میں موجود ہے۔ اس حالت میں اسرائے اہل بیتؑ اور سرہائے شہداء لائے جاتے ہیں ان ہی قیدیوں میں عقیلہ خوہارہ زینب کبریٰؑ بھی ہیں۔ اور وہ ایک گوشے میں عام نظروں سے ذرا ہٹ کر بیٹھ جاتی ہیں۔ ابن زیاد کی

کمینہ نفسی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ بلند ہمت تاجین کی صورت سے دشمن پر ظفر پانے کے بعد معاف کرنے۔ یا کریم النفس اور با وفا افراد کے طریقہ پر سکوت سے کام لے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ اپنی فتح و ظفر کا زبانی اظہار کرکے ان دکھے ہوئے دلوں کو دکھائے۔ عظمت و جلالت چھپانے سے نہیں چھپتی۔ اس نے حضرت زینبؑ کو قرائن سے پہچانا۔ اور مزید پہچانا لیکن صرف خیال خود ہتک حرمت کے لیے دشمن کا نتیجہ خود اس کی سبکی اور ہتک کی صورت میں ظاہر ہوگا) پوچھنے لگا۔ کہ یہ کون عورت ہے جو لوگوں کی نظر بچا کر دور بیٹھی ہے کسی نے کہا کہ یہ زینبؑ دختر علیؑ ہیں۔ اب ابن زیاد کو اپنی فتح و ظفر کے مظاہرے اور زینبؑ کی شماتت اور دل آزاری کا موقع پیدا ہو گیا۔

ابن زیاد۔ کیوں زینبؑ! دیکھا خدا نے تمہارے بھائی اور ان کے باقی ساتھیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اس سوال کا جواب ایک ستم رسیدہ عورت جو قیدی کی صورت میں ہو کیا دے سکتی ہے! کیا اس کے دل میں اتنی طاقت، زبان میں اتنی قوت باقی رہ سکتی ہے کہ وہ جواب سنجیدگی کے ساتھ دے۔ لیکن ذرا ان لفظوں میں غور کرو جو زینب کبریٰؑ نے جواب کی صورت میں کہے۔ ان میں کہیں اضطراب، خوف، بے صبری، ناسمجھی کی جھلک ہے؟ میں نے تو اچھا ہی اچھا دیکھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن پر قتل ہونا خدا نے مقدر کیا تھا۔ وہ اپنے پیروں سے اپنے مقتل کی طرف گئے۔ اور وہ دن دور نہیں کہ جب خدا کے سامنے تیرا اور ان کا مقابلہ ہوگا۔

اور مجھ کو جواب وہی کرنا ہوگی۔ اس وقت دیکھنا کہ فتح کس کی ہے؟
زینبؑ کے یہ جملے معانی کا دفتر اپنے دامن میں لیے ہوئے ہیں فلسفہ مظلومیت کے تمام نکات و اسرار ان چند کلموں میں ختم اور عقیدہ معاد اور دار آخرت کی تبلیغ ان کا مخصوص جوہر ہے۔

ابن زیاد کے لیے سنجیدہ بحث کا دروازہ بند تھا۔ اس کی زبان رک چکی تھی۔ اس کی تمام ظاہری شان و شوکت، دولت و ثروت ان الفاظ کا جواب دینے کے لیے کام آنے والی نہیں تھی اس کو سب و شتم اور عامیانہ گفتگو کے سوا چارۂ کار نظر نہ آیا۔

ابن زیاد۔ "خدا کا شکر کہ تم لوگوں کو قتل کیا، تمہیں رسوا کیا، اور تمہاری باتوں کا جھوٹ ظاہر کر دیا۔" اسکے جواب میں کیا زینبؑ بھی ایسی ہی غیر سنجیدہ اور نفسانیت سے گری ہوئی تقریر کرتیں؟ واللہ! زینبؑ کی شان اس سے ارفع و اجل تھی۔ وہ اس موقع پر باطل کا مقابلہ حق سے اور باتوں کا جواب دلیل و برہان سے دے رہی تھیں انھوں نے کتنے شاندار لفظوں میں جواب دیا۔ جس پر بلاغت نثار ہو رہی ہے:

"رسوا وہ ہوتا ہے جو فاسق ہو اور جھوٹ وہ بولتا ہے جس کو سچائی کا لحاظ نہ ہو اور وہ ہم نہیں ہمارا غیر ہے۔" حسینؑ اور انصار حسینؑ نے خود مغرور دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ ان کے ہاتھوں میں چلتی ہوئی تلواریں تھیں۔ ان کے دوش پر بادہ اور نیزے تھے۔ عزت ان پر سایہ فگن اور شرف ان کے ہمرکاب تھا۔ ان میں سے ایک اس وقت تک قتل ہوتا تھا جب وہ دشمنوں میں سے سیکڑوں کو قتل کر لیتا تھا۔ وہ خوش تھے، ان کے لبوں پر تبسم تھا۔ صرف اس خیال سے کہ تھوڑی دیر میں وہ دنیوی آلام سے نجات حاصل کر سکے

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جنت الفردوس میں جا کر قیام کرنیوالے ہیں۔ یہ اس موقف کی صورت تھی جہاں شہدائے کربلا کو کھڑا ہونا پڑا تھا۔ لیکن وہ موقع جو زینب کبریٰ اور ان کے ساتھ کی مخدرات عصمت کو برداشت کرنا پڑا اس سے مختلف ہے وہ دربار ابن زیاد میں قیدی کی صورت میں کھڑی تھیں تو نظر اٹھا کر جدھر دیکھتی تھیں، سوائے شماتت کرنے والے دشمنوں اور جلس تبخیر کرطعن وتشنیع کرنے والے اغیار کے کوئی نظر نہ آتا تھا ان کی آنکھوں کے سامنے وہ جفاکار اشخاص موجود تھے، جن کی تلواروں نے ان کے جوان فرزندوں، بھائی بھتیجوں کو ٹکڑے ٹکڑے کیا تھا وہ اپنے تئیں ایک ایسے مقام پر قیدی کی صورت میں دیکھ رہی تھیں، جہاں وہ ایک وقت میں سلطنت کر چکی تھیں۔

یہ تمام باتیں وہ ہیں جو انسان کو بے قابو، عقل وحواس مختل اور زبان دل کو بے طاقت بنا دیتی ہیں۔ جن کی موجودگی میں شجاع ترین انسان ایک کلمہ زبان سے کہنے کے قابل نہیں ہوا کرتا۔

زینب کبریٰ سلام اللہ علیہا کے ان خصوصیات وحالات کو دیکھتے ہوئے کیا کسی شخص کو یہ کہنے میں جھجک ہو سکتی ہے۔ انہوں نے دربار ابن زیاد میں جس منزل کو طے کیا وہ اس مرحلہ سے زیادہ دشوار تھی، جس کو انصار سید الشہداء نے کربلا کے میدان میں طے کیا؟ تاریخی حالات کو دیکھتے ہوئے کیا کوئی شخص دعویٰ کر سکتا ہے کہ ان حوصلہ شکن حالات کی موجودگی میں ابن زیاد کے سامنے زینب کی زبان میں لکنت یا ان کے دل میں کسی قسم کا اضطراب یا ان پر کسی طرح کے خوف ودہشت کا اثر تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں کہ انہوں نے اس موقع

پر ایسی پرمعنی تقریریں کیں جن کو اگر ایک فارغ البال اور مطمئن شخص کئی رات دن کی فکر میں تیار کرتا تب بھی وہ اپنی نوعیت میں یادگار کی حیثیت نہ رکھتیں۔ پھر جناب زینب نے تو ہزاروں اشخاص کے مجمع میں ایسے موقع پر ان خطبوں کو ارشاد فرمایا تھا جب وہ مصائب اور شدائد کے بتیس دانتوں میں زبان کی طرح گھری ہوئی تھیں جبکہ مظالم کی چکی ان پر چل رہی تھی۔ انسان کی زندگی کا مشکل ترین موقع تھا۔ دختر ابن زیاد نے جب پوری طرح بھانپ لیا کہ زینب پر اس کی سطوت و شوکت کا ذرہ برابر اثر نہیں ہے۔ اور یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ ان کی باتیں رائے عامہ کو اس کے خلاف منقلب نہ کر دیں۔ اور اس کی رسوائی اور فضیحت میں نقاب خفا کے جو تھوڑے بہت تار باقی ہیں۔ وہ بھی معدوم نہ ہو جائیں تو اس کو تقریر کا رخ بدلنا پڑا اور آخری الفاظ جو اس کی زبان سے نکلے وہ یہ تھے (لعمری ذنھا سجاعۃ ولقد کان ابوھا اشجع منھا) خدا کی قسم زینب بڑی عبارت آرائی کرنے والی ہیں اور ان کے باپ تو ان سے زیادہ عبارت آرائی میں کامل تھے۔

نہیں نہیں اے ابن مرجانہ! زینب صرف عبارت آرائی کرنے والی نہیں ہیں۔ وہ ثبات و استقلال کا مجسمہ حقانیت و صداقت کا پیکر ہیں۔ وہ حکومت جابرہ اور سلطنت ظالمہ کے مقابل حق کی آواز بلند کرنے کی اجارہ دار ہیں۔ وہ علی بن ابی طالب کی یادگار ہیں جنہوں نے دنیا کو فصاحت و بلاغت اور شجاعت و جرأت کا سبق دیا۔ وہ معصومہ کبریٰ فاطمہ زہرا کی بیٹی ہیں۔ جن کی عصمت و طہارت

پر آیۂ تطہیر نے مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ در حقیقت ایسا منظر جگر خراش تھا کہ جس کے رسوائے عالم واقعات سے تاریخ کی پیشانی عرقِ انفعال سے تر ہے۔

زینبؑ کی یہ شجاعت و جرأت ایک مرتبہ دو مرتبہ سے مخصوص نہیں بلکہ اس کا ظہور ہر اس موقع پر ہوتا تھا کہ جب مشکلات کا ہجوم اور مصائب کا اژدہام تھا۔ جبکہ تماشائیوں سے بازار بھرے ہوئے تھے۔ کوفہ میں داخلہ کے وقت، کوفہ سے نکلنے کے موقع پر، راستے میں، بازارِ شام کے اندر ہر مناسب موقع پر زینبؑ کی زبان فریضۂ تبلیغ میں لگی رہی۔ انھوں نے حق کے واضح کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ انھوں نے ہر موقع پر جو کسی ایسے خطیب سے بھی ناممکن ہے جس کے لیے تمام خاطر جمعی اور راحت و اطمینان کے اسباب موجود ہوں، ویسی پُرزور تقریریں کیں جس نے دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیے۔

قیدیوں کا قافلہ کوفہ میں پہنچا۔ اس صورت میں کہ جس سے پتھر کا دل بھی پگھل جائے۔ زنانِ کوفہ نے نظر آتے ہی بے چین ہو کر رونا شروع کیا۔ سید سجادؑ نے ضعف و مرض کے باعث تھرائی ہوئی آواز میں کہا: "تم ہی لوگوں نے تو ہمارا خون بہایا۔ اب تمہاری عورتیں ہمارے حال پر روتی ہیں۔ ہمارا تمہارا فیصلہ روزِ جزا خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

پھر زنانِ کوفہ کی درد انگیزی بڑھی اور مرد و زن ہم آواز ہو کر رونے لگے۔ امامؑ نے فرمایا: "تم لوگ ہمارے لیے روتے اور زاری کرتے ہو۔ پھر آخر ہم کو قتل کس نے کیا ہے؟"

بشیر بن خزیم اسدی ناقل ہے کہ اس موقع پر زینبؑ بنتِ علیؑ

نے مجمع کی طرف رُخ کیا۔ اور تقریر شروع کی۔ میں نے آج تک کسی پردہ نشین عورت کو اتنی پُر زور تقریر کرتے ہوئے دیکھا نہ تھا گویا علیؑ بن ابی طالبؑ کھڑے ہوئے تقریر کر رہے تھے۔ انھوں نے لوگوں کی طرف سکوت کا اشارہ کیا جس کے ساتھ ہی ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ انھوں نے کہا:۔

"حمد کا مستحق خدا ہے اور صلوٰۃ و سلام میرے پدر بزرگوار محمد مصطفےٰ اور ان کی عترت کے ساتھ مخصوص ہے۔ اے اہلِ کوفہ، اے اہلِ مکر و دغا تم روتے ہو؟ خدا کرے ان آنسوؤں کو تھمنا نصیب نہ ہو اور ان نوحہ و فریاد کی آوازوں میں سکون نہ ہونے پائے (آپ کی تقریر کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ فرمایا) کیا تم سچ مچ آنسو بہاتے ہو اور ہچکیاں مار مار کر روتے ہو؟ بے شک تم اسی کے مستحق ہو جتنا ممکن ہو زیادہ رو۔ اور ہنسی کو کم آنے دو۔ تم سمجھے بھی کہ رسولِ خدا کے جگر کو کیسے تم نے چاک کر دیا۔ اور ان کے گھرانے کی کیسی عزیز خواتین کو تم نے بے پردہ کیا۔ اور ان کا کیسا خون تم نے زمین پر بہایا؟ اور ان کی کتنی بڑی ہتک حرمت تم نے کی؟ کیا تم کو اس پر تعجب ہے کہ آسمان سے خون برسا؟ یہ تو کچھ نہیں، آخرت کا عذاب بہت سخت ہے اور اس وقت تمہارا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اس چند روزہ مہلت کے زمانے سے مغرور نہ ہونا۔ خدا کو جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ نہ موقع نکلنے کا خوف ہے وہ یقیناً تمہاری تاک میں لگا رہتا ہے۔"

راوی ناقل ہے کہ میں نے لوگوں کو دیکھا بے ہوش و حواس دانتوں میں انگلیاں دبائے ہوئے رو رہے تھے۔ اور ایک بڈھے کو میں نے روتے ہوئے دیکھا وہ کہہ رہا تھا: میرے ماں باپ تم لوگوں پر نثار، تمہارے بڈھے تمام دنیا

کے بوڑھوں سے بہتر اور تمہارے جوان تمام جوانوں سے بہتر اور تمہاری عورتیں تمام عورتوں میں افضل و بہتر۔ اور تمہاری نسل تمام جہان کی نسل سے بہتر ہے نہ وہ کبھی ذلیل ہو سکتی ہے نہ رسوا۔"

پھر ام کلثوم نے ایک فصیح و بلیغ خطبہ کہا اور ان کے بعد فاطمہ بنت الحسین نے تقریر کی (الحمد للہ عدد الرمل والحصیٰ وزنۃ العرش الی الثریٰ)

یہ اس وقت کا تذکرہ ہے جب یہ قافلہ بے پردہ محمل و کجاوہ کے اندر کوفے میں جا رہا تھا یا دربار ابن زیاد میں لایا گیا تھا۔ لیکن اب ذرا آگے بڑھ کر دربار یزید پر ایک نظر ڈالو اور دیکھو یہ قافلہ اس دربار میں کس طرح لایا جاتا ہے۔

یزید سریر حکومت پر دو نشوں میں سرشار بیٹھا ہے۔ ایک نشہ شراب دوسرے نشہ فتح و ظفر۔ اور اس کے گرد خواتین بنی امیہ و بنی عبد الشمس ارکان دولت طلائی و نقرئی کرسیوں پر حریر و دیبا کے لباسوں میں ملبوس جمع ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں اور دولت و ثروت طرب و نشاط کا نقشہ کھنچا ہوا ہے۔ اس حالت میں خاندان رسالت کی عورتیں اور بچے رسیوں میں بندھے ہوئے دربار میں لائے جاتے ہیں۔ اس وقت یزید کے مسرت و نشاط کا پارہ ذرا اونچا ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس بات کی آرزو کرنے لگتا ہے کہ کاش جنگ بدر میں شیر اسلام کے ہاتھوں سے قتل ہونے والے اس کے بزرگ ہوتے اور وہ دیکھ لیتے کہ خاندان رسالت سے ان کا بدلہ کس طرح لیا گیا (لیت اشیاخی ببدر شھدوا الخ) یہ موقع وہ تھا کہ مستورہ صغریٰ زینب کبریٰ کھڑی ہوتی ہیں اور وہ تقریر شروع کی جس نے یزید کے تمام جاہ و جلال کی عمارت کو متزلزل کر دیا۔ ان الفاظ کو غور سے سنو اور دیکھو ان الفاظ اور ان کے معانی کی شان و شوکت اور پر زور طاقت کس طرح یزید کو اس کے تمام جبروت و ہیبت کے باوجود بے وقعت ثابت

کردیتی ہے۔ زینب سلام اللہ علیہا کھڑی ہو گئیں اور کہا۔ کتنا سچا ہے میرے پروردگار کا ارشاد (ثم کان عاقبۃ الذین اساؤوا السوئی ان کذبوا بایات اللہ وکانوا بہا یستھزؤن) آخر میں ان لوگوں کی جنہوں نے برے اعمال کیے یہ نوبت پہنچی کہ انہوں نے آیات خدا کی تکذیب کی، اور وہ ان کی ہنسی اڑاتے تھے۔" تو نے اے یزید کیا یہ گمان کیا کہ جب تو نے ہم پر زمین و آسمان کے تمام راستوں کو بند کر دیا اور ہماری حالت یہ پہنچی کہ تیرے سامنے قیدیوں کی طرح لائے جاتی تو اس سے خدا کی نظر میں ہماری حقارت اور تیری کچھ عزت ہو گئی اور یہ کہ تیری کامیابی تیرے رفعت مراتب کے باعث تھی؛ اس خیال سے تیری ناک چڑھ گئی اور تو خوش ہو ہو کر (غرور و تکبر کے ساتھ) اپنے شانوں پر نظر ڈالنے لگا جب تو نے دیکھ کر دنیا تیرے حکم کی پابند اور امور سلطنت منظم و مرتب ہیں اور ہماری سلطنت و حکومت تیرے لیے تمام خطرات سے صاف ہو گئی۔ کیا تو بھول گیا قول خدا کو کہ یہ خیال کریں، وہ لوگ جنہوں نے کفر اختیار کیا کہ ہم جو ان کو مہلت دیتے ہیں وہ ان کے لیے اچھی بات ہے۔ ہم تو ان کو مہلت دیتے ہیں اس لیے کہ وہ خوب دل کھول کر گناہ کریں اور آخر ان کے لیے حقارت آمیز سزا مقرر ہے، کیا انصاف کا اقتضا یہی ہے کہ تو اپنی عورتوں، کنیزوں کو تو پردے میں رکھے ہوئے ہے اور دختران رسول کو قیدیوں کی صورت میں دربدر پھرا رہا ہے پھر اس پر بڑی بے حیائی اور جرات کے ساتھ کہتا ہے (لا ھلوا واستھلوا فرحا) اگر بدر میں مارے جانے والے بزرگ اس کو دیکھتے تو خوشی کے مارے چیخ اٹھتے۔

تو اپنے بزرگوں کو بخیال خود پکارتا ہے، مگر نہیں تھوڑے ہی دنوں میں تو بھی انہی کے گھاٹ پر پہنچے گا اور یقیناً اس وقت تو آرزو کرے گا کہ کاش

تیرے ہاتھ شل اور زبان گنگ ہوتی اور تو نے جو کچھ کیا اس کو نہ کیا ہوتا اور جو کیا اس کو نہ کرتا۔ تیرے لیے اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ خدا فیصلہ کرنے والا اور محمد مصطفٰے تیرے مقابل میں مدعی اور روح الامین ان کی پشت پناہ اور مددگار ہوں گے۔ اس وقت ان لوگوں کو بھی جنہوں نے تیرے افعال کی تائید کی اور تیرا ساتھ دے کر مسلمانوں کی گردنوں پر سوار کیا معلوم ہوگا کہ ظالمین کو کیسا برا بدلہ دیا جاتا ہے۔"

کیا کسی مصور یا مضمون نگار کا قلم یزید کی حالت اور فتح وظفر کے باعث اس کے خوشی و نشاط اور غرور وتکبر کی تصویر بر موقع اس موثر انداز سے کھینچ سکتا ہے جس صورت سے زینب کبریٰ نے اس مختصر وقت میں کھینچی تھی؟ کیا کسی واعظ شیریں زبان اور مبلغ کی یہ طاقت تھی کہ وہ اس موقع پر یزید کے بڑھتے ہوئے سرکشی وتمرد کے جذبے کو اس صورت سے گھٹاتا؟

کیا اپنے طاقتور اور مالک تاج وتخت دشمن کے مقابل میں اپنی عظمت جاہ وجلال کا بیان اس وقت پر ممکن تھا کہ جب ظاہری اسباب کو دیکھتے ہوئے عزت واحترام کے تمام حیثیات مفقود اور ذلت واہانت کے تمام اقتضاءات موجود ہیں۔ یہ حق کی طاقت تھی جس نے اس وقت یزید کے سر کو خم کردیا۔ حضرت زینب نے اتنے ہی پر اکتفا نہیں کی بلکہ چاہا کہ خود اس کو اور اس کے ہم نشین اہل دربار کو حق کا جاہ وجلال اور باطل کی بے وقعتی اور کم قدری مجسم صورت سے دکھلا دیں اور یہ کہ کس طرح وہ جو حقیقت کی مالک ہستیاں قوت وسلطنت اور خوف وہیبت کے اسباب کی طرف ذرہ برابر پروا نہیں کرتیں۔ انھوں نے چاہا کہ خود یزید کو اس کی کم قدری اور بے حقیقتی، پست فطرتی اور بداخلاقی حسب ونسب کی پستی کا احساس کرا دیں اور دکھلا دیں کہ وہ تھا اس سے اجلال و

اصغر ہیں کہ اس سے بات تک کرنا پسند کریں، ارشاد ہوتا ہے:۔

"اگرچہ انقلابات زمانہ نے یہ نوبت پہنچا دی کہ میں تجھ سے بات کر رہی ہوں ہمارا کہ میں تیری قدر و منزلت کو بہت کم جانتی ہوں اور تیری توبیخ و سرزنش کو اپنے لیے بڑی مصیبت سمجھتی ہوں۔ لیکن کروں کیا کہ دل بھرا ہوتا ہے۔ اور کلیجہ میں آگ لگی ہے۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ خدا پرست افراد شیطان کی لشکر کے ہاتھ سے قتل ہوں!!"

اس کے بعد حضرت زینب نے چاہا کہ مریدی عمل پر فلسفۂ مظلومیت اور اس کے نتائج اور ہر ایک فتح میں شکست اور شکست میں فتح کا پہلو اور ظاہری اسباب کا انجام کی حیثیت سے معلوم نتیجہ واضح کر کے بیان کر دیں اور بتا دیں کہ مقصد میں کامیابی اور نتیجہ کی خوشگواری ان کے لیے تمام مشکلات کو آسان کیے ہوئے ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے کہ جس کے بیان میں اہل قلم بسیط سے بسیط مضامین لکھتے ہیں اور جس پر حسینی سیاست کی حقانیت و صداقت کا دار و مدار ہے۔ فرماتی ہیں: "اچھا! اے یزید جو کچھ تم ہے، تو کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھ اور اپنی پوری کوشش کو صرف، اپنی تمام جد و جہد کو ختم کر دے لیکن (یاد رکھ) خدا کی قسم تو ہمارے ذکر کو محو، ہماری زندگی کو فنا نہیں کر سکتا اور نہ ہمارے اصلی مقصد تک تو پہنچ سکتا ہے۔ اس واقعہ کا ننگ و عار تجھ پر قیامت تک باقی رہے گا اور تو کبھی اسکو دھو نہیں سکتا۔ تیری رائے یقیناً غلطی پر، تیرے ایام زندگی بہت محدود، تیرے اردگرد کا مجمع بہت جلد تتر بتر ہونے والا ہے، وہ دن بہت نزدیک ہے۔ جب منادی کی آواز بلند ہو گی الا لعنۃ اللہ علی الظالمین۔ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہمارے پیشرو بزرگوں کا انجام سعادت کے ساتھ اور ہمارے آخری بزرگ کا انجام شہادت و رحمت کے ساتھ مقرر کیا۔

اور وہ ہمارے لیے کافی اور بہترین مددگار ہے۔"

یہ مختصر اقتباسات ہے اس طویل خطبہ کے جو بلاغت و فصاحت کے اعتبار سے ایک معجزہ ہے۔ اس کے الفاظ کی طاقت اور عبارت کا لطف و انجام ہماری اردو زبان میں کہاں، ہم اس کے معنوی مفاد کو اپنے لفظوں میں پیش کر سکتے ہیں۔ کیا اس میں کوئی شک ہو سکتا ہے کہ اس تقریر کا ہر ہر فقرہ دیدہ کے لیے ہزار ہزار تلواروں اور تیروں کے زخم سے زیادہ سخت تھا اور کیا اس کا انکار کیا جا سکتا ہے کہ یہ خطبہ اور اس کے ایسے دیگر خطبے جن کو تاریخ نے ہم تک پہنچایا ہے یا نہیں وہ ہی ایسے پُر اثر تیر ثابت ہوئے جنہوں نے یزید اور بنی امیہ کے تخت حکومت کو الٹ کر ان کو نیست و نابود کر دیا۔

کیا واقعہ نہیں کہ امام حسینؑ اور ان کے انصار و آل سب کے قتل ہو چکنے کے بعد ان مخدراتِ عصمت کا ایسے لیے ہوں کی موقعوں پر قیام اور ان کے حقائق و واقعات سے لوگ خطبے نہ ہوتے تو حسینؑ کا قتل بالکل بے اثر اور ان کا خون رائگاں ہو جاتا۔ نہ اسلامی دنیا میں اس کی کوئی اہمیت ہوتی نہ کسی شخص میں جذبۂ انتقام پیدا ہوتا۔

ان کا قتل بالکل عبداللہ بن زبیر اور اس کے بھائی مصعب کے قتل کی صورت اختیار کر لیتا جس سے نہ کوئی مقصد حاصل ہوتا نہ اس کا بدلہ لیا گیا لیکن حسینؑ کے قتل نے عالم اسلامی میں آگ لگا دی۔ ان مخدرات عصمت کا قید سے رہا ہو کر مدینے پہنچنا تھا کہ اموی سلطنت میں انقلاب کے اسباب پیدا ہونے لگے۔ کوفہ میں جمعیت توابین سلیمان بن صرد خزاعی اور ان کے ساتھیوں سے لے کر بعد کے واقعات

سب یہی اثر کا نتیجہ تھے جو اہل حرم کے ورود کوفہ کے بعد سے لوگوں کے قلوب میں راسخ ہو گیا۔ یزید و ابن زیاد کو ایک دن بھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اموی سلطنت نیست و نابود ہوئی اور اس طرح کہ قیامت تک کوئی اس کا نام لیوا پیدا نہ ہو گا۔

حسینؑ بن علیؑ زندہ ہیں۔ ان کی تحریک بھی قیامت تک زندہ ہے لیکن یزید و ابن زیاد فنا ہوئے اور ان کے نام و نشان بھی ہمیشہ کے لیے محو ہو گئے اسی مقصد کی تکمیل کے لیے سید الشہداء اہل حرم کو اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور یہی وہ عظیم ربانی سیاست اور انجام بینی تھی جس نے ایک مرتب و منظم سلطنت کی بنیادوں کو چند روز کے اندر متزلزل کر دیا۔

دنیا نے حسینؑ کو اب تک نہیں پہچانا۔ وہ ان کے تدبر اور سیاسی سوجھ بوجھ کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے۔ وہ اہل حرم کے اس سفر میں اپنے ساتھ لانے کو ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کرتی ہے۔ لیکن تاریخی حقائق میں غور و فکر ایسے اعتراضات کو بادِ ہوا ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔

کربلا میں حسینؑ بن علیؑ کا طرزِ عمل عظیم حکم و اسرار کا سرمایہ دار تھا۔ دیکھنے کے لیے آنکھ اور سمجھنے کے لیے دل کی ضرورت ہے۔

ہلاکت اور شہادت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ۔

انسان کی زندگی کسی مقصد سے وابستہ ہے۔ جب تک اس کا تعین نہ ہو، اس وقت تک انسان کی قربانی کا صحیح مصرف متعین نہیں ہو سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ جتنا مقصد بلند ہو اتنی ہی اس میں بلندی اور جتنا مقصد پست ہو، اتنی ہی پستی ہوتی ہے۔

دنیا میں مختلف پیشے اور کاروبار ہیں۔ ہر ایک کا درجہ اس کے مقصد کے لحاظ سے ہے۔ معمار کا کام عمارت بنانا اور معلم کا کام علوم کی تدریس کرنا ہے۔ پہلے کا تعلق اینٹ گارے سے ہے اس کا مقصد پست ہے اس لئے تمام عقلاء کے نزدیک اس کا درجہ پست اور دوسرے کا کام علم کے جوہر سے آراستہ کرنا ہے۔ اس کا تعلق جوہر روح کے ساتھ ہے۔ جس کا درجہ بلند ہے۔ اس لئے خود اس کام کا درجہ بلند ہے۔

چونکہ مقصد خود ذریعہ سے اہم ہوتا ہے۔ اس لئے ہمیشہ مقصد سے ذریعہ پست ہوتا ہے۔ اس لئے اگر کسی نے زندگی کا مقصد نیچا رکھا ہے تو زندگی نیچے آ جائیگی اور اگر مقصد بلند رکھا ہے تو زندگی میں بلندی پیدا ہوگی

انسان نے عالم مشاہدہ میں کائنات کی چیزوں پر نظر کی، پہاڑوں کی بلندی کو دیکھا، سمجھا کہ یہ مجھ سے بالاتر ہیں اونچے اونچے درختوں کو دیکھا تو اپنے کو نارسا سمجھا۔ حیوان کے ساتھ بہت سی اپنی ضرورتوں کو وابستہ دیکھا تو اپنے کو ان کا مرہون احسان سمجھ لیا۔ اس طرح اس میں احساس کمتری پیدا ہو گیا۔ اور اپنے کو سب سے پست سمجھ لیا۔ اس کا اقتضا یہ ہے کہ یہ ان میں سے کسی کے استعمال کا حق نہیں رکھتا بلکہ وہ خود ان میں سے ہر شے کی خدمت کرنے کیلئے بس گیا۔ اسے اب تو پوری زندگی ان سب کی پوجا میں صرف کر دینا چاہئے۔ اس طرح اس کی نگاہ پست ہو گئی اور نگاہ کے ساتھ معیار اخلاق پست ہوا۔ بلندی اخلاق کے لئے ضرورت ہے کہ انسان کو اس کا صحیح درجہ بتایا جائے۔ اس طرح اس کے مقاصد حیات بلند ہوں گے اور پھر اس کی زندگی بھی بلند ہو جائے گی۔

اس کے لئے قرآن کریم نے افراد انسانی کو آواز دے کر بتایا خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا کرۂ عالم میں جتنی کائنات ہے وہ سب تمہارے لئے ہے پہاڑ کتنے ہی بڑے ہوں، درخت کتنے ہی بلند ہوں، حیوان کتنے ہی خیر و برکت کا سرچشمہ ہوں، تصرف کا حق ان سب میں تم کو ہے۔

اب جب تمام کائنات انسان کے لئے ہو گئی تو اسے احساس بلندی ہونا چاہئے۔ اب اس کا اقتضا یہ ہے کہ یہ پہاڑوں، درختوں اور حیوانات کے آگے نہ جھکے۔ یہ لا الٰہ کی منزل ہے یہاں پر تمام کائنات سے معبود ہونے کی نفی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک انسان پہنچ گیا۔ اب

انسان سے مافوق ہستی کا اگر تصور نہ ہو تو زندگی بے مقصد ہو گی اور غلط مقصد میں صرف ہونے والی زندگی ہی کی طرح اخلاقی طور پر بے مقصد زندگی بھی پست ہو گی۔

اپنے ہی کو اپنا مقصد اگر بنا لیا تو بے کاری، تن آسانی اور سہولت پسندی کی زندگی بسر ہو گی۔ اس کا نظریہ یہ ہو گا کہ عیش کرو، مزے سے زندگی بسر کرو اور ممکن سے ممکن تمام اور ہر طرح کے لذائذ نفس حاصل کرو۔ کیونکہ جو کچھ بھی ہو بس تم ہی ہو۔

اب اس نصب العین کی صورت میں تصادم ناگزیر ہے۔ کیونکہ مادرِ فطرت کے بطن سے کوئی ایک ہی فرد تو پیدا نہیں ہوا ہے۔ بلکہ افراد انسانی بکثرت ہیں۔ اب اگر نوعِ انسانی میں سے ہر فرد نے اپنے لطف اور لذتِ نفس ہی کو نصب العین قرار دے لیا تو ہر ایک کے جینے کی راہ میں دوسرے کی زندگی حائل ہو گی۔ اس طرح کوشش ہو گی کہ دوسرے کی زندگی سے اپنی زندگی کو مقدم رکھا جائے اور اس کا نتیجہ یہی ہے کہ قوی ضعیف کو اور دولت مند غریب کو کھا جائے۔ اپنے کو اپنا مقصد بنا لینے کا تقاضۂ عقلی یہی ہے کہ جو شخص اپنی ذات کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے اسے پہنچانا چاہئے اور جو نہیں فائدہ پہنچا سکتا وہ بدبخت ہے اور اسے استحقاقِ حیات ہی نہیں ہے اسی سے "طاقت حق ہے" کا نظریہ قائم ہوتا ہے۔

اس ذہنیت کا علاج صرف یہ ہے کہ انسان کو اس سے مافوق قوت کا تصور قائم کرایا جائے اور وہ قوت بھی ایسی جو تمام نوعِ انسانی سے یکساں تعلق رکھتی ہے۔ اب جب اس کی رضا ہی مطلوب ہو گی، جو تمام کائنات کا پروردگار ہے تو دوسرے کی زندگی کو بھی اپنی ہی زندگی کی طرح عزیز رکھنا ہو گا۔ اسی تصور کے سبب لا الٰہ کے بعد الا اللہ کی

منزل پر پہنچنا لازم ہے۔

اب سلسلہ یوں مرتب ہو گیا کہ سارے انسان سب انسانوں کے لئے اور خود انسان خالق انسان کے لئے ۔۔۔ پہلے جزو کو قرآن نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا "تمہارے لئے سب کو خلق کیا" اور دوسرے جزو کو بھی ان لفظوں میں کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ "جن و انس کی خلقت اس لئے ہے کہ وہ میری رضا جوئی کریں" اور کبھی اس طرح کہ قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

تمہارا قول یہ ہونا چاہیے۔ الفاظ نہیں بلکہ معتقد، نظریہ اور اصول کے معنی میں۔ یعنی تمہارا اصول زندگی یہ ہونا چاہیے کہ میری زندگی اور موت سب اللہ کے لئے ہے۔ جب اللہ کے لئے ہے تو اللہ کے کام میں صرف ہونا چاہیے مگر اللہ کا کام خود اس کی ذات سے وابستہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ غنی مطلق ہے۔ بلکہ یہ کام اس کی مخلوق ہی سے وابستہ ہوگا۔ ان سب کا مفاد جن کا اللہ سے رشتہ ہے اللہ کا کام ہوگا۔ اسی لئے مَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ کہنے کے بعد رب العالمین کا لفظ کہا یعنی اللہ کا وصف یہ بیان کیا گیا کہ وہ تمام عالمین کا پروردگار ہے، اور اس طرح یہ پیرایہ حقوق انسانی کے تحفظ کیلئے قربانی کا تصور پیدا کیا جبکہ یہود نے یہ خیال قائم کر لیا تھا کہ اللہ ہمارا ہے اور کسی کا نہیں۔ وہ کہتے تھے کہ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ "ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں" مگر مسلمانوں کو تعلیم دی گئی کہ وہ کہیں هُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ وَلَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ "وہ ہمارا بھی پروردگار ہے تمہارا بھی پروردگار ہے۔ ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال"

اسی وسعت کو رب العالمین کے لفظ سے ظاہر کیا گیا کہ وہ تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ اس صورت میں اس کے مقاصد بھی محدود نہیں ہو سکتے۔ اس کو ہر ایک کا فائدہ منظور ہوگا۔ اب اگر انسان نے خالق کی رضا کیلئے اس کے مخلوق کو کوئی اہم فائدہ پہنچانے میں جان دیدی تو یہ اس کی راہ میں قربانی قرار پائے گی۔

انسان کی زندگی فقط اپنے لئے ہوتی تو ایثار اور قربانی کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا۔ جیسا کہ موجودہ زمانے میں زندگی کا نعرہ شدت سے لگایا جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جیتے جی کون ہوگا جو روٹی کی اہمیت سے انکار کرے گو یاد رہے کہ روٹی کی اہمیت ذریعہ حیات کی حد تک ہے اور صاف بات ہے کہ مقصد ذریعے سے اشرف ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ روٹی کی اہمیت سے زیادہ خود حیات کی اہمیت ہے۔ اب اگر ہماری حیات کا بھی کوئی مقصد ہے تو یہ مقصد خود حیات سے زیادہ مقدم ہوگا۔ پھر روٹی سے مقدم کیونکر نہ ہوگا۔ لہٰذا روٹی کی اہمیت ضرور ہے مگر اس حد تک کہ مقصد حیات کو نقصان نہ پہنچے۔ لیکن اگر روٹی کا حصول مقصد حیات کے پامال کر دینے سے وابستہ ہو جائے تو وہ روٹی کا خیال ترک کر دینے کے قابل ہے۔ اسی سے حلال اور حرام کی تفریق بھی پیدا ہوتی ہے۔ کون ذریعہ معاش حلال ہے اور کون ذریعہ معاش حرام۔ ایک مزدور کا پسینہ ایڑی تک بہا کر بھی روٹی کماتا ہے اور ایک چور اور ڈاکو بھی محنت سے روٹی حاصل کرتا ہے۔ مگر وہ روٹی مقصد حیات کے ساتھ سازگار ہے اور یہ نہیں ہے اس لئے وہ حلال ہے اور یہ حرام۔

مگر روٹی زندگی اور مقصد زندگی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی جگہ پر رہے تو روٹی والے نظام اور مذہب سے کسی اصولی تصادم کا

سوال پیدا نہ ہو۔

"خوردن برائے زیستن" بالکل درست ہے مگر زیستن برائے چہ؟ یہی ایک مستقل سوال ہے۔ دنیا کا کوئی بھی اقتصادی نظام ہو وہ پہلے ہی مرحلہ کی تنظیم کرتا ہے اور مذہب دوسرے مرحلہ کی رہنمائی کرتا ہے۔

وہ غذا جس کے کھانے سے آدمی مر جائے گا۔ یہ تو جینے والی غذا چونکہ ذریعہ ہونے کے بجائے منفی حیات ہے اس لئے نظر انداز کرنے کے قابل ہے۔ اسی طرح جینے والی وہ زندگی۔ جو مقاصد حیات کے لئے تباہ کن ہو نظر انداز کرنے کی مستحق ہو گی۔

ضبط نفس، صبر و تحمل، قناعت، ایثار اور قربانی کا سنگ بنیاد یہی تفریق ہے کہ کچھ چیزیں انسان کی خاطر ہیں اور کوئی چیز وہ ہوتی ہے جس کی خاطر انسان ہے۔ جب انسان ان مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی یا زندگی سے وابستہ کسی چیز کو ترک دیتا ہے تو اس کا نام ہوتا ہے قربانی اور اسی زندگی سے ہاتھ دھونے کا نام ہوتا ہے "شہادت"

اس طرح قربان ہونے والا ظاہر میں فنا ہوتا ہے مگر حقیقت میں وہ زندگی جاوید حاصل کرتا ہے اور یہ انسان سے مخصوص نہیں، بلکہ تمام نظام کائنات اسی قربانی پر قائم ہے۔

زمین جمادات میں داخل ہے۔ بے جان چیز ہے مگر یہ زمین دو قسم کی ہوتی ہے ایک کو کہتے ہیں زمین مردہ اور دوسری کو زمین زندہ۔ مردہ زمین وہ اوسر یا بنجر زمین ہے جس میں نباتات کے پیدا کرنے کی صلاحیت نہ ہو اور زمین زندہ وہ ہے جس میں نشو و نما کی طاقت ہو تھوڑے سے بیج بو دئیے اور ان سے ایک ایسا سایہ دار درخت ہو گیا جو ایک قافلہ کو اپنی چھاؤں میں پناہ دے سکتا ہے اور تھوڑے سے دانے پھر زمین کے

انسان سے ایک لمبا چوڑا کھیت ہو گیا۔ جو ایک خاندان کی پرورش کر سکتا ہے اس نشوونما کا راز کیا ہے۔ اس کے متعلق تحقیقات کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ خود زمین میں قدرت نے ایسے اجزاء ودیعت کر رکھے ہیں جو اپنے سے فائق یعنی نباتات کے جزو بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ زمین ان اجزاء کو امانتداری کے ساتھ محفوظ رکھتی ہے کسی حقدار کے آنے کے انتظار میں جب وہ حقدار آجاتا ہے تو زمین ان اجزاء کو اس کی خاطر نذر کر دیتی ہے پھر کچھ نمی ہوا سے کچھ نمی آب سے اور کچھ نمی آفتاب سے۔ اجزاء شریک ہوتے جاتے ہیں مگر بنیادی اجزاء وہی ہیں جو زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب یہ زمین کے ذرات اپنے محدود وجود میں فنا ہو گئے یعنی کہ خاک میں وہ نہ رہے گئے لیکن یہ فنا بلند تر بقاء کا ذریعہ ہوئی۔ وہ زمین مردہ ہے جس میں اس قربانی کی صلاحیت نہ ہو اور وہ زمین زندہ ہے جس میں اس ایثار کی گنجائش ہو۔

اس کے بعد یہ درختوں کے پتے، یہ سبزہ، یہ پھل پھول کیا چھوڑ دیئے جائیں تو ایک ہی حالت پر رہیں گے؟ کبھی نہیں، تمازت آفتاب اور موسم اللہ کچھ نہ ہو تو انتشار و ناشر سے ختم ہو جائیں گے اور اسی صورتوں سے ختم ہوں تو خاتمہ ہی ہے لیکن اگر کسی جاندار کی غذا بن جائیں تو فنا تو ہوئے لیکن یہ فنا ایک بلند تر بقاء کا ذریعہ ہے۔ یعنی اب وہ ایک جاندار کے جسم میں لہو بن کر دوڑنے لگے۔

یہاں تک تو مختلف مذاہب کو کوئی اختلاف نہیں، یعنی جمادات نباتات کی خاطر اور نباتات حیوانات کی خاطر قربان ہوں تو کسی کو اعتراض نہیں مگر اس کے بعد ہے حیوان اور انسان کی منزل۔ یہاں پہنچ کر بعض جماعتوں میں جذبۂ ترحم پیدا ہو جاتا ہے اور وہ حیوان کی قربانی کو انسان کی

خاطر ظلم قرار دیتے ہیں

جہاں تک جذبات کا تعلق ہے بلاشبہ یہ رحم کا جذبہ قابل قدر ہے بشرطیکہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ جو جانور کی جان لینا پسند نہیں کرتا وہ انسان کی جان لینا کبھی گوارا کر سکتا ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اصول جذبات سے پابند نہیں ہوتے۔ یہ سنجیدگی سے طے کرنے کی بات ہے کہ انسان دیگر حیوانات سے بالاتر ہے یا نہیں اور جبکہ یہ بالاتر یقیناً ہے تو جمادات، نباتات کے کام آنے میں ظلم نہیں ہوا، نباتات حیوانات کے غذا بنے ہوئے ظلم نہیں ہوا تو پھر اگر حیوان انسان کے کام آئے تو کیوں ظلم قرار پائے گا؟

ممکن ہے اس کے جواب میں یہ کہا جائے کہ زمین اور درختوں میں احساس نہیں ہے۔ حیوان میں احساس ہے اس لئے یہ ظلم ہے مگر میں کہتا ہوں کہ کیا ظلم کا معیار احساس تکلیف ہے؟ یعنی قاتل مقتول کو اس کے بیہوش و حواس کی حالت میں قتل کرے تو جرم ہو گا اور اگر بیہوشی یا کلوروفارم کی حالت میں قتل کرے تو جرم نہ ہو گا؟ یہ قطعاً غلط ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم میں شعور یا احساس کی کوئی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ظلم کا معیار اقدام ناحق ہے۔ وہ اقدام ناحق باشعور کے ساتھ ہو تو ظلم ہو گا اور بے شعور کے ساتھ ہو تو ظلم ہو گا۔ لہٰذا اگر پست کا بلند کے کام آنا ظلم ہے تو زمین میں کھیتی کرنا بھی ظلم ہے نباتات سے غذا حاصل کرنا بھی ظلم ہے۔ اور اگر پست کا بلند کے کام آنا ظلم نہیں ہے بلکہ اس کے مقصد وجود کی تکمیل ہے تو پھر حیوان کی قربانی کو ظلم نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اسلام اس حیوان کو بھی جس کی قربانی ہو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے مُردہ نہیں قرار دیتا۔ یعنی اگر اپنی موت سے مرتا تو وہ میتہ (مردہ) ہوتا لیکن جب اپنے سے بالاتر یعنی انسان کے کام میں آنے کے قابل بنا تو حالانکہ وہ مر گیا ہے مگر اس کا نام میتہ نہیں بلکہ ذبیحہ ہے

اور صرف نام کا فرق نہیں بلکہ احکام کا بھی فرق ہے - اگر مُردہ ہو
تو نجس یعنی زندگی میں وہ جانور پاک تھا - مگر اب مرنے سے نجس ہو
گیا - لیکن اگر ذبیحہ ہے تو پاک ہے - اور وہی اجزا پاک نہیں جو زندگی
میں پاک تھے بلکہ خون متعارف بہنے کے بعد جو خون اجزائے گوشت میں
پیوست رہ جائے وہ خون بھی پاک و حلال ہے یہی فرق ہے اپنے سے
افضل کی خاطر قربان ہونے کی - پھر جبکہ حیوان اپنے سے بلند کے کام آئے
تو وہ مُردہ نہیں ہے تو انسان بھلا جب اپنے سے بلند کے کام آئے تو مردہ
ہوگا؟ ناممکن ہے - بے شک وہ جسمانی حیثیت سے مرگیا - لیکن اگر وہ اپنی
موت مرتا تو میت ہوتا اور جب اس نے اپنے سے بالاتر کی خاطر جان دی تو
اب وہ میت نہیں ہے - بلکہ شہید ہے اور فقط نام کا فرق نہیں بلکہ احکام کا بھی
فرق ہے - اگر میت ہے تو نجس یعنی کتنا ہی صاحب طہارت، جبکہ مرتبہ انسان
ہو مرنے کے بعد اس کا جسم شریعت اسلامی کی رو سے نجس قرار پاتا ہے
اسی نجاست کے دور کرنے کے لئے غسل میت قرار دیا گیا ہے جب غسل
ہوگا تب جسم پاک ہوگا - لیکن اگر شہید ہے تو مرنے کے بعد غسل کی ضرورت نہیں ہے
اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں نجاست کا گذر ہوا ہی نہیں - بلکہ کفن کی بھی ضرورت
نہیں اور لباس سے معرکہ جنگ میں بہے ہوئے خون کے چھڑانے اور کپڑے
کو پاک و صاف کرنے کی بھی ضرورت نہیں - اسی خون بھرے لباس میں دفن
کر دینا چاہئے - کیونکہ خون مردانِ راہ خدا کی زینت ہے -

مگر یہ درجہ جس کا نام شہادت ہے اسی وقت حاصل ہوگا کہ جب اپنے سے
بالاتر کی خاطر جان دی جائے لیکن دنیا والے عموماً جن جن چیزوں کی خاطر
جان دیا کرتے ہیں - وہ سب پست ہیں مثلاً دولت کے لئے اگر جان دی تو دولت
کیا چیز ہے - انسان سے کئی درجے پست - اصل دولت کا معیار نقد ہے یعنی

سونا ۔ جس ملک کے پاس سونا زیادہ وہ ملک مالدار ۔ یہ کاغذ (نوٹ) تو قیمتی
اس وقت ہے کہ جب اس کے بدلے کا سونا محفوظ ہو ۔ اب سونا کہ جو
اصل دولت ہے وہ حقیقت و اصلیت میں کیا چیز ہے، جو ٹھوکروں میں آنے
والے پتھروں یعنی جمادات، جسے قسمت نے ذرا شوخ رنگ کا بنا دیا ۔ اسے
دنیا اصل دولت و ثروت تصور کرنے لگی، اسے قیمتی کہا جانے لگا کیونکہ قیمتی ہونے کا
معیار اس بازار دنیا میں کسی شے کا کارآمد ہونا نہیں بلکہ کمیاب ہونا ہے
حالانکہ خالق حکیم کے نظام فطرت میں جو شے کمیاب ہے وہ زندگی کے لئے
بیکار ہے ۔ اس نے جو شے زیادہ ضروری ہے اتنی ہی زیادہ پیدا کی ہے، سب
سے پہلی ضروری چیز زندگی کے لئے ہوا ہے، وہ سب سے زیادہ پیدا
کی گئی اور ہر جگہ ۔ یہاں تک کہ اگر ہم اس سے بھاگنا بھی چاہیں تو وہ ساتھ
نہ چھوڑے گی ۔ دوسرے درجہ پر حیات کیلئے ضروری پانی ہے تو وہ پیدا بھی
اسی تناسب سے کیا گیا ۔ وہ موجود ہر جگہ ہے مگر محتاج نزول ہے ۔ ہوا کے
حاصل کرنے کے لئے ڈول رسی کی ضرورت نہیں بلکہ خود ہوا سے نظام حیات
میں تنفس کی آمد و شد ہی موضوع ہو کے جذب اور فاسد کے رفع کا کام دیتی ہے
اس طرح ضرورت حیات کی تکمیل کو جزو حیات بنا دیا گیا ہے مگر پانی کو حاصل
کرنے کیلئے کچھ نہ کچھ سعی و عمل کی ضرورت ہے کیونکہ بغیر ہوا کے ہم تھوڑی دیر
بھی زندہ نہیں رہ سکتے ۔ لیکن پانی کئی وقت بھی نہ ملے تو زندہ رہ سکتے ہیں
تیسرے درجہ پر غذا ہے اس لئے غذا کی خلقت بھی اسی صورت پر ہوئی پانی کے
حصول سے زیادہ اس کی پیداوار زراعت کی محتاج قرار دی گئی ۔ جو چیزیں روز مرہ
کے ضروریات سے بالکل غیر متعلق اور اس حیثیت سے بیکار تھیں انہیں
پہاڑوں کے تہہ میں دبا دیا ۔ سمندر کے تہہ میں چھپا دیا ۔ مگر یہ انسان کا معیار
انتخاب ہے کہ وہ جب کہ کتنا ہی خونریزی کر کے ان نعمت اشیاء کو حاصل کر

لیا ہے تو انسان کو سب سے زیادہ قیمتی قرار دے لیا ہے اور ضروریات زندگی کی چیزیں اس کے نزدیک کم قیمت ہیں اسی لئے تو فیض خلاق نے انہیں کثرت کے ساتھ پیدا کر دیا ہے۔ مگر اصل قیمت کا علم اس وقت ہوتا ہے جب ضروری حیات چیز کسی وقت کمیاب ہو جاتی ہے مثلاً وہ لق صحرا ہو اور خزانہ پاس ہو مگر پانی نایاب ہو اس وقت دیکھئے کہ خزانہ زیادہ قیمتی ہے یا پانی۔ اسی دولت کی خاطر جو حقیقت کے لحاظ سے بے قیمت شے ہے انسان جان دے دیتا ہے تو یہ جو ہر نفس انسانی کی قربانی اپنے سے پست شے کے لئے ہوئی جو حماقت میں داخل ہے یہ قربانی مقتضائے فطرت کے خلاف ہے کیونکہ سنت کائنات یہ ہے کہ پست بلند کی خاطر قربان ہو اور چونکہ شریعت مقتضائے فطرت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ جان دینا انسان کیلئے جرم ہے۔ اس کا نام ہے "ہلاکت"

اسی طرح کچھ لوگ شہرت کی خاطر جان دیتے ہیں جو کوئی اہمیت رکھنے والی چیز ہی نہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ سلطنت کی خاطر جو بالکل اعتباری شے ہے جب تک لوگ سمجھ رہے ہیں بادشاہ ہے اور لوگوں نے سمجھنا چھوڑ دیا تو آدمی وہی ہے مگر بادشاہ نہیں رہا۔

اسی طرح وہ جس کے لئے بانداری کا دلالت میں جان دینے اور مرنے کا تصور ہو گیا ہے یعنی کسی جمال فانی پر قربان ہونا تو اس سے بقا کیونکر ملے گی۔ جب مرکز قربانی خود فانی ہے تو اس کی خاطر جان دینا تو فنا در فنا ہو گا۔ بقا اس وقت مل سکتی تھی جب فنا کی انتہاء ہوتی۔

یہ سب خود اپنی قیمت نہ جاننے کا نتیجہ ہے کہ آدمی اپنے کو ایسی پست چیز پر قربان کر دے۔ اس قربانی کو شہادت نہیں کہہ سکتے

یہ عوام کی غلط ذہنیت ہے کہ وہ زمین پر بہتے ہوئے خون اور خشک و تر زمین میں غلطاں لاش کو دیکھ کر شہید سمجھ لیتے ہیں اور اس کے مدفن کو شہید کا مزار قرار دے لیتے ہیں۔ شہادت کا تعلق مقصد کی بلندی کے ساتھ ہے۔ انسان کو مقصد قربانی انسان سے ارفع قرار دینا لازم ہے اگر وہ پست مقصد کی خاطر جان دیگا تو وہ ہلاکت کا مصداق ہو گا۔ شہادت کا نہیں۔

عالم ممکنات میں ہر شے انسان سے پست ہے۔ اس سے بالاتر صرف خالق کائنات کی ذات ہے اس لئے اس کی قربانی شہادت اسی وقت ہو گی کہ جب خالق کے ساتھ وابستہ ہو۔ اسی لئے قرآن مجید نے شہدائے حیات جاویدانی کی نوید دیتے ہوئے صرف قتلی نہیں کہا جس کے معنی یہ ہوتے کہ جو قتل ہو جائیں انہیں مردہ نہ سمجھو بلکہ قید لگائی کہ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ۔ معلوم ہوا کہ حیات جاودانی اسی وقت ملے گی کہ جب مقصد قربانی اللہ کی طرف راجع ہو۔

مگر یہاں ذہن کو ایک دشواری محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ جو بھی کسی دوسرے کے لئے قربان ہوتا ہے تو وہ دو مراتب رکھتا ہے۔ محتاج اور مرکز امکانات۔ جب ہی قربانی کا تصور درست ہوتا ہے۔ مثلاً زمین پھولوں کے کام آئی تو پودے محتاج تھے۔ وہ ضرورت زمین سے پوری ہوئی اس لئے یہ نباتات کے کام آئے۔ حیوانات محتاج غذا تھے۔ اگر غذا نہ ملتی تو وہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ نباتات نے اس ضرورت کو پورا کیا اور اسی طرح حیوان کی قربانی انسان کے لئے ہوئی۔ کیونکہ انسان بھی غذا کا محتاج تھا۔ حیوانات و نباتات سے وہ ضرورت پوری ہوئی لہٰذا قربانی کا تصور صحیح ہوا مگر انسان سے ارفع جو ذات ہے وہ غنی بالذات ہے اللہ

فنا و تلف سے بری ہے پھر اس کے لئے قربانی کا اعلان کس طرح صحیح!
مگر قرآن مجید نے اس مشکل کو ایک لفظ سے حل کیا ہے۔ مقصدِ قربانی کے اظہار کے لئے ارشاد ہوتا ہے۔ "فی سبیل اللہ" "راہِ خدا میں" ظاہر ہے کہ راستہ عین منزل نہیں ہوتا۔ راستہ ادھر ہوتا ہے، منزل ادھر ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصد قربانی ذات الٰہی نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جو اسے پسند ہیں۔ ان مقاصد کے لئے جان دی جائے تو "شہادت" قرار پائے گی اور جو پست مقاصد کے لئے جان دی جائے وہ "ہلاکت" ہے اسے زیادہ صاف لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے، کہ ہلاکت اور شہادت کے مابین دو درجوں کا فرق ہے اس لئے کہ درمیان کی منزل گویا جیسے فطری موت کہ جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص مقصد کی خاطر باختیار جان نہیں دی بلکہ بیمار ہوئے، کوئی اتفاقی حادثہ پیش آیا، یا عمر طبیعی پوری ہو گئی۔ مر گئے۔ یہ درمیانی کا درجہ ہے۔ بایں معنی کہ اس میں نہ ترقی ہے نہ تنزل، نہ ثواب اور نہ عذاب۔

غلط فہمی نہ ہو۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ اعمال کا ثواب و عذاب نہ ہوگا بلکہ یہ مطلب ہے کہ اس موت کا کوئی ثواب یا عذاب نہیں۔ نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیوں مر گئے اور نہ یہ کہ بڑا کام کیا مر گئے۔ یعنی نہ ملامت و شکریہ یہ تو ہوئی وسط کی منزل۔ اس کے نیچے ہے ہلاکت یعنی باختیار پست مقصد کی خاطر جان دینا اس میں عذاب ہے اور اس کے اوپر ہے شہادت یعنی باختیار بلند مقصد کے لئے جان دینا جس میں حیات جاودانی ہے اور مستحق قرار اجر و ثواب۔

اب جس وقت کہ ہلاکت اور شہادت میں اتنا بڑا فرق ہے، تو کسی شہید راہِ خدا کے اقدامات عمل کے مقابل میں یہ آیت پیش کرنا

ہرگز درست نہیں ہے کہ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (یعنی
اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو)۔

یہ سوال بھی درست نہ ہوگا۔ کہ قرآن میں ہلاکت کی طرف جانے سے روکا ہے پھر حضرت امام حسینؑ جانتے تھے کہ کربلا میں کیا ہوگا۔ تو عراق کی طرف کس لئے گئے؟ یا جانتے تھے کہ میدان میں تیر ستم کا اندیشہ ہے، تو علی اصغرؑ کو کیوں لے گئے۔ یا جانتے تھے کہ آپ اور آپ کے تمام ساتھ والے مجاہدین شہید ہو جائیں گے تو اہل حرم کو اپنے ساتھ کیوں لے گئے

یہ سوال بالکل غلط ہے۔ اس لئے کہ قرآن نے جو روکا ہے وہ ہلاکت کی طرف جانے سے روکا ہے۔ شہادت کی طرف جانے سے نہیں منزل شہادت کی طرف جانے والا خطرہ کو سمجھتا ہے اور اگر خطرہ محسوس نہ کرے تو صبر و ثباتِ قدم کی قیمت ہی کیا ہوگی۔ وہ اتفاقی حادثہ قرار پائے گا۔ مگر وہ نگاہ فرض شناس کی ترازو میں جان اور مقصد کی اہمیت کا موازنہ کرتا ہے اور پھر مقصد کو جان کے مقابل میں ترجیح دے کر بقصد اختیار آگے بڑھتا ہے۔ اس کا نام ہوتا ہے "شہادت"

اب یہ ہمت دل اور مقصد کی بلندی کے مراتب ہیں کہ کوئی اپنی ہی جان دے اور کوئی اپنے دل کے ٹکڑوں کو، وابستہ افراد کو اور اپنے سے متعلق ہر عزیز چیز کو مقصد پر نثار کر دے۔

واقعہ کربلا اس باب میں منفرد نظر آتا ہے۔ ہر معرکہ میں گن کر کے بتا سکتے ہیں کہ یہ قربانی پیش کی گئی۔ لیکن کربلا میں تو یہ سوچنا ہے کہ کیا چیز نہیں قربان کی گئی۔ یہاں جو بھی شے کسی شخص کو عزیز ہو سکتی ہے۔ وہ مقصد کی راہ میں نثار کر دی گئی بلکہ حضرت امام حسینؑ نے خیمہ انتظام کیا کہ قربانی آپ کی زندگی تک محدود نہ رہے آپ اپنے ساتھ ایک قربانیوں کا لشکر

لئے گئے جو عصر کے ہنگام تک جہاد کرتا رہا۔ اور ایک قربانیوں کا خارجی تقاضا رہ گئے تھے جن کا جہاد عصر کے بعد سے شروع ہوا دنیا والے کہتے تھے کہ آپ جانتے ہیں کہ عمداً اہل و عیال کو کیوں لئے جا رہے ہیں۔ مگر حضرت امام حسینؑ تو اپنی قربانی کو مقصد کی بلندی کے مطابق رکھنا چاہتے تھے۔ آپ محسوس فرماتے تھے کہ اسلامی احساسات پر کتنی شدید غشی چھائی ہوئی ہے اور اس کے لئے کتنے تیر چھبنے کی ضرورت ہے۔ آپ کو دشمنوں کی شقاوت کا بھی صحیح اندازہ تھا اور اس کے نتائج بھی پوری طرح پیش نظر تھے اور اس سب کا لحاظ کرتے ہوئے آپ نے اپنی قربانی کے اجزاء مرتب فرمائے تھے جو مقصد الٰہی کے تحفظ کے لئے ضروری تھے۔

اب واقعہ کربلا کی روشنی میں ہلاکت اور شہادت کا فرق بہت صاف محسوس ہو جاتا ہے۔ ادھر کم از کم تیس ہزار لشکر اور صرف بہتر یا زیادہ سے زیادہ سو ڈیڑھ سو۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ادھر والے بالکل مطمئن تھے۔ نہیں وہ بھی جانیں دے رہے تھے ان میں سے ہر فرد کو خطرہ کا احساس تھا۔ اس لئے کہ اس کے قبل کے بدر و احد اور خندق و خیبر یا پھر جمل و صفین اور نہروان کے تذکرے بھی دماغوں سے بالکل محو تو نہیں ہوئے تھے اور پھر ابھی قریب ہی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے کہ کوفہ ہی میں تنہا مسلم بن عقیلؑ نے جنگ میں وہ کارنمایاں انجام دیا کہ محمد بن اشعث کو اپنے ساتھ کافی جمعیت رکھتے ہوئے ابن زیاد سے کمک منگانا پڑی تھی اور جب ابن زیاد نے کہا کہ ایک آدمی کے مقابلے کے لئے اتنی فوج کیا کافی نہیں ہے۔ تو محمد بن اشعث نے جواب دیا کہ کیا مجھے کوفہ کے کسی بنیے بقال سے مقابلے کے لئے بھیجا ہے؟

اس سے یہ محمدؐ کی تلواروں میں ایک تلوار ہے۔ اب دیکھیے کہ کوفہ میں تو صرف
ایک تلوار تھی لیکن کربلا میں کم از کم اٹھارہ تلواریں تھیں اور جو انصار حسینیؑ
تھے وہ بھی کوئی معمولی افراد نہ تھے۔ ان کے لیے سرداران فوج یزید کے
یہ الفاظ تھے کہ یہ سب کوفہ کے مخصوص شہسوار ہیں جو ہمارے مقابلہ میں نبرد آزما
ہیں۔ یہی کا تعجب ہے کہ ان قلیل افراد کے قدم تو ایک دفعہ بھی پیچھے نہیں ہٹے
لیکن تیس ہزار فوج نے کئی مرتبہ میدان چھوڑا۔ اس کے بعد یہ ماننا ضروری
ہے کہ ادھر والے بھی جانیں دے رہے تھے۔ لیکن کاہے کے لیے؟
وہ مقصد ان کے سالار عمر سعد کے اس اعلان سے ظاہر ہے جو اس نے
تیر چلہ کمان میں جوڑتے ہوئے بلند آواز سے کہا تھا۔ اور فوج والوں کو
مخاطب کر کے کہا تھا کہ گواہ رہنا کہ پہلا تیر فوج حسینی کی طرف میں نے
رہا کیا ہے۔ بس واقعۂ کربلا کا پورا پس منظر اس ایک جملہ میں مضمر ہے
عمر سعد نے فوج والوں کو گواہ کیا ہے۔ کہاں کے لیے؟ دربار حکومت
میں گواہی دینے کے لیے۔ یعنی تمام کارنامہ کا مقصد حکومت وقت کی
رضا جوئی اور جاگیر و انعام کی ہوس ہے۔ اب اس راہ میں جو جانیں گئیں
اسے ہلاکت کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

دوسری طرف حضرت امام حسینؑ نے بھی ایک وقت اپنے عمل پہ
گواہی چاہی۔ وہ کب؟ جب فرزند جوان مرنے کے لیے روانہ ہو رہا تھا
بوقت رخصت علی اکبرؑ حسینؑ نے اٹھائے ہاتھ۔ بارگاہ الٰہی میں کہا
پروردگارا گواہ رہنا کہ اب وہ جا رہا ہے جو صورت و سیرت و رفتار اور
گفتار میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے۔ جب ہم مشتاق زیارت
رسولؐ ہوتے تھے تو اسی فرزند کو دیکھ لیتے تھے۔

چونکہ عمر سعد کا مقصد عمل خود واقعہ کا محرک نہیں تھا۔ اس لیے وہ عمل

کی گمراہیاں ودکار ہوئیں۔ لیکن حسینؓ کا مقصد قربانی خود ما فرد و منظر تھا۔ لہٰذا دوسرے کو گمراہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ خدا ہی کے سامنے اپنی واردات قلب پیش کر دی۔

یہ تھی وہ قربانی جو مرکزِ اصل کی خاطر پیش ہو رہی تھی۔ اس لئے وہ شہادت کا مصداق ہوئی جو حیات جاوید کی ضامن ہے۔

یوں تو اس حیاتِ جاوید اور اس کے بالمقابل فنا کی حقیقت ہی دوسری ہے۔ مگر ظاہری آثار کے اعتبار سے بھی دیکھئے تو کربلا میں ہلاک ہونے والے کتنے تھے۔ وہ یقیناً شہید ہونے والوں کی تعداد سے بہت زیادہ تھے۔ کیونکہ کربلا کے مجاہدین میں سے ہر ایک کے ہاتھ سے کئی کئی آدمی قتل ہوئے۔ بعض مجاہدین کے حال میں ہے کہ "ضجت الاعداء من کثرۃ القتل بینہم" فوج دشمن کثرتِ مقتولین سے چیخ اٹھی۔ مگر ان بے شمار مرنے والوں کا نام و نشان بھی قطعاً موجود نہیں۔ یہ ہے ہلاکت جس کا نتیجہ حقیقی معنی میں مٹ جانا ہے۔ اور امام حسینؓ کے ساتھ والے قیامت تک کی زندگی رکھتے ہیں یہاں تک کہ ۶ مہینے کی جان علی اصغر جو باپ کے ہاتھوں پر شہید ہو گئے ان کے لئے ان چھ مہینے کی زندگی اس مصرف میں صرف ہونے کے بعد اس طولانی حیات میں تبدیل ہو گئی جس کی کوئی انتہا ہی نہیں۔

یہ شہید ہونے والے ایسے تھے جنہوں نے مقصد کی بلندی کو دیکھ کر اپنی جانیں باختیار خود نذر کر دیں۔ شک کی گنجائش نہیں ہے۔ یقیناً باختیار۔ اسے یوں ہی دیکھ لیجئے کہ کربلا میں انکارِ بیعت جس وقت بھی اقرار سے بدل جاتا اسی وقت جانیں خطرہ سے محفوظ ہو جاتیں لیکن انکار انتہا تک رہا۔ بڑوں کا کیا ذکر کسی بچہ تک نے امام

سے نہیں کیا کریں اب مصائب نہیں اُٹھتے۔ اب بیعت کر لیجیے۔

یہاں تک کہ جب امام شہید ہو گئے اور اہلِ حرم رہ گئے۔ تو ان میں سے کبھی کسی کے ذہن میں بیعت کا خیال پیدا نہیں ہوا۔ یزید ظلم کرتے کرتے عاجز ہو گیا اور آخر میں جب احساسِ شکست ہوا تو پشیمانی کا اظہار کرنے لگا۔ لیکن حضرت امام حسینؑ کے بعد کسی ان کے یہاں کے غلام یا کنیز یا آج تک ان کے کسی نام لیوا تک کو پشیمانی نہیں ہوئی۔

وہ پشیمانی کیا تھی! اپنی موت کا احساس تھا۔ جس میں غلط مقصد میں کوشش کرنے والے کو مبتلا ہونا ہے۔ خواہ وہ کچھ عرصہ تک دنیا میں زندہ رہے تو وہ زندگی بھی اس کی موت ہے اور خواہ اس راستے پر مر جائے تو تب مرنا بھی ہلاکت ہے۔ جو دائمی ہے اور موت سے بدتر ہے۔

اور کارنامۂ حسینیؑ پر نازش و پائندگی کا سبب صرف حیاتِ جاودانی کا احساس ہے۔ جو شہادت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور جتنا شہادت کا مرتبہ رفیع ہوگا۔ اتنے ہی زندگی کے نقوش زیادہ نمایاں ہوں گے۔ جیسا کہ شہیدِ کربلا حضرت امام حسینؑ جو سید الشہداءؑ تھے۔ ان کی شہادت سے حاصل شدہ زندگی بھی ہر زندگی سے زیادہ درخشاں اور پائندہ ہے۔

واقعہ کربلا کی تبلیغی شان

حسینؑ بہ اعتبار خود ہر لحاظ سے ایک مبلغ مذہب تھا

کربلا مبلغ اعظم

کربلا کے مبلغ حضرت امام حسینؑ نے مدینہ سے لے کر کربلا تک
جو اقدام بھی کیا وہ تبلیغی شان لئے ہوئے تھا یہی وجہ ہے کہ
دنیا پر امام حسینؑ اور یزید کا کردار نہ صرف واضح ہو گیا بلکہ حق و باطل
میں امتیاز کرنے کا سامان مہیا ہو گیا

شبیر کا نشان قدم شمع بن گیا — انسانیت کی تیرہ و تاریک راہیں

جس وقت باطل کا پلہ بھاری ہو گیا تھا۔ مذہب کا چراغ جھلملا رہا تھا اور بجھنے کے قریب تھا، دین خدا کا نقشہ بگاڑ دیا گیا تھا اس طرح کہ پہچانا نہ جاتا تھا، معصیت پرستی کی آندھیاں چل رہی تھیں اور ملت حقہ کی کشتی باد مخالف کے تھپیڑوں سے ڈوبنے کے قریب تھی، ضرورت تھی ایک مبلغ مذہب اور داعی الٰہی کی جو ایک مرتبہ عالم کے سامنے حقیقت کو بے نقاب کر دے اور وہ پردے جو دنیا کی آنکھوں پر ڈال دیئے گئے ہیں۔ ان کو ہٹا دے روشن ہو سکے اسلامی صورت

(الف الحسینؑ)

حسین بن علیؑ کے سوا کون تھا جس کو اس فریضہ کا احساس ہوتا۔ کہ فرض تھی کہ وہ اپنی راحت و زندگی سے ہاتھ دھو کر اپنی جان کو خطرے میں ڈالے اور ملت اسلامیہ کی حفاظت کرے، بڑے بڑے عظماء اور صحابہ رسولؐ، ارباب طاقت

واقتدار یزید کی بیعت کر چکے تھے۔

شام سے لے کر مصر، مصر سے لے کر عراق، عراق سے حجاز، حجاز سے یمن سب اس نوجوان شہوت پرست بادشاہ کی حکومت کو تسلیم کر چکے تھے اور باوجود اس کے کہ یزید کے ننگِ انسانیت حرکات اور حیا سوز افعال سے کم سے کم شام، عراق، حجاز کا چپہ چپہ واقف تھا اور مصر بھی کچھ زیادہ اجنبیت نہ رکھتا تھا لیکن احساسات فنا اور غیرت و حمیت خیرباد کہہ کر رخصت ہو چکی تھی۔ شام کے حاکم کی مثال ایک ایسے گلہ بان کی تھی جس کے زیر اقتدار ایک کثیر جمعیت حیوانات کی ہو اور وہ ان کو اپنی مرضی کے موافق جس طرف چاہے لے جائے۔ حسین مختلف وجوہ سے حق رکھتے تھے کہ وہ ان حالات سے متاثر ہوں۔ خلافت الٰہیہ کے حقیقی مالک ہونے کی حیثیت سے قطع نظر کرو تب بھی اسلام اور ناموس شریعت کے مخصوص وارث ہونے کی جہت سے جو تعلق اسلام کو حسینؑ کی ذات سے تھا کسی اور ہستی سے وہ تعلق نہ ہو سکتا تھا چنانچہ امام حسینؑ نے اپنے فرض کا احساس کیا اور مدینے سے اس بات کا بیڑا اٹھا کر نکلے کہ دنیا کے سامنے حق کو حق اور باطل کو باطل ظاہر کر دیں اور اگرچہ ظاہری اسباب کی حیثیت سے امام نے اپنی جان کی حفاظت کے لیے مدینہ کو وداع کیا مگر حقیقتاً آپ انجام سے واقف تھے اور عظیم ترین فریضۂ تبلیغ کے ادا کرنے کے لیے اپنے عقبات کے پیچھے اور ثابت قدم رفقا کی جمعیت میں راستہ طے کر رہے تھے۔

حسین کی ہر نقل و حرکت اور جنبش و سکون میں تبلیغ مذہب کے اہم اسرار مضمر نظر آتے ہیں اور اگر ایک انتہا طرحی سے ان رموز پر غور کرے تو ایک مفصل کتاب لکھنے کا سامان فراہم ہو سکتا ہے۔

امام کا مکہ معظمہ میں قیام کرنا اصل نظر سے اس غرض سے ہے کہ اس مقام متبرک میں خون بہانا حرام ہے لہٰذا ان کی حفاظت دشمنوں کے خطرے سے محفوظ رہے گی۔ لیکن ہم اس مقصود کو ایسے شخص کے لیے تسلیم کر سکتے ہیں جس کو آخر تک اپنی جان بچانا منظور ہو مگر حسین کہ جو مرنے پر کمر باندھ چکے تھے اور پورے طور سے آخر

تک ہونے والے واقعات سے واقف تھے ان کی نسبت اس خیال کو کہاں تک وقعت دی جا سکتی ہے۔

مکہ معظمہ قلب جزیرۃ العرب اور مسلمانان اسلام کا مرکز تھا، اطراف و جوانب کے قافلے برابر آتے جاتے رہتے تھے اور علاوہ فریضۂ حج کے جو اسلامی شریعت کی رو سے ہر مسلمان پر واجب ہے اور جس کی بدولت شہر حج میں چاروں طرف سے مختلف ممالک عرب کا آنا ضروری ہے خود عرب کے قدیم روایات اور سابقہ علاوہ آمد کی وجہ سے جو صدیوں سے قائم تھا اور اسلام نے بھی جس کے باطل کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی عرب کے اس خطے کے تمام مختلف اجمالی قبائل عرب کا کل اجتماع ہوا لازمی تھا وہ مشہور بازار جو شہرہ آفاق اور خرید و فروخت وغیرہ کے عظیم مرکز تھے جن میں سے عکاظ، ذو المجاز اور سوق المجنہ خاص اہمیت رکھتے تھے، ذی القعدہ سے لے کر محرم تک مکہ، طائف اور مدینہ کے درمیان ہی قائم ہوا کرتے تھے۔

امام حسینؑ کی شخصیت دنیائے عرب میں کوئی اجنبیت نہ رکھتی تھی اگرچہ مذہبی احساسات مردہ ہو گئے ہوں اور حسین کو ان کے واقعی مراتب کے ساتھ لوگ نہ پہچانتے ہوں لیکن رسول کا نواسہ سلطان حجاز و عراق کا فرزند ملک عرب کا سب سے زیادہ سخی و جواد جس کے گھر سے کبھی کوئی سائل محروم نہیں پھرا، بنی ہاشم کا ننگ خاندان یہ عنوان رہے تھے جن سے کوئی بھی ناواقف نہ تھا اور کسی کو ان کے انکار کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔

حسین نے یہی زمانہ کہ جو تمام قبائل عرب کے اجتماع کا تھا، مکہ میں اپنے قیام کے لئے تجویز کیا، ہمارا مقصد اس سے یہ نہیں ہے کہ حسین اپنے لئے کوئی بڑا لشکر جمع کرنا چاہتے تھے اور ان قبائل عرب کے ساتھ رابطہ بڑھا کر اپنی حیثیت کو مضبوط بنا کر یزید سے مقابلہ کرنے کا خیال رکھتے تھے ہرگز نہیں۔ اگر حسینؑ ایسا چاہتے تو کر سکتے تھے اور مضبوط تحریک ہونے کی صورت میں ممکن نہ تھا کہ امام کیلئے لشکر

میں ایک بڑا لشکر جمع نہ ہو جائے، مکہ بالکل نزدیک تھا۔ جس کا اسلام بھی علی بن ابی طالب کا رہین منت تھا اور اس کی وجہ سے وہاں کے رہنے والوں کو علی بن ابی طالب اور ان کے گھرانے سے پوری ہمدردی حاصل تھی۔ طائف بھی کبھی ابداً رسول کا مخالف نہ تھا لیکن فرزند رسول کو عالمگیری اور جہانبانی کا شوق نہ تھا وہ آپ تیئں ایک عظیم بادشاہ تسلیم کرانے کی ہوس نہ رکھتے تھے۔

حسین کا قیام مکہ معظمہ میں صرف اس لئے تھا کہ افراد مسلمین کے اندر صورتحال کی طرف ایک توجہ پیدا ہو جائے گا اور کم از کم یزید کے افعال و اعمال کا چرچا ہونے لگے۔ حسین کے قتل کے لئے حجاج کے لباس میں شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے ہوں یا ان کو حضرت کے پابند زنجیر کر لینے کی ہدایت کی گئی ہو۔ بہرحال نہ معلوم اسباب ذیل کے تحت امام کا بیت الحرام سے رخصت ہو جانا اور زمانہ حج کے گزرنے کا انتظار بھی نہ کرنا اس کو امام کے تبلیغی مقاصد میں پورا دخل ہے۔

ایکا ایکی خلاف توقع حسین کا حج کو ترک کر دینا اور تمام اہل و عیال کے ساتھ مکہ معظمہ سے نکل کھڑا ہونا ایسی حالت میں کہ حج کا زمانہ بہت کم باقی تھا اس نے تمام قبائل عرب کے نمائندوں میں ایک ہربونگ ڈال دی اور اگر کوئی تاریخ اس موضوع کی قلمبند کی گئی ہوتی تو اس میں ضرور ملتا کہ اس موقع پر کن جذبات کا اظہار کیا جاتا تھا حسین بن علی کہاں چلے گئے؟ حج بھی نہیں کیا؟ آخر تمام اہل و عیال، اقربا کے ساتھ اپنے نانا کی قبر کے جوار کو کیوں چھوڑ دیا؟ (یزید کے خوف سے) کیوں؟ یزید کیا چاہتا ہے؟ (حسین سے بیعت کا طالب ہے) بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔ فرزند رسول یزید جیسے شراب خوار، زنا کار، فاسق و فاجر کی بیعت کرے؟ اچھا پھر مکہ معظمہ میں کیوں قیام کیا؟ کس لئے حج کو ترک کر دیا؟ (جان کا خطرہ تھا شاید مکہ میں حسین کے قتل کرنے کے لئے شام سے کچھ لوگ بھیجے گئے تھے) تو وہ قوم اس سے بڑھ کر سفاک اور ظالم کیا ہوگا کہ فرزند رسول کو حرم میں بھی چین نہ لینے دیا جائے۔

پیدا کیے وہ تھے جو مکہ معظمہ اور اس کے اطراف و جوانب میں اکثر با خبر
قبائل کے حلقوں میں بہت اہمیت کے ساتھ جاری ہے۔

وہ زمانہ کہ جب طرق مواصلات و مخابرات مسدود تھے۔ تار، ٹیلیفون وغیرہ
خبر رسانی کے ذرائع نایاب تھے اس سے بڑھ کر کوئی طریقہ واقعات کی اشاعت کا
نہیں ہو سکتا تھا کہ سے وہاں لوگ آتے جاتے رہتے تھے جو شخص تازہ اپنے
شہر میں آیا اس کو بھی تازہ واقعات کے ضمن میں حسین کی نقل و حرکت اور اس
کے اسباب و علل کا بیان کرنا ضروری تھا اس کا نتیجہ نہیں تھا کہ امام کے لئے
کوئی بڑا لشکر جمع ہو جائے جیسا کہ بعض محترم ارباب تصنیف کا خیال ہے بلکہ مطلب
صرف اتنا تھا کہ پہلے سے ان حالات کی اشاعت سے حسین کی شہادت زبان زد
میں نامعلوم اسباب و علل کا نتیجہ قرار نہ پائے کہ اہل اسلام کو اپنے دل سے اس کے
لئے مخصوص وجوہ تراشنے کا موقع مل جائے اور حسین کی مظلومیت و حقانیت
مخفی ہو جائے۔ یقیناً اگر امام کی طرف سے ان طرق نشر و اشاعت کو عمل میں
نہ لایا جاتا تو یزید کی طرف سے امام کی شہادت کو کس طرح کے لباس پہنائے جاتے
اور وہ لوگ جن کو افترا پردازی و فریب کاری میں خدا کا خوف نہ تھا اپنے مقصد
میں کامیاب ہونے کے لئے کسی واقعہ کو غلط وجوہ پر مبنی بتانے میں کب تامل
کر سکتے ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ حسین کا خون رائیگاں چلا جاتا۔ ایسی صورت میں آپ اپنی جان
بھی ہاتھ سے کھو دیتے اور کوئی ہمدردی بھی افراد بشر کے قلوب میں پیدا نہ کر جاتے
اور نہ وہ مقصد جو آپ کا تھا حاصل ہوتا مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ امام شہید کئے
اور پوری دنیا نے اس بات کو تسلیم کر لیا کہ وہ ناحق قتل کئے گئے۔ شام کا عالم اور
اس کے انسانیت کش فرزند اسلام کے ساتھ ... تہمت تراشنے کا موقع بھی نہ پا سکے
اس کو یوں تو شاید اسلام کی قوت ظاہرہ سے تعلق ہے حکومت کو حسین سے کد ہے
اور اپنے اسباب و علل شہادت کی نشر و اشاعت سے بھی تعلق ہے۔ حسین نے

اپنی نقل و حرکت کے وجوہ کو زندگی ہی سے عالم اسلام میں شائع کر کے دشمنوں کی زبانیں بند کر دیں اور اپنی مظلومی کے سامنے دنیا کے سر تسلیم کو خم کرا لیا اور اس سے بڑھ کر حقانیت کی تبلیغ اور کیا ہو سکتی ہے۔

حسین کا قافلہ خاموش مبلغ تھا

حج کا زمانہ تھا عراق، یمن، شام وغیرہ سب طرف سے قبائل مکہ میں آ رہے تھے ادھر امام حسین اپنے اہل و اقربا و انصار و اصحاب کی ایک کثیر جماعت کے ساتھ خیمہ و خرگاہ و تمام اسباب ساتھ لئے ایک قافلے کی صورت میں مکہ سے جا رہے تھے، عالم مسافرت میں زندگی گزارنے والے واقف ہیں کہ راستے میں چار پانچ آدمیوں کا قافلہ بھی نظر آئے تو تشویش ہوتی ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کہاں سے آتے ہیں، پھر کہاں امام حسین کا شاندار قافلہ اور اصحاب و اعوان کا مختصر لشکر اس پر طرہ یہ کہ حج کے دن باقی رہے ہوں مکہ معظمہ کی طرف سے آ رہا ہو جبکہ دنیا مکہ معظمہ کی طرف حج کے لئے متوجہ ہے یہ چیز یقیناً جاذب نظر اور باعث توجہ تھے اور ایک اجنبی شخص کو یہ پوچھنا ضروری تھا کہ یہ کس کا لشکر ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور حسین کا نام معلوم ہونے پر وہی سوالات جو ہم نے اس کے قبل درج کئے ہیں چنانچہ تاریخیں شاہد ہیں فرزدق کی ملاقات امام سے یونہی اتفاقی طور پر ہوئی تھی اور عبداللہ بن مطیع و عمر بن عبدالرحمن مخزومی بھی بلا توقع راستہ میں امام سے دو چار ہو گئے اور پھر جو گفتگو ہوئی وہ تاریخ میں محفوظ ہے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ حسین بن علی اور ہاشمی جوانوں کا شاندار قافلہ جو خانہ خدا کو چھوڑ کر جنگلوں میں راہ پیما تھا خود ایک خاموش مبلغ اور داعی حق تھا جو دور دور کے لوگوں کو تحقیق حالات اور کشف حقائق پر مجبور کر دیتا تھا۔

زمین کربلا پر امام کا خطبہ اور تبلیغ مذہب

راستے کے تمام اہم واقعات کو چھوڑ کے

ہوئے امام کی اس عظیم الشان تبلیغ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جو کربلا کی سرزمین
پر حسین سے ظاہر ہوئی وہ وقت کہ جب خون کے پیاسے دشمنوں نے چاروں
طرف سے امام کا راستہ بند کر دیا تھا اور تیس ہزار کے لشکر نے دین و مذہب
بلکہ انسانیت و غیرت کو خیرباد کہہ کر فرزند رسول کے قتل پر کمر باندھ لی تھی ان کا
اپنی گمراہی سے باز آنا ناممکن تھا اور حسین اس بات سے واقف تھے لیکن ایک
مبلغ مذہب اور داعی حق کا فریضہ ہے کہ وہ حق کی آواز کو بلند کرے اور
تبلیغ دعوت میں کوتاہی نہ کرے۔ امام نے اپنے حق کو خوب ادا کیا اطراف
جوانب کے رہنے والے بنی اسد جن کے حقیقت سے بے خبر ہونے کا احتمال ہو
سکتا تھا ان میں تبلیغ کے لئے شب عاشور اپنے مصاحب خاص حبیب ابن مظاہر
کو روانہ کیا اور ان کی تبلیغ کے اثر سے روشناس ہوئے اور اگرچہ وہ لوگ جو حسین کی
حمایت کے لئے حبیب کے ساتھ ہو گئے تھے۔ لشکر شام کے سد راہ ہو جانے سے امام
تک نہ پہنچ سکے لیکن ان کے دل پر حسین کی عظمت و منزلت اور ان کی حقانیت کا اثر
قائم ہو گیا تھا اور تبلیغ کی غرض اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوا کرتی۔ اسی کا نتیجہ
بعد میں دفن شہدا کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔ والسلام علی من [illegible]

عاشور کی صبح سے لیکر عصر تک کے واقعات اگر ہم لکھنا چاہیں تو یہ مضمون کافی
نہیں ہو سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حسین کی فوج کا ہر ایک نوجوان مبلغ کی حیثیت رکھتا تھا۔
بریر ہمدانی کا خطبہ حبیب ابن مظاہر کا مکالمہ، زہیر ابن قین کا بیان اور تمام انصار و اقربا
کے وہ رجز جن میں سے ہر ایک حسینی شہادت کے اسباب و علل بیان کرتے ہیں ایک مبلغ
کا حکم رکھتا تھا۔ اس کا اثر ظاہر ہوا۔ ہر ایک مبلغ کی کامیابی یہ نہیں ہے کہ اس کی
آواز پر لبیک کہنے والے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں بلکہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ
وہ سخت سے سخت موقعوں پر اور دشوار گذار منزلوں میں اپنے فریضہ کو ادا کرے اور جو حق
اظہار کا حق ہے اس کو پورا کر سکے۔ حر ابن یزید ریاحی کا لشکر چھوڑ کر راہ ہدایت پر
آنا بھی انہی مواعظ و تبلیغات کا اثر تھا۔

حسینی فوج کے تمام جوان داد شجاعت دے کر رخصت ہو چکے۔ ہاشمی خاندان کے شیر بھی اپنے بزرگ کی حمایت میں کام آ گئے صرف مظلوم حسینؑ باقی ہیں اور دشمنوں کا حلقہ ہے اور ان پر مصائب کا ہجوم اور آنکھوں میں دنیا تاریک ہے مگر وہ الٰہی مبلغ ربانی و داعی مذہب اپنے فریضہ سے ایک لحظہ کے لئے غافل نہیں ہے وہ خطبہ پڑھتا ہے تقریریں کرتا ہے۔ صحابہ رسول کو گواہ بنا کر اپنی حقیقت کا ثبوت دیتا ہے کیا اس امید پر کہ یزیدی لشکر حسینؑ کی حالت پر رحم کھائے گا وہ درہم و دینار کی جلوہ آرائی اور سپید اشرفیوں کی جھنکار اور حکومت و سلطنت کی طمع و حرص سے سرشار ہو کر حق کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ ہاں واقعہ حسینؑ دعا و التماس عاقبت اندیش نہ تھے وہ خوب جانتے تھے مگر بنی نوع البشر کو حالات سے واقف اور باخبر بنانا چاہتے تھے ان کا مقصود یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی بے خبری اور عدم اطلاع کی وجہ سے اس عظیم گناہ میں مبتلا ہو جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر رہے گی وہ تبلیغ کے فریضہ سے اپنے کو سبکدوش بنانا چاہتے تھے انہوں نے کوئی دقیقہ اظہار حق میں اٹھا نہیں رکھا اور آخری نفس تک اپنے فرض کو ادا کر گئے اس وقت بھی جب شمر کا خنجر بوسہ گاہ مصطفےٰ کے قریب آ چکا تھا اور امامت کا چراغ گل ہو رہا تھا حسینؑ نے اپنے قاتل کے سامنے تبلیغ کی اور اپنے نانا کی صداقت و حقانیت کو ثابت کر دکھایا۔ اے شمر ذرا اپنے چہرے سے نقاب اٹھا شمر نے نقاب ہٹائی حضرت نے فرمایا صدق اللہ جدی میرے نانا رسول نے سچ کہا تھا کہ اے حسین تیرا قاتل ایک برص والا کوڑھی شخص ہوگا۔

بدی الفداء اے حسین بن علی آپ نے مرتے دم تک اپنے فریضہ سے ہاتھ نہیں اٹھایا۔ آپ نے اپنے نانا کے قول کی تصدیق زیر خنجر بھی ثابت کر دی آپ کے خون کا ہر قطرہ جو کربلا کی ریتی پر گر رہا تھا آپ کی مظلومیت کا مرثیہ خواں اور ملت اسلامیہ کا واعظ و مبلغ تھا

حسین کی شہادت کے بعد

فاطمہ زہرا کا چاند غروب ہو چکا ہے اور دشمن اپنے مقصد میں ظاہری صورتوں میں کامیاب ہے

پھرے ہیں۔ اب کوفہ و شام کے بازار اور بنی ہاشم کے گھرانے کی معزز خواتین ہیں اور نیزوں پر کربلا میں شہید ہونے والے مظلوموں کے سر نصب ہیں کسی نظر سے دیکھنے والے اس منظر کو اہل بیت رسول کے لئے کتنی توہین و ذلت کا باعث سمجھ رہے ہیں اور دشمنوں کے خیال کے مطابق واقعی ایسا ہی ہے۔ لیکن یہی وہ موقع ہے کہ حسین کی تبلیغ منتہائے کمال پر پہنچ گئی ہے اور دعوت مذہب کا دائرہ کل عالم کی نسبت وسیع ہو گیا ہے اگر چشم حقیقت بین سے نظر کیجئے تو نیزہ پر حسین کی پیشانی پر سجدہ معبود کا نشان پڑا ہوا ہے۔ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود چہرے سے نور ساطع ہے ہونٹ تلاوت قرآن مجید میں مشغول ہیں (ام حسبت ان اصحاب الکہف والرقیم کانوا من آیاتنا عجبا) دوسری طرف مخدرات عصمت جو ان نامحرموں کے مجمع میں چادر و مقنعہ سے محروم ہونے کے بعد بھی غیرت و حیا کا مجسمہ، اخلاق محمدی کی تصویر، طہارت و عفت کے اندر علوی کردار لئے وہ حقائق و دقائق سے مملو خطبے کا انداز فصیح و بلیغ ایسا ترتیب گویا علی ابن ابی طالب کی زبان میں کلام کر رہی ہیں۔

یہ چیزیں وہ ہیں جنھوں نے شریعت کے لاشہ میں روح پھونک دی۔ دنیا کی آنکھوں کے سامنے سے جہالت و ضلالت کے پردوں کو چاک کر کے پھینک دیا۔ عالم کو مشرق سے لے کر مغرب تک حسین بن علی کا مرثیہ خواں اور یزید کے اعمال و کردار سے بیزار بنا دیا۔ اسی کا نتیجہ تھا اور ہے کہ آج عالم کے گوشے گوشے اور دنیا کے ہر حصہ میں حسین کا نام ہے اور حجاز کا حقیقی بادشاہ کروڑوں افراد کے دلوں پر قیامت کے لئے حکومت کر رہا ہے اور بنی امیہ کے جبر و عزت کا چراغ ہمیشہ کے لئے اس طرح گل ہوا کہ کوئی نام لینے والا بھی نہیں ہے۔ عالم نے دیکھ لیا ہے کہ کون ظالم تھا اور کون مظلوم، ظلم کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اور مظلومیت کی شان کیا ہے؟

مقصودِ کعبہ

حیرت انگیز ولادت

اور

عقول کی حیرت انگیز ٹھوکریں

واقعہ اپنی نوعیت میں نرالا ہو تو کچھ تعجب نہیں کہ اس کے رموز میں سطحی نظریں ٹھوکریں کھاتی پھریں یا ناقص عقلیں اس کی تہ تک پہنچنے کی فکر میں تاریکی و غموض کے پر پیچ راستوں کے اندر ہاتھ پاؤں مارتی رہیں اور عجب نہیں کہ اس غور و فکر کے منشاء میں کوئی ذاتی جذبہ بھی کار فرما ہو۔

جس طرح انتیس تاریخ کے چاند پر غور کرنے والا شخص بسا اوقات اپنی قوت متخیلہ کی امداد سے بہت سے ایسے چاند دیکھ لیتا ہے جن کا وجود نہیں ہے اور کبھی تعیین بھی کر لیتا ہے کہ فلاں جگہ میں نے چاند دیکھا، حالانکہ چاند کا پتہ نہیں اور کسی کے انتظار میں دروازہ کی کھٹکھٹاہٹ پر کان لگانے والا ہر مرتبہ اس کا احساس کرتا ہے کہ کوئی پکار رہا ہے، یا دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح کسی خاص جذبہ کے ماتحت عقل پر زور دینے والا بہت سی باتوں کو حقیقت کے برعکس میں دیکھنے لگتا ہے۔

حالانکہ ان کو حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

بے شک جس طرح بچے کا علاج یہ ہے کہ وہ نظر کو گاڑ کر دیکھے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ جس کو چاند سمجھ رہا ہے وہ ایک خط ہی ہے اور بہرے سے طور سے دھیان کرنے سے تو معلوم ہو کہ اس کی سنی ہوئی آواز خود اسی کے کانوں کی پیداوار ہے۔ اسی طرح اس کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے ذہن کو ہر قسم کے جذبات سے صاف کر کے حقیقت پر بغیر کسی لگاوٹ کے غور کرے اور اپنے خیالات کا عقل و نقل مسلم مقدمات کے معیار کے مطابق جائزہ لے تو معلوم ہو جائے گا کہ جسے وہ حقیقت سمجھتا تھا وہ سراب خیال ہے۔

۱۳ رجب اور امیر المومنینؑ کی ولادت خانہ کعبہ کا واقعہ خود اپنی نوعیت میں بے نظیر تھا اور پھر عام اعتقادات نے ظاہری ترتیب خلافت کو ترتیب فضیلت کا معیار قرار دے کر ذہنیتوں میں جو جمود پیدا کر دیا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ امیر المومنینؑ کی ہر فضیلت پر جو حضرت کی ذات سے مخصوص ہے اسی جذبہ کے تحت میں نظر کی گئی کہ وہ اپنے ذاتی خیالات و جذبات میں خلل انداز ہے۔ لہٰذا کوشش سے ایسے وجوہ کی تلاش کی جائے جو اس فضیلت کو پامال یا کم سے کم مشکوک بنا دینے کا ذریعہ ہو سکیں۔ چنانچہ ولادت امیر المومنینؑ کے متعلق بھی طرح طرح کے اعتراضات پیش کر کے پردہ ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن پر اسلامی احادیث و سیر کی روشنی میں منصفانہ نظر ڈالنا تحقیق پسند انسان کا فرض ہے۔

پہلا اعتراض

کعبہ کے احترام پر گستاخانہ حملہ

"امیرالمومنینؑ کی ولادت خانہ کعبہ کے وقت کعبہ قبلہ نہ تھا بت خانہ تھا تو ایک بت خانہ میں پیدا ہونا کون سے شرف کی بات ہے"

اس اعتراض کی جو نوعیت ہے وہ درحقیقت بیت اللہ احترام خانہ کعبہ کی توہین اور اس کی عظمت وجلالت کی سبک اندیشی پر مشتمل ہے۔

اعتراض سے صاف ظاہر ہے کہ کعبہ کو جو کچھ شرف حاصل ہوا وہ قبلہ ہونے کے بعد سے اور اس کے قبل وہ عام بت خانوں کے مثل ایک بت خانہ تھا۔ لیکن یہ خیال بالکل تاریخ وحدیث اور اسلامی آثار سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ سرزمین کعبہ کا یہ مقدس گھر جس کا نام کعبہ ہے" اپنے احترام وجلالت میں کسی خاص وقت وزمانہ کا پابند نہیں ہے۔ بلکہ روز اول مبداء تکوین ہی سے اس کی جلالت قدر اور رفعت وعظمت محفوظ تھی۔ وہ وقت کہ جب بنی آدم کا وجود نہ تھا اور ورق عالم وجود انسان کے نقش سے سادہ تھا اسی وقت یہ گھر اپنے مرتبہ وعظمت میں مخصوص امتیاز کا مالک تھا اور اسی وجہ سے جب بنی آدم کا وجود ہوا تو ان کے لئے طواف وعبادت کے واسطے یہی گھر منتخب ہوا۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:۔

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا وھدی للعالمین فیہ آیات بینات مقام ابراھیم ومن دخلہ کان آمنا وللہ علی

الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا ومن کفر فان اللہ غنی عن العالمین (سورۂ آل عمران پ۴)

"یعنی جانو کہ سب سے پہلا گھر جو بنی آدم کے لئے قرار دیا گیا، وہ گھر ہے جو مکہ میں ہے، وہ مبارک ہے اور تمام عالم کی ہدایت کا باعث ہے۔ اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، جیسے مقام ابراہیم، جو شخص اس میں داخل ہو جائے وہ امان میں ہے اور خدا کے لئے لوگوں پر اس گھر کا حج واجب ہے، اس شخص پر جو اس کی قدرت رکھتا ہو اور جو شخص کفر اختیار کرے (کرے) خدا تمام عالم سے بے نیاز ہے۔"

تفسیر بیضاوی میں جو اہل سنت کی مستند کتاب ہے آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

ھو اول بیت بناہ آدم فانطمس فی الطوفان ثم بناہ ابراھیم وقیل کان فی موضعہ قبل آدم بیت یقال لہ الضراح ولیطوف بہ الملٰئکۃ فلما اھبط آدم امر بان یحجۃ ویطوف حولہ ورفع فی الطوفان الی السماء الرابعۃ یطوف بہ ملٰئکۃ السماء (ربیع اسعہ ۱ ص۲)

"یہ سب سے پہلا گھر ہے جس کو آدم نے تعمیر کیا، لیکن طوفان نوح میں وہ بے نشان ہو گیا۔ پھر حضرت ابراہیم نے اس کی تعمیر کی، اور بعض نے کہا ہے کہ اس جگہ پر حضرت آدم کے پہلے ایک گھر تھا جس کا نام تھا "ضراح" اور ملائکہ اس کا طواف کیا کرتے تھے، جب آدم زمین پر آنا رے گئے تو ان کو حکم ہوا کہ اس کا حج کریں اور اس کے گرد طواف کریں اور طوفان نوح میں آسمان چہارم پر اٹھا لیا گیا کہ ملائکۂ آسمان اس کا طواف کریں۔"

دوسری آیت:۔ واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا البلد امنا

واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام رب انہن اضللن
کثیراً من الناس فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی
فانک غفور رحیم ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر
ذی زرع عند بیتک المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰۃ فاجعل افئدۃ
من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرات لعلھم
یشکرون۔
(سورۃ ابراہیم پ ۱۳)

"اور جبکہ کہا ابراہیم نے پروردگارا اس شہر کو جائے امن قرار دے
اور مجھ کو اور میری اولاد کو بچا۔ اس بات سے کہ ہم بتوں کی پوجا
پاٹ کریں۔ پروردگارا! یہ بُت بہت سے لوگوں کی گمراہی کا
باعث ہوئے ہیں۔ تو جو شخص میری پیروی کرے وہ مجھ سے
ہے۔ اور جو میری نافرمانی کرے تو مغفرت و رحم تیرا کام
ہے۔ پروردگارا! میں نے اپنی اولاد میں سے کچھ کو ساکن کیا ہے
ایسی وادی میں جو بے زراعت ہے تیرے محترم گھر کے پاس۔ بارالٰہا
تاکہ یہ نماز قائم کریں۔ اب تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف موڑ
دے اور ان کو میوہ جات سے رزق پہنچا۔ اس لئے کہ یہ تیرا شکر ادا کریں"

علامہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:۔

عند بیتک الذی حرمت التعرض لہ والتھاون
بہ اولم یزل معظما ممنعا تھابہ الجبابرۃ اومنع
منہ الطوفان فلم یستول علیہ ولذالک سمی
عتیقا ای اعتق منہ۔

"تیرے محترم گھر کے پاس یعنی وہ گھر جس سے تعرض کرنا اور جس کی توہین
تو نے حرام قرار دیا ہے یا جو ہمیشہ سے معظم و محترم رہا ہے کہ جسے جبر سے اہل

جبروت اس سے خوف کرتے تھے یا طوفانِ نوح کو اس سے روک دیا گیا کہ اس پر غلبہ نہ پا سکا۔ اسی وجہ سے اس کا نام عتیق تھا یعنی یہ طوفان سے آزاد کیا گیا ہے۔

ان تینوں آیتوں سے بضمیمہ تفسیر چند باتوں کا انکشاف ہوتا ہے :-

۱۔ کعبہ عالم کے مکانات میں سب سے پہلے خلق ہوا ہے۔

۲۔ وہ خدا کی طرف سے متبرک قرار پایا ہے۔

۳۔ آدم کو سب سے پہلے اس کے طواف و حج کا حکم ہوا اور طوفان کے زمانہ میں ملائکہ اس کا طواف کرتے رہے۔

۴۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں "عند بیتک المحرم" تیرے محترم گھر کے پاس اس سے ظاہر ہے کہ خلیل اللہ کے زمانہ سے کعبہ کا احترام ہونے کا خود ثابت ہے

۵۔ طوفانِ نوح جو تمام عالم کو محیط ہو گیا تھا وہ بجز خدا اس مقام سے علیحدہ تھا اور خانۂ کعبہ اس سے محفوظ تھا۔

اس کے علاوہ خانۂ کعبہ کی تعمیر جس اہتمام اور جن ہاتھوں سے ہوئی وہ اس گھر کی جلالت و عظمت ثابت کرنے کیلئے بہت کافی ہے۔

سب سے پہلے معمار اس گھر کے ملائکہ مقربین ہیں کہ انہوں نے خدا کے حکم سے آکر اس کی تعمیر کی جس کا تذکرہ علامہ قطب الدین حنفی کی کتاب "اعلام باعلام بیت اللہ الحرام" (مطبوعہ مصر ص۱۲) میں موجود ہے۔

دوسری تعمیر حضرت صفی اللہ آدمؑ کے ہاتھوں ہوئی (ص۱۲ کتاب الاعلام)

تیسری تعمیر اولادِ آدم کے ہاتھوں ہوئی اور چوتھی تعمیر حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے ہاتھوں سے ہے۔ جس کے متعلق علامہ قطب الدین حنفی لکھتے ہیں :-

کان ابراھیم علیہ الصلوٰۃ والسلام یبنی و اسمٰعیل

ینقل لہ الاحجار علی عاتقہ فلما ارتفع البنیان قرب لہ المقام

فکان یقوم علیہ ویبنی ویحولہ لہ اسمٰعیل فی نواحی البیت حتی انتھی الی موضع الحجر الاسود فقال ابراھیم لاسمٰعیل یا اسمٰعیل ابتغ لی حجرا یکون علما للناس یبتدؤن منہ الطواف فذھب اسمٰعیل فی طلبہ فجاء جبرئیل علیہ السلام الی سیدنا ابراھیم بالحجر الاسود وکان اللہ عز وجل استودعہ جبل ابی قبیس عند طوفان نوح فوضعہ جبرئیل علیہ السلام فی مکانہ وبنی علیہ ابراھیم وھو حینئذ یتلألأ (لورا فانما بنورہ شرقا وغربا ویمنا وشمالا-

"حضرت ابراہیمؑ تعمیر کرتے تھے اور حضرت اسماعیلؑ اپنے کاندھے پر پتھر اٹھا کر لاتے تھے- جب دیوار بلند ہو گئی تو حضرت ابراہیمؑ پتھر پر کھڑے ہوتے اور تعمیر کرتے تھے اور اسمٰعیلؑ مختلف اطراف میں اس پتھر کو منتقل کرتے تھے- یہاں تک کہ حجر اسود کی جگہ تک پہنچے- حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ سے کہا کہ ایک پتھر ڈھونڈو تاکہ اس کو یہاں رکھ دوں، وہ لوگوں کے لیے علامت رہیگا کہ اس سے طواف کی ابتداء کریں- اسمٰعیلؑ تو پتھر ڈھونڈنے کیلئے گئے ادھر جبرئیلؑ ابراہیمؑ کے پاس حجر اسود کو لے کر آگئے- جو اسے طوفان نوحؑ کے زمانہ میں اللہ نے کوہ ابو قبیس میں ودیعت کر دیا تھا جبرئیلؑ نے اس کی جگہ پر رکھا، اور ابراہیمؑ نے اس پر تعمیر کی اور حجر اسود اس زمانہ میں اپنے نور و ضیا سے چار طرف دنیا کو روشن کئے ہوئے تھے" (کتاب الاعلام ص)

اس انتظام واہتمام سے خدا کے حکم سے جس گھر کی تعمیر ہوئی ہو، اس کے شرف و عظمت کا کیا پوچھنا بلکہ اس صورت حال سے صاف ظاہر ہے کہ کعبہ کا شرف اور اس کی عظمت قبلہ مسلمین ہونے کے بعد سے نہیں ہے- بلکہ روز اول جبکہ تمام اہل فضل و شرف کی تقسیم کر

رہا تھا اس وقت تمام اکثر عالم میں کعبہ معزز و ممتاز ہو گیا تھا اور اس کو شرف و عظمت حاصل ہو چکا تھا۔ کعبہ میں بتوں کے رکھ دینے سے کعبہ کی عظمت گھٹ نہیں سکتی بلکہ یہ کفار مکہ کی ذہنی اور قدر شناسی تھی کہ انہوں نے ایسے متبرک و باعظمت مقام کو اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کیلئے منتخب کیا اور حقیقت اگر غور کیا جائے تو اس کا باعث بھی کعبہ کی عظمت و شرف ہی تھا۔ چونکہ تمام انبیاء و رسل کی زبان سے کعبہ کی عظمت گوش زد ہو کر دلوں میں راسخ ہو گئی تھی اس وجہ سے ان لوگوں نے اپنے معبودوں کے لئے اس گھر سے بہتر کوئی جگہ نہ پائی لیکن اس کی وجہ سے کعبہ کی عظمت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچ سکتا۔

فتح مکہ سنہ ۸ھ میں ہوئی ہے اور بتوں کا اخراج اسی سال ہوا ہے۔ یہ رسول کی زندگی کا تقریباً آخری دور تھا۔ معترض کے مذاق کے موافق اس کے پہلے کعبہ بت خانہ تھا اور بیت المقدس سے کعبہ کی طرف تحویل قبلہ اس سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ تو کیا کہا جا سکتا ہے کہ خدا نے ایک بتخانہ کو قبلۂ مسلمین بنا دیا؟ اسی طرح وجوب حج کی آیت بھی سنہ ۶ھ میں اتری ہے جو فتح مکہ سے تین سال پہلے کا واقعہ ہے تو کیا خدا نے بتخانہ کا حج و طواف مسلمانوں پر واجب کیا تھا؟ عبد المطلب کے زمانہ میں ابرہہ کا حملہ اور اصحاب فیل کی یورش اور قدرت خدا سے ابابیل عسکر کے ہاتھوں اس کی تباہی قرآن مجید کے صفحات پر موجود ہے۔ کیا خدا کی طرف سے ایک بتخانہ کی حفاظت بھلا ہی کی جاتی ہے؟

معلوم ہوا کہ بتوں کے رکھ دینے سے کعبہ کا شرف گھٹ نہیں گیا تھا۔ اسی وجہ سے کعبہ کے قبلہ بنانے اور اس کا حج واجب کرنے میں بتوں کے رہنے کا اعتبار نہیں کیا گیا اور ابرہہ کے حملہ سے حفاظت بھی اخراج اصنام پر موقوف نہیں رہی۔

کعبہ بیت اللہ الحرام تھا جس کا حج و طواف ہمیشہ سے واجب ہے اور چونکہ تمام الکۂ عالم میں افضل و بہتر تھا خدا کی طرف سے امیر المومنینؑ کی ولادت کیلئے منتخب ہوا اور اس نے اپنی قدرت و حکمت سے بند دروازہ کو چھوڑ کر نیا در بنایا اور اپنے بندۂ خاص کی ولادت کیلئے اپنے خاص گھر کو خالی کر دیا اور لطف یہ ہے کہ کعبہ کہ اس پر بتخانہ کے لفظ کا بکر پر دھبہ لگایا گیا تھا اس کے چھڑانے کا سہرا بھی اسی مولود کے سر بندھا اور دوش نبی پر قدم رکھ کر کسر اصنام اسی ہستی کے دفتر فضائل کا ایک مختصر باب ہے۔

دوسرا اعتراض

"پیدائش کے وقت زچہ جس طرح کے نجاسات سے آلودہ ہوتی ہے، وہ کس طرح کعبہ کی طہارت و عزت سے مناسبت نہیں رکھتے لہٰذا یہ روایت ماننے کے قابل نہیں ہے"

یہ سوال درحقیقت خداوند عالم پر اعتراض کی شان رکھتا ہے بعد اس کے کہ شیعہ و سنی دونوں فریق کی کتابوں سے یہ مطلب بالکل ثابت ہے کہ امیر المومنین علیؑ کی ولادت خداوند عالم کے حکم سے کعبۂ مشرفہ کے اندر ہوئی۔ اور فاطمہ بنت اسد کو خداوند عالم نے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ کعبہ کے اندر جگہ دی، تو اب اس سوال کا موقع ہی نہیں رہتا کہ کعبہ مطہر ہے اور ولادت کے وقت زچہ نجاست سے آلودہ ہوتی ہے۔

معترض کی نظر میں شاید تمام عادی چیزیں عن القبیل اور طبیعی ہیں جس کے تغیر و تبدل سے عاجز ہے اور خدا کی قدرت و اختیار تنگ ہے۔ جس چیز کا

وہ جو عقلاً محال ہے ان سے تو بیشک قدرت کا تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن جو چیزیں عقلاً محال نہ ہوں اور امکانی حدود کے اندر ہوں ان کا نظام عادی کے خلاف واقع ہونا کسی عقلی ہدایت یا نظریہ کے خلاف نہیں ہے۔

ولادت کے وقت عورتوں کا عملی نجاسات سے ملوث ہونا نظام عادی کے مطابق سہی مگر عقلاً ضروری نہیں ہے اور نہ اس کے خلاف کوئی عقلی فیصلہ موجود ہے۔ ایسی صورت میں جناب خداوند عالم نے فاطمہ بنت اسد کو اپنے حکم سے کعبہ کے اندر داخل کیا اور اس ولادت کو وہاں واقع ہونے دیا تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے اپنے معزز و محترم گھر کی طہارت کا خیال رکھا ہے۔

اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں نظر کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ وہ مولود تھا جس کی طہارت کا خداوند عالم اپنی قدرت قاہرہ کے ساتھ ضامن ہو چکا تھا اور اس کی پاکیزگی پر منشائے واہ ازلی ارادہ قائم تھا اور اسی بنا پر اسلامی کتب احادیث میں ایسے تصریحات موجود ہیں جو اس مقدس ذات کی غیر معمولی طہارت کا پتہ دیتے ہیں۔ چنانچہ علامہ صفادی مصری نے کنوز الدقائق میں جناب رسالتمآبؐ سے روایت کی ہے۔ لا یحل لاحد ان یجنب فی المسجد الا انا و علی "کسی شخص کو جائز نہیں کہ وہ مسجد میں جنب ہو سوائے میرے یا علی کے"

اور ابوسعید خدری کی روایت ہے۔ قال رسول اللہ یا علی لا یحل لاحد ان یجنب فی ھذا المسجد غیری و غیرک

حضرت رسولؐ نے فرمایا کہ اے علی کسی شخص کے لئے حلال نہیں ہے کہ وہ اس مسجد میں جنب ہو، سوائے میرے اور تمہارے۔"

اور شیخ سلیمان بلخی قندوزی نے ینابیع المودۃ میں روایت کی ہے

کہ حضرت رسولؐ نے ایک طویل حدیث کے ضمن میں فرمایا:

ان علیاً منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ وھو منی ولا یحل لاحد ان ینکح فیہ النساء الا علی وذریتہ

اس قسم کے بہت سے احادیث کتب اہل سنت میں موجود ہیں ان کے علاوہ اگر ان احادیث پر نظر کی جائے جن میں جناب فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے بتول نام ہونے کی وجہ بیان کی گئی ہے تو صاف طور سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی طہارت اس حد پر تھی کہ وہ اوقات جن میں عام افراد نجس سمجھے جاتے ہیں ان میں بھی ان حضرات کی طہارت اپنی حالت پر باقی رہتی تھی اور ان حضرات کے دامن تک نجاست کا گزر نہ تھا۔

پھر ان احادیث کو دیکھتے ہوئے جو مستند اسلامی کتب میں موجود ہیں خانہ کعبہ میں امیر المومنینؑ کی ولادت میں کونسا استبعاد ہو سکتا ہے؟ مولود جب اتنا مطہر و معصوم تھا تب ہی خود رب کائنات کی جانب سے خانہ کعبہ کہ جس کی تطہیر کا ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو حکم ہو چکا تھا اور جس طرح بیہقی کہہ کر اس کی طہارت میں اہتمام کا اظہار کر دیا گیا تھا اس ولادت کے لیے خالی کر دیا گیا اور بیت اللہ میں ولی اللہ کی ولادت ہوئی۔

تیسرا اعتراض

* یہ روایت کتب اہل سنت میں معروف نہیں ہے؟

اس کے لیے ان چند علمائے اہل سنت کا نام لکھ دینا کافی ہے جن کا ذکر کرنا اس روایت کو اس کے صحت و اعتبار کا ضامن ہے۔

ابن مغازلی شافعی مصنف کتاب مناقب، علامہ موفق مصنف نزل الابرار کمال الدین

محمد بن طلحہ شافعی مصنف مطالب السئول، خواجہ محمد صالح ترمذی کشفی مصنف مناقب مرتضوی، شیخ عبد الحق محدث دہلوی مصنف مدارج النبوۃ، مولوی محمد حسین زنجی محلی مصنف وسیلۃ النجاۃ، سبط ابن جوزی مصنف تذکرۃ خواص الائمہ، علی بن برہان الدین شافعی مصنف انسان العیون، موفق بن احمد خوارزمی مصنف کتاب مناقب، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی صاحب ازالۃ الخفاء۔

مؤخر الذکر بزرگ یعنی جیسی سند حضرت محدث دہلوی نے تو صاف صاف اس روایت کے تواتر کی گواہی دی ہے اور تحریر فرماتے ہیں :۔

قد تواترت الاخبار ان فاطمۃ بنت اسد ولدت امیر المؤمنین علیا فی جوف الکعبۃ فانہ ولد یوم الجمعۃ الثالث عشر من شہر رجب بعد عام الفیل بثلثین سنۃ فی الکعبۃ ولم یولد فیہا احد سواہ قبلہ ولا بعدہ۔

اخبار متواترہ سے ثابت ہے کہ فاطمہ بنت اسد کے بطن سے امیر المؤمنینؑ کی ولادت عین کعبہ کے اندر واقع ہوئی اور آپ روز جمعہ ۱۳ رجب عام الفیل سے تیس برس کے بعد کعبہ میں پیدا ہوئے اور کعبہ کے اندر کوئی شخص آپ سے قبل اور آپ کے بعد پیدا نہیں ہوا۔

اس عبارت سے جہاں اس واقعہ کا تواتر ثابت ہوتا ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت حضرت سے مخصوص ہے اور آپ کے قبل و بعد کسی کو یہ شرف حاصل نہیں ہوا مگر کیا کہا جائے تعصب کو کہ جب امیر المؤمنینؑ کی اس فضیلت کا انکار نقش بر آب ہوا اور واسلامی تاریخ نے دشمنوں پر ہاتھ رکھ دیا تو یہ قول تراشا گیا کہ یہ فضیلت امیر المؤمنینؑ سے مخصوص نہیں ہے بلکہ حکیم بن حزام بھی جاہلیت میں کعبہ کے اندر پیدا ہوا تھا۔

ہم نہیں سمجھ سکے کہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جیسے متبحر عالم اپنی کتاب میں کیوں لکھ دیتے ہیں کہ لم یولد فیہا احد سواہ قبلہ ولا بعدہ "علی کے پہلے اور ان کے بعد کوئی شخص کعبہ میں پیدا نہیں ہوا"

اور خطیب خوارزمی مناقب میں لکھتے ہیں لم یولد فی البیت قبلہ احد وھی فضیلۃ خصہ اللہ بہا اجلالاً لہ واعلاءً لمرتبتہ۔

"علی کے قبل بیت اللہ میں کوئی شخص پیدا نہیں ہوا اور یہ وہ فضیلت ہے جس کو خدا نے اجلال واحترام کی غرض سے آپ کے ساتھ مخصوص قرار دیا"

کیا یہ لوگ جاہل تھے؟ تنگ نظر تھے؟ یا شیعہ تھے؟ یا تاریخ وحدیث سے بے خبر تھے؟ یقیناً ان مستند علماء کی تصریحات کے بعد اس خیال کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔

معراجِ انسانیت

سیرتِ مرتضوی کی روشنی میں

رسول کے بعد

دوسری معیاری شخصیت جو ہمارے سامنے ہے وہ حضرت علی ابن ابی طالب کی ہے۔ آپ کی دس سال کی عمر ہے، جب پیغمبرؐ مبعوث برسالت ہوتے ہیں اور علیؑ ابن ابی طالبؑ ان کی رسالت کے گواہ ہوتے ہیں۔ یہ پہلے ہی سے رسولؐ کی آغوشِ تربیت میں تھے اب اسی آغوش میں دعوتِ اسلامی کی پرورش شروع ہوئی۔ یوں کہنا چاہیے کہ اسلام نے آنکھ کھولی کہ انہیں دیکھا اور ان کی نگاہ وہ تھی کہ علاوہ رسالت کے پہلے رسولؐ کی رسالت کو دیکھ رہے تھے۔ خود اپنے بچپن کی کیفیت نہج البلاغہ کے ایک خطبہ میں بتائی ہے کہ "کنت اتبعہ اتباع الفصیل اثر امہ" میں رسولؐ کے پیچھے پیچھے یوں رہتا تھا، جیسے ناقہ کا بچہ ناقہ کے پیچھے پیچھے رہتا ہے۔ "اشم ریح النبوۃ واری نور الرسالۃ" نبوت کی خوشبو سونگھتا تھا اور رسالت کی روشنی دیکھتا تھا۔

اب ظاہر ہے کہ ان کو رسولؐ سے کتنا انس ہونا چاہیے۔ وہ قرابت کی محبت الگ، جو بھائی ہونے کے اعتبار سے ہونا چاہیے اور وہ الگ جو بحیثیت ایک گھر میں رہنے کے ہونا چاہیے اور وہ اس کے علاوہ جو اپنے مربی سے ہونا چاہیے اور وہ اس کے علاوہ جو حضرتؐ سے بحیثیت رسولِ خداؐ اور ان کے پیغام سے بحیثیت حق و صداقت ہونا چاہیے

ابھی اگرچہ ۱۰ برس کی عمر ہے، مگر عرب اور بنی ہاشم اور وہ بھی اس
وقت کے دس برس کے بچے کو اپنے ہندوستان کا ایسا دس برس کا بچہ نہ
سمجھنا چاہیئے اور پھر وہ بھی علیؑ کا ایسا بچہ پھر اس وقت تو دس ہی برس کی عمر ہے
مگر اس کے بعد ۱۳ برس رسولؐ کے گھر میں گزرتے ہیں اور یہی انتہائی پُرآشوب
اور تکالیف و شدائد سے بھرا ہوا دور ہے۔ ہجرت کے وقت علیؑ بن ابی طالبؑ
کی عمر ۲۳ برس کی ہوئی۔ دس برس سے ۲۳ برس کا درمیانی وقفہ وہ ہے جس
میں بچپنا قدم بڑھاتا ہوا مکمل شباب کی منزل تک پہنچتا ہے۔ یہ زمانہ جوش و
خروش کا ہوتا ہے۔ یہ زمانہ ولولہ و امنگ کا ہوتا ہے۔ بڑھتی ہوئی حرارت
شباب کی یہ منزلیں اس دور میں گزر رہی ہیں۔ عام انسانوں کے لئے یہ دور
وہ ہوتا ہے جس میں نتائج و عواقب پر نظر کم پڑتی ہے۔ انسان ہر دشوار
منزل کو سہل اور ہر ناممکن کو ممکن تصور کرتا ہے اور خطروں اور اندیشوں کا
خیال تک دماغ میں کم آتا ہے۔ یہاں یہ دور اس عالم میں گزر رہا ہے کہ
اپنے مربی کے جسم پر پتھر برسائے جا رہے ہیں۔ سر پر خس و خاشاک پھینکا جاتا
ہے۔ طعن و تشنیع و شماتت کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا۔ پھر ظاہری طور
پر ایسی سب طعن و تشنیع و شماتت ہر اس شخص کو جو رسولؐ سے وابستہ ہے
اپنی ذات کے لئے بھی سننا پڑتی ہے خصوصاً اس لحاظ سے کہ رسولؐ کے
ہم عمر یا مقابل عمر بھی سن رسیدہ ہو سکتے ہیں۔ لیکن علیؑ بن ابی طالبؑ کے
ہم عمر جو مخالف جماعت میں تصور کئے جا سکتے ہیں وہ غیر مہذب اور غیر تعلیم یافتہ
ہونے کے ساتھ سن و سال کے لحاظ سے بھی بر خفیف الحرکاتی پر ہر وقت آمادہ
سمجھے جا سکتے ہیں۔ کون سمجھ سکتا ہے کہ وہ علیؑ ابن ابی طالبؑ کو جو رسولؐ
سے اتنی شدید وابستگی رکھتے تھے کیسی کیسی دل آزاری کرتے تھے۔ کیا کیا
طعنے اور کیا کیا زخم زبان پہنچاتے تھے اسے کوئی راوی تو بھی بیان کرے

تو بھی عقلی طور سے بالکل یقینی ہے۔

اب ممکن ہے ابھی دنیا علی ابن ابی طالبؑ کو بالکل نہ سمجھتی ہو کہ وہ کیا ہیں مگر اب اس وقت تو تاریخ کے آئینہ میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کی وہ تصویر بھی محفوظ ہے جو ہجرت کے ایک سال بعد بدر میں اور پھر دو سال بعد احد میں اور پھر خیبر، خندق اور ہر معرکہ میں نظر آتی ہے۔

جذبات کے لحاظ سے، قوتِ دل کے اعتبار سے، جرأت و ہمت کے حیثیت سے ۲۲ سال اور ۲۳ سال اور ۲۴، ۲۵ سال میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

یقیناً علیؑ جیسے ہجرت کے ایک دو اور تین سال بعد بدر و احد، خندق و خیبر میں تھے، ویسے ہی ہجرت کے وقت اور ہجرت کے دو چار سال پہلے بھی تھے۔ یہی بازو، یہی بازوؤں کی طاقت، یہی دل اور یہی دل کی ہمت، یہی جوش، یہی عزم غرض کہ سب کچھ یہی تھا جو اب بعد میں نظر آ رہا ہے۔ اب اس کے بعد قدرت کا پتہ کی کہ اس ہستی نے ۱۳ برس اس عالم میں کیونکر گزارے۔ اور کوئی غلط سے غلط روایت یہ نہیں بتاتی کہ کسی وقت علیؑ نے جوش میں آ کر کوئی ایسا اقدام کر دیا ہو جس پر رسولؐ کو کہنا پڑا ہو کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ یا کسی وقت پیغمبرؐ کو یہ اندازہ ہوتا ہو کہ یہ ایسا کرنے والے ہیں اور فکر دامن گیر ہو کہ ایسا نہ کریں۔ مجھے اس سے نقصان پہنچ جائے گا۔ کسی تاریخ اور کسی حدیث میں غلط سے غلط روایت ایسی نہیں ملتی حالانکہ حالات ایسے ناگوار تھے کہ کبھی کبھی سن رسیدہ افراد کو جوش آ گیا اور انہوں نے رسولؐ کے مسلک کے خلاف کوئی اقدام کر دیا اور اس کی وجہ سے انہیں جسمانی تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ سے کسی سے تصادم ہو گیا ہو۔ اس کے متعلق جھوٹی سے جھوٹی روایت پیش نہیں

کی جا سکتی۔

یہ وہ غیر معمولی کردار ہے جو عام افرادِ انسانی کے لحاظ سے یقیناً خارقِ عادت ہے۔ یہ کسی جذباتی انسان کا کردار نہیں ہو سکتا۔ یہ ۱۳ برس کی طولانی مدت اس عمر میں جو ولولوں کی عمر ہے۔ حوصلوں کی عمر ہے بھلا ممکن ہے اس سکون کے ساتھ گزاری جا سکے۔

اس کے بعد ہجرت ہوتی ہے۔ ہجرت کے وقت وہ فدا کاری پیغمبرؐ کا فرمانا کہ آج رات کو میرے بستر پر لیٹو۔ میں مکہ سے روانہ ہو جاؤں گا پوچھا حضور کی زندگی تو اس صورت میں محفوظ رہے گی۔ فرمایا ہاں مجھ سے وعدہ ہو چکا ہے۔ میری حفاظت ہو گی ۔۔۔ یہ سن کر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ نے سر سجدہ میں رکھ دیا۔ کہا۔ شکر ہے کہ اس نے مجھ کو اپنے رسولؐ کا فدیہ قرار دیا چنانچہ رسولؐ تشریف لے گئے اور آپ پیغمبرؐ کے بستر پر آرام کرتے رہے اس کے بعد چند روز مکہ معظمہ میں مقیم رہے۔ مکہ میں مشرکین کی امانتیں ان کے مالکوں کو واپس کیں اور پیغمبرؐ کی امانتیں ساتھ لیں۔ یعنی مخدرات کا شانۂ رسالت جن میں فواطم یعنی فاطمہؑ بنت محمدؐ، فاطمہؑ بنت اسد اور فاطمہ بنت زبیر بن عبد المطلب تھیں۔ ان کو لے کر روانہ ہوئے۔ خود ہمارا خنجر ہاتھ میں لی اور حفاظت کرتے ہوئے پیادہ پا مدینہ پہنچے۔ یہاں آنے کے ایک سال کے بعد اب جہاد کی منزل آ گئی اور پہلی ہی جنگ یعنی بدر میں علیؑ ایسے نظر آئے جیسے رسولؐ کے نبرد آزما معرکے سر کیے ہوئے اور کہنہ مشق میدان کی جیتے ہوئے۔ اب دلوں پر رعب و دبدبہ یہ تھا کہ طے کر لیا تھا کہ مشرکین کے کسی علمدار کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ ادھر یہ کوشش کہ علم زمین پر نہ گرنے پائے ادھر ایک علمدار کا ہاتھ کٹا تھا اور فوراً دوسرا ہاتھ علم پر آ جاتا تھا اور ادھر حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ کسی علمدار کو بغیر مارے گئے

بھاگے چھوڑتے نہ تھے۔ آخر علم کفر سرنگوں ہوا۔ علم کا گرنا دلیل شکست
ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے سب سے بڑے تین سورما عتبہ، شیبہ
اور ولید ان میں سے صرف عتبہ کو جناب حمزہؓ نے تہ تیغ کیا۔ شیبہ اور ولید
دونوں کا حضرت علی ابن ابو طالبؑ کی تلوار سے خاتمہ ہوا۔ ظاہر ہے کہ یہ
کارنامہ جنگ کی فتح کا ضامن تھا۔ وہ صرف نفسیاتی طور پر عامۂ مسلمین
میں قوت دل پیدا کرنے کے لیے اس جہاد میں فرشتوں کی فوج بھی آگئی۔ یہ
ثابت کرنے کے لیے کہ گھبراتے نہیں۔ وقت پڑے گا تو فرشتے آجائیں گے۔
حالانکہ اس کے بعد پھر کسی غزوہ میں ان کا آنا ثابت نہیں ہوا۔ اس کے
بعد احد میں علی ابن ابی طالبؑ نے تن تنہا بگڑی ہوئی لڑائی کو بنا کر اور فتح
حاصل کر کے دکھا دیا کہ بعد میں بھی اگر فوج ملائکہ نہ آتی تو یہ دست و بازو
اس جنگ کو بھی سر کر ہی لیتے۔ اس کے بعد خندق ہے۔ خیبر ہے۔ حنین ہے
یہاں تک کہ ان تمام کارناموں سے علیؑ کا نام دشمنوں کے لیے مرادف
موت بن گیا۔ خیبر و خندق، ذوالفقار اور علیؑ میں وہ دلالت التزامی کا رشتہ
قائم ہو گیا کہ ایک کے تصور سے ممکن ہی نہیں دوسرے کا تصور نہ ہو۔ یہ
وہی ۱۳ برس تک خاموش رہنے والے علیؑ ہیں اور دس برس کے اندر
جن کا عالم یہ ہے، مگر اسی دوران میں حدیبیہ کی منزل آتی ہے اور وہی
ہاتھ جس میں جنگ کا علم ہوتا تھا یہاں اس میں صلح کا قلم ہے جو صاحب
سیف تھا وہی صاحب قلم نظر آتا ہے۔ اور ان شرائط صلح کو جن پر فوج اسلام
کے اکثر افراد میں بے چینی پھیلی ہوئی ہے اور اسے کمزوری سمجھا جا رہا ہے
بلا کسی بے چینی اور بغیر کسی تردد و تذبذب کے حضرت علی ابن ابی طالبؑ
تحریر فرما رہے ہیں جس طرح میدان جنگ میں قدم میں تزلزل اور ہاتھ
میں ارتعاش نظر نہیں آیا اسی طرح آج عہد نامۂ صلح کی تحریر میں ان کے

قلم میں کوئی تزلزل اور انگلیوں میں کوئی ارتعاش نہیں ہے۔ ان کا جہاد تو وہی ہے جس میں مرضیٔ پروردگار ہو۔ جس کی راہ میں تلوار چلتی تھی اسی کی راہ میں آج قلم چل رہا ہے۔ اور مضامین کی کتابت ہو رہی ہے۔

اسی زمانہ میں ایک ملک بھی فتح کرنے بھیجے گئے تھے اور وہ یمن ہے۔ مگر وہ شمشیر زن اور صاحب ذوالفقار ہوتے ہوئے یہاں تلوار سے کام نہیں لیتے۔ انھوں نے اسلامی فتح کا نیا رخ پیش کر دیا۔ پورے یمن کو صرف زبانی تبلیغ سے ایک دن میں مسلمان بنا لیا۔ ایک قطرۂ خون نہیں بہا۔ دکھا دیا کہ فتح ملک اس طرح کرو۔ ملک پر قبضہ کے معنی یہ ہیں۔ اہل ملک کو اپنا بنا لو یہی ملک فتح ہو گیا۔

بہر حال ان لڑائیوں کو چھوڑ کر حضرت علی ابن ابی طالب کی زندگی کے اس دور میں بہت سے موقع پر تلوار نمایاں نظر آئے گی۔ لا فتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار میں آپ کی شان منفرد معلوم ہوگی۔ مگر اب پیغمبرِ خدا کی وفات ہو جاتی ہے اس وقت حضرت علی ابن ابی طالب کی عمر ۳۳ برس کی ہے۔ یہ دور تو شباب بلکہ بھرپور جوانی کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔ مگر اس کے بعد پچیس سال کی طولانی مدت حضرت علی ابن ابی طالب گزارتے ہیں کہ تلوار نیام میں ہے۔ اور آپ کا مشغلہ عبادتِ الٰہی اور روزی کی فراہمی کے لیے محنت و مزدوری کے سوا بظاہر کچھ اور نہیں۔

یہ ایسی داستانِ پُرشکوہ ہے جس میں ذرا بھی غور کر کے کتنی تحریر کو نظر انداز کر دیں تو دل کا تماشاگاہ بنا دیتا ہے۔ یہ مسلمانوں کی جنگ آزمائیوں کا زمانہ اور فتوحاتِ عظیمہ کا دور ہے جس میں اسلام قبول کرنے کے بعد گمنام ہو جانے والے افراد سیف اللہ اور فاتح ممالک اور غازی بن رہے ہیں۔ مگر کیا یہ حیرت ناک نہیں کہ جو تلوار ہر مقام پر عہدِ رسول میں کارِ نمایاں کرتی نظر آتی تھی وہ اس دور میں کلیۃً نیام کے اندر ہے آخر کیا بات ہے کہ وہ جوہر یہاں کا مردِ میدان گوشۂ عافیت میں گم گشتہ ہے

مگر اس کو بلایا نہیں جاتا تو کیوں؟ اور اگر بلایا جاتا ہے اور وہ نہیں آتا تو کیوں؟ دونوں باتیں ایک تاریخ کے طالب علم کے لئے عجیب ہی ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ وہ بالکل غیر متعلق رہے۔ نہیں اگر کبھی کوئی مشورہ اس سے لیا جاتا ہے تو وہ مشورہ دے دیتا ہے۔ کوئی علمی مسئلہ درپیش ہوتا ہے اور اس کے حل کرنے کی خواہش کی جاتی ہے تو وہ حل کر دیتا ہے مگر ان لڑائیوں میں جو جہاد کے نام سے ہو رہی ہیں اسے شریک نہیں کیا جاتا نہ وہ شریک ہوتا ہے — ۲۵ سال کی طولانی مدت گزر گئی اور اب حضرت علی بن ابی طالب کی عمر ۶۰ سال کی ہو گئی۔ یہ پیری کی عمر ہے — جس طرح مکہ کی ۱۳ برس کی خاموشی کے درمیان بچپنا گیا تھا اور جوانی آ گئی تھی۔ اسی طرح اس ۲۵ برس کی خاموشی کے دوران میں جوانی گئی اور بڑھاپا آ گیا۔ گویا ان کی عمر کا بہترین دور صبر و تحمل اور ضبط و سکون ہی کے عالم میں گزارا۔ سوال ہے کیسے تصور ہو سکتا ہے کہ جس کی جوانی گزر کر بڑھاپا آ گیا اور اس نے تلوار نیام سے نکالی وہ اب کبھی تلوار کھینچے گا اور میدان جنگ میں حرب و ضرب کرتا نظر آئے گا۔ عام اسباب کے عام تقاضوں کے لحاظ سے تو اس پچیس برس کے عرصہ میں ولولہ امنگ کی چنگاریاں تک سینہ میں باقی نہیں رہیں۔ محبت کے سوتے خشک ہو گئے اور اب دل میں ان کی نمی تک نہیں رہ گئی۔ اب نہ دل میں وہ جوش ہو سکتا ہے نہ بازوؤں میں وہ طاقت نہ ہاتھوں میں وہ صفائی اور نہ تلوار میں وہ کاٹ۔ مگر ۶۰ سال کی عمر میں وہ وقت آ گیا کہ مسلمانوں نے اصرار زمام خلافت آپ کے ہاتھ میں دے دی آپ نے بہت انکار کیا مگر مسلمانوں نے تضرع و زاری کی حد کر دی اور حجت ہر طرح تمام ہو گئی۔ مگر جب آپ سریر خلافت پر متمکن ہوئے اور اس ذمہ داری کو قبول کر چکے تو کئی جماعتوں نے بغاوت کر دی۔ آپ نے ہر ایک کو پہلے تو فہمائش کی کوشش کی اور جب حجت ہر طرح تمام ہو گئی تو دنیا نے دیکھا کہ وہی

تلوار جو بعد محمد ؐ خندق و خیبر میں چمک چکی تھی اب جمل صفین اور نہروان میں چمک رہی ہے۔ یہ نہیں کہ زمین میں بیچ سے بے ہوں اور نظر میں بیٹھیں بلکہ خود میدان جنگ میں موجود اور بنفس نفیس جہاد میں مصروف۔ اب ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی نوجوان طبیعت جو مقابل سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے بے چین ہو۔

چونکہ حضرت کی ہیبت فوج دشمن کے ہر سپاہی کے دل پر تھی اس لئے صفین میں جب آپ میدان میں نکل آتے تھے تو ہر مقابل جماعت کا پابند ہو جاتا تھا اور کوئی مقابلہ کو باہر آتا تھا سامنے دیکھ کر آپ نے یہ صورت اختیار فرمائی تھی۔ کہ دوسرے اپنے ہمراہیوں کا لباس پہن کر تشریف لے جاتے تھے۔ چونکہ جنگ کا لباس خود و مغفر اور زرہ و بکتر وغیرہ پہننے کے بعد چہرہ نظر نہ آتا تھا۔ اس لئے لباس بدلنے کے بعد پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ کون ہے اور آپ کبھی عباس بن ربیعہ اور کبھی فضل بن عباس اور کبھی کسی اور کا لباس پہن کر تشریف لے جاتے اور اس طرح بہت سے نذر تیغ ہو جاتے تھے۔

لیکن اموی نے یہ طے کر لیا کہ فتح کے بغیر جنگ نہ رکے گی۔ چنانچہ ایک دن لڑائی ہو ہی چکی تھی۔ سورج ڈوب گیا تب بھی لڑائی نہ رکی۔ پوری رات جنگ ہوتی رہی یہاں تک کہ نقشہ جنگ بدل گیا اور صبح ہوتے ہوتے فوج شام سے قرآن نیزوں پر بلند ہو گئے۔ جن سے التوائے جنگ کی درخواست مقصود تھی اور یہ جنگ میں شکست کا کھلا ہوا اعلان تھا۔

یہ ۶۰ برس کی عمر میں جہاد ہے اور یہ وہ ہی پینتیس برس کی عمر سے ساٹھ برس کی عمر تک کی مدت یوں گزار چکے ہیں جیسے کہ سینے میں دل ہی نہیں اور دل میں ولولہ اور جنگ کا حوصلہ ہی نہیں۔

اب ایسے انسان کو کیا کہا جائے جنگ پسند یا عافیت پسند نا چاہیے

مکالکر کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ تو فرائض کے پابند ہیں۔ جب فرض ہو کہ خاموشی کا تو خاموش رہیں گے چاہے شباب کی حرارت اور اس کا جوش و ولولہ کچھ بھی تقاضا رکھتا ہو۔ اور اس وقت وہ کتنے ہی صبر آزما مشکلات پیش آتے ہیں ان پر صبر کریں گے۔ اور مجبور نہیں گے نہیں اور جب فرض محسوس ہو کہ تلواریں اٹھائیں تو تلواریں اٹھائیں گے۔ چاہے بڑھاپے کا اضمحلال جو تمام افراد میں اس عمر میں پیدا ہوتا ہے کچھ بھی تقاضا رکھتا ہو۔ اب عرب و عرب کی ہستیوں کا مقابلہ کرنے میں وہ جوانوں سے آگے نظر آئیں گے۔

یہی وہ معراجِ انسانیت ہے جہاں تک طبیعت، عادت اور جذبات کے تقاضوں میں گرفتار انسان پہنچا نہیں کرتے ہیں۔

رباعی

کوں توصیف کن الفاظ میں آقائے قنبر کی
زبانی خلق کی پوچھو اللہ اللہ زور حیدر کی
چلایا وار کاٹا اچھالا پھر اٹھایا توڑ کر پھینکا
حقیقت کھول کر رکھ دی علی نے بابِ خیبر کی

رباعی

خیبر میں یہ بے دھوم کہ جرّار آیا
افواجِ محمد کا علمدار آیا
فی النار ہوا کفر تو کفار آیا
میداں میں جب حیدرِ کرّار آیا

مقالاتِ سیّد العلماء

علامہ سیّد علی نقی النقوی

حصہ ۳ سوم

مرتبہ

محمد وصی خان

رحمت اللہ بک ایجنسی
مقابل بڑا امام باڑہ، کھارادر، کراچی ۷۴۰۰۰
فون ۲۲۳۱۵۴۴

سابق اہلحدیث اور عظیم اسکالر

حکیم سیّد محمود گیلانی

کے

تحقیقی مقالات

ناشر: رحمت اللہ بک ایجنسی

[illegible]